''چہارسُو''

..... آخری اُجالا .....

''آخری اجالا'' اردو کے منفرد شاعر جناب اختر حسین جعفری کی کلّیات ہے جس کی اندرونی اور بیرونی طباعت بھی کلام کی طرح خوبصورت ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ جعفری صاحب نے دانستہ اپنا تعارف غزل کے بجائے نظم کو بنانا پسند کیا اور بنایا۔ ان کی نظم خود ان کے فیصلے کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہے اور جدید اردو نظم ان کے حوالے کے بغیر یقیناً ادھوری ہے۔ ادب کے بڑے جیّد ناموں کی طرف سے ان کے فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر بات کرنے کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔ سو ان کی کلّیات کے مطالعے کے بعد، عادت سے مجبور، طفلِ مکتب کے رسید نما تاثرات کے ساتھ حاضر ہوں۔

اختر حسین جعفری صاحب کی نظمیں معنویت سے بھرپور ہیں جن میں استعارے اور تشبیہات نگینوں کی طرح معنی در معنی جڑے ہوتے ہیں اور یوں ہر خیال کے اظہار کے لیے جدید اور منفرد استعارے، تشبیہات کے ساتھ مل کر فکری تمثیلیں بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی خیال آفرینی اور مضمون نگاری بھی کمال کی ہے مگر زبان کی سطح پر ان کا اختصاص نئے استعارے وضع کرنا ہے۔ ان کے ہاں بہت جگہ رائج تشبیہات کو استعاروں میں ڈھال کر ندرت پیدا کی گئی ہے جیسے ہوا، ریت، دریا، صبا، صدا اور پھر نئے استعارے ہیں جیسے کچّی آنکھیں، بال سکھانا وغیرہ۔ روایتی طرزِ اظہار کے قاری کو ان نظموں کی تفہیم میں یقیناً مشکل ہوتی ہے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عادت کے مطابق ان استعاروں کو تشبیہ کی طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ یہاں اسے مکمّل استعارے ملتے ہیں اور انھیں اکثر تشبیہ کی مدد کے بغیر بھی کھولنا ہوتا ہے۔ اور یہ زاویہ نظر ٹھیک کر لینے سے قاری کی مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ پورے تحمّل اور فکری کاوش کے ساتھ اس کلام کو استعارے کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کریں تو نظم کھلتی چلی جاتی ہے۔

یہ کلام ایک بڑے کینوس پر جہاں اپنے دور کے سیاسی ماحول اور اس کے فشار کی منظر کشی کرتا ہے، وہیں یہ اپنے پیرایۂ اظہار کی فضا، جدّت، اس جدّت سے آگہی اور اپنے اندرونی مکالمے اور اظہار سے جڑی نفسیات کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ ان کے موضوعات، گو تمام نہیں، مگر زیادہ تر سیاسی ماحول، تخلیقی توانائی کے اظہار کے آشوب، معنی کی ترسیل اور اس سے جڑے ابلاغ کے مراحل کے کرب اور نئی سمتوں کے اشاروں پر مشتمل ہوتے ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے ان کے دور کے سماجی، سیاسی اور ادبی ماحول کی تفہیم ضروری ہے اور یہ تفہیم کا دوطرفہ سفر بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے ہاں کئی طویل نظمیں ہیں جن میں ''آئینہ خانہ'' کا ذکر دیباچے میں بھی ہے اور اس کے محاسن پر تفصیلی بحث بھی کی جا چکی ہے، سو میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ یہ ایک ایسی بھرپور طویل نظم ہے کہ جس میں کسی مصرعے میں شاعر کی سانس نہیں پھولی اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

اختر حسین جعفری صاحب کے ہاں زندگی کے سفر، سیاسی اور سماجی جبر، آمریت اور ان سے نبرد آزمائی کو مختلف شکلوں میں نظم کیا گیا ہے مگر ان میں مایوسی نہیں بلکہ امیدِ فردا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انھوں نے اپنی غزل پر نظم کو ترجیح دی، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کلّیات میں آپ کو صرف گنتی کی غزلیں ملیں گی جن میں ان کی آخری غزل بہت خوب ہے۔ آخری بات یہ کہ بعض اوقات کسی غزل کے مجموعی تاثر کے بارے میں ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ پوری غزل (مسلسل غزل نہیں) ایک ہی نشست میں کہی گئی ہے۔ میں یہی بات اختر حسین جعفری صاحب کے پورے کلام کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ ان کے کلام کی مجموعی فضا ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پوری کلّیات ایک ہی نشست میں لکھی گئی ہو جس میں خیال، فکر، استغراق اور اظہار کی اُپج کا ایک تسلسل واضح طور پہ دیکھا جا سکتا ہے۔

.....فیصل عظیم

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۲،شمارہ:مئی،جون۲۰۲۳ء

بانی مدیراعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت
○☆○
قارئین چہارسُو
○☆○
زرِسالانہ
○☆○
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل
گلزار جاوید
○☆○
مدیرانِ معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمدانعام الحق
عروب شاہد
آمنہ علی

رابطہ:537/D-1،گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔
فون:(+92)-51-8730633-8730433
موبائل:(+92)-336-0558618
ای۔میل:chaharsu@gmail.com
۔ ویب سائٹ ۔
http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِورق، پسِ ورق ------- شعیب حیدر زیدی
تزئین ------------------ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ---------------- محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

تخیّل کی سیر -------------- محمد انعام الحق ۶
موجِ خیال --------------- فاری شا ۹
براہِ راست ---------------- گلزار جاوید ۱۲
مانوس اجنبی (افسانہ) -------- باصر سلطان کاظمی ۱۹
میری بستی کے مقابل ------ ڈاکٹر مختار الدین احمد ۲۶
کاروبارِ عشق -------------- انتظار حسین ۳۰
بات جو دل میں ہے -------- ڈاکٹر سلیم خان ۳۱
نجم شماری ------------- صباحت عاصم واسطی ۳۳
آرزوئے کمالِ ہنر ------------ ساجد علی ۳۶
صدا کی بازگشت -------------- یشب تمنا ۴۰
کٹ چکی عمرِ جنوں ------------ قیصر عباس ۴۲
مہ و مہر کا نظام -------------- انجم جاوید ۴۵
بہشتِ ارض --------------- عطیہ سکندر علی ۴۷
نئی زندگی (ڈرامہ) -------- باصر سلطان کاظمی ۵۰

بولتے چہرے

عکسی منظرنامہ

مکتبِ عرفان

نسیمِ سحر، نبیل احمد نبیل ۵۴

افسانے

وقت یہ ٹل جائے تو ---------- شہناز خانم عابدی ۵۵
مدراپی کرمت ناچوسادھورام -------- قمر جمالی ۶۰
چڑی سا دل --------------- شکیل احمد خان ۶۴
گوسپ گرل/کھلی کتاب ------- پرویز شہریار ۶۶
وعدہ معاف -------------- تابش خانزادہ ۶۸

جذبۂ ایماں

پنڈت برج نارائن چکبست، معین نظام، نسیم سحر، ملک زادہ جاوید، اشرف جاوید، عذرا پروین، خورشید طلب، نسیم عزیزی، ارشد سعید، ڈاکٹر ریاض احمد ۶۹

افسانے

بڑا آدمی --------------- رخشندہ روحی ۷۴
انا کی قیمت -------------- رعنا کوثر ۷۷
تنہائی ----------- ڈاکٹر شہاب افسر خان ۷۹
ناجائز ------------------ ارم رحمٰن ۸۱
سرکتی جائے ہے رخ سے --------- فیروز عابد ۸۴

نصابِ زیست

عادل راہی، سہیل اقبال، رئیس صدیقی، نوید سروش، ندیم راجا، یوسف چوہان، طارق تاسی، صائم بلتستانی، سہیل ضرار خلش، ڈاکٹر ریشا قمر، علی قائم نقوی، سبھاش گپتا شفیق، وسیم عباس، شاہد رضوان، لاریب۔ ۸۶

ناول

خاکِ شفا ------------- پیرزادہ آلِ انوار ۹۱

اُفق کے اُس پار

بھیڑنی ---------------- احمد مشتاق ۱۰۰

ایوانوں کے رستے

نودان ناصر، عبد اللہ جاوید، امجد اسلام امجد، سلیم سرفراز، سید انوار زین، ڈاکٹر پونم گوندل، نجم الحسنین حیدر، تسنیم عابدی۔ ۱۰۲

نشانِ راہ

زندگی صرف محبت تو نہیں -------- حنا افشاں ۱۰۷
چراغِ رخِ زیبا -------------- جمیل عثمان ۱۰۹

رنگ کی گفتگو

جناب آلوک کمار سے گفتگو ------- ودود ساجد ۱۱۰

ایک صدی کا قصہ

اردشیر ایرانی -------------- دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین --------- وجیہہ الوقار ۱۱۷

☆

قرطاسِ اعزاز

باصر کاظمی

کے نام

دیکھتے رہنے پر ہوئے مامور
ہم کبھی اس قدر نہ تھے مجبور
اپنی شہرت بڑھانے کی خاطر
اُس نے ہم کو بھی کر دیا مشہور

جو کان میں رہ گیا سو پتھر
جو ہاتھ میں آگیا وہ ہیرا

اگر آنسو رُکے تو ابر برسا
یہ بارش میرے پیچھے پڑ گئی ہے

جن مناظر نے خوش کیا تھا کبھی
خواب میں آکے تنگ کرتے ہیں

دھوپ ہنستی تھی ابھی آنگن میں
آگئے رونے رُلانے والے

پھول ہر ڈھنگ کا بہار میں تھا
برگ ہر رنگ کا خزاں میں ہے

رات دن ساغرِ جم دیکھتے ہیں
کس نے دیکھا ہے جو ہم دیکھتے ہیں
کیوں ہے چہرہ ترا اُترا اُترا
آنکھ بھی تھوڑی سی نم دیکھتے ہیں

لڑتے کسی اور بات پر ہیں
غصہ کسی اور بات کا ہے

مختلف ہیں اگرچہ ان کے نام
ملتے جلتے سے ہیں یہ سارے مقام

باصرؔ دعائیں مانگیں تھیں عمرِ دراز کی
افسوس مت کرو کہ جوانی گزر گئی

دوستوں کی مہربانی پوچھ لیتے ہیں ہمیں
ورنہ اِس شہرِ غرض میں کون کس کا آشنا

باصرؔ خلوصِ دل سے کیا تو ہے ایک عہد
اب یہ دعا کرو کہ نبھانا نصیب ہو

تخیّل کی سیر

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

پیدائش: 4۔اگست1953ء

تعلیم: ایم اے انگریزی، گورنمنٹ کالج لاہور؛ ایم ایڈ، ایم فل، یونیورسٹی آف مانچسٹر، برطانیہ؛ پی جی سی ای (انگریزی)، برطانیہ

ذمہ داریاں:

استاد شعبۂ انگریزی: گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ (1976ء)؛ اِسلامیہ کالج سِول لائنز لاہور (1976-80)؛ (گورنمنٹ کالج لاہور (1980-90)؛ ہیلی فیکس ہائی سکول، انگلستان (1992-95)؛ سٹریٹفورڈ ہائی سکول، مانچسٹر (1995-2008)؛ چیئل فور خواندگی مہم (1999ء)؛ یونیورسٹی آف بریڈفورڈ (2008-12)؛ بلیسیڈ ٹامس کالج، مانچسٹر (2013-14)؛ گریٹ سینکی ہائی سکول / کالج، وارنگٹن (2014ء)؛ لیونز ہیوم گرلز ہائی سکول، مانچسٹر (2014ء)، آلٹرنکم کالج آف آرٹس (2014ء)، یونیورسٹی آف چیسٹر (2015-16)

انعامات:

رائٹر اِن ریزیڈنس، نارتھ ویسٹ پلے رائٹس ورکشاپس، اِنگلستان (1992ء)؛ فیلو آف رائل لٹریری فنڈ، اِنگلستان (2008-12)؛ ایم بی ای (MBE): ملکہ برطانیہ کی جانب سے اعزاز، برائے ادبی خدمات بحیثیت شاعر، 2013ء، باصر اردو کے پہلے شاعر اور ادیب ہیں جنہیں ادبی خدمات پر حکومتِ برطانیہ کی جانب سے کوئی اعزاز دیا گیا ہے)؛ غزل، 'زخم تمہارے بھر جائیں گے تھوڑی دیر لگے گی'، انگریزی ترجمے کے ساتھ برطانیہ کے ہسپتالوں اور انتظار گاہوں میں آویزاں کی گئی (2001ء)؛ شعر، 'دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو / پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو'، مع انگریزی ترجمہ، پتھر پہ کندہ کر کے لندن سے ملحق شہر سلاؤ کے میکنزی چوک میں نصب کیا گیا (2008ء)۔ علی سردار جعفری ایوارڈ، علی گڑھ ایلمنائی ایسوسی ایشن ہیوسٹن، امریکہ (2017ء)۔ بزمِ صدف عالمی ایوارڈ، قطر (2018ء)۔ ڈراما 'بساط اے لیول کے نصاب میں شامل کیا گیا (2018ء)۔

اعزازی حیثیتیں:

منتخب سیکرٹری سٹوڈنٹس یونین، گورنمنٹ کالج لاہور (1972ء)؛ مدیر 'راوی'، گورنمنٹ کالج لاہور (1975ء)؛ نائب صدر گورنمنٹ کالج ڈرامیٹک کلب (1989-90ء)؛ بانی، ایشین تھیٹر کمپنی، 'پیشکار'، شمالی انگلستان (1992ء)؛ نیوز ریڈر، ایڈیٹر، ایشین پروگرام 'جھنکار'، بی بی سی گریٹر مانچسٹر ریڈیو (1990-91ء)؛ مشیر آرٹس کونسل آف اِنگلینڈ (1995-98)؛ بانی رکن 'منی مشاعرہ' (1996ء۔تاحال)؛ رکن مجلسِ عاملہ، ایجوکیشن ایکشن زون مانچسٹر (1999-2000ء)؛ رکن مجلسِ عاملہ، نیشنل ایجوکیشن یونین، برطانیہ (1999۔2022)؛ سرپرست یارک شائر ادبی فورم (2012۔تاحال)۔

تصانیف:

'بساط' (طویل ڈراما)، 1987، مکتبۂ خیال، لاہور؛ 'مانوس اجنبی' (کہانی)، 1987ء، مکتبۂ خیال، لاہور؛ 'موجِ خیال' (غزلیں)، مارچ 1997ء، مکتبۂ خیال، لاہور؛ 'چمن کوئی بھی ہو' (غزلیں، نظمیں)، 2009ء؛ کلاسیک لاہور؛ شریکِ درد (ڈرامہ)، جون 2005ء، سویرا، لاہور؛ 'ہوائے طرب' (غزلیں، نظمیں)، 2015ء، سنگِ میل پبلشرز لاہور؛ 'چونسٹھ خانے چونسٹھ نظمیں' (نظمیں)، 2015ء، سنگِ میل پبلشرز لاہور؛ کلیات 'شجر ہونے تک' (2015ء)؛ شعری کلیات 'اب وہاں رات ہو گئی ہو گی'، دہلی (2018ء)۔

تراجم

'بساط' (1997ء)

The Chess Board: Pennine Pens, UK.

غزلیں (2003ء)؛

Generations of Ghazals: Ghazals by Nasir Kazmi & Basir Sultan Kazmi, 2003; edited by Debjani Chatterjee, Redbeck Press, UK

'غزل نسل در نسل: ناصر کاظمی اور باصر سلطان کاظمی کی غزلیں'۔ انگریزی ترجمہ معہ اردو متن (2006ء)، جہانگیر بک ڈپو، لاہور۔

غزلیں، نظمیں۔ انگریزی ترجمہ معہ اردو متن

Passing Through (ہم وہاں بھی رہے) Crocus Books/Commonword, UK 2014.

'ناصر کاظمی: شخصیت اور فن'، اکادمی ادبیات پاکستان (2007ء)

تعارف 'سُر کی چھایا' (منظوم ڈرامہ از ناصر کاظمی)، 1981ء، مکتبۂ خیال، لاہور

شریک مدیر 'خشک چشمے کے کنارے' (ناصر کاظمی کے مضامین کا مجموعہ)، 1981ء، مکتبۂ خیال، لاہور

دیباچہ 'پہلی بارش' (ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ)، 1983ء، مکتبۂ خیال، لاہور

ترتیب و تعارف 'انتخابِ میر' (از ناصر کاظمی)، 1989ء، مکتبۂ خیال، لاہور

ترتیب و تعارف 'انتخابِ نظیر' (از ناصر کاظمی)، 1989ء، مکتبۂ خیال، لاہور

ترتیب و تعارف 'انتخابِ ولی' (از ناصر کاظمی)، 1991ء، آغاز پبلشرز، لاہور

ترتیب و تعارف 'انتخابِ انشا' (از ناصر کاظمی)، 1991ء، فضل حق اینڈ سنز

پبلشرز، لاہور

شریک مدیر، 'ہجر کی رات کا ستارہ' (ناصر کاظمی پر مضامین کا مجموعہ، مدیر، احمد مشتاق)، طبعِ دوم (2013ء) سنگِ میل پبلشرز لاہور۔

'ناصر کاظمی کا دیوان'، مطبوعہ، 'ہجر کی رات کا ستارہ'، طبعِ دوم، 2013ء، سنگِ میل پبلشرز لاہور۔

Literacy in Pakistan:The Influences of Orthodox Religious Thought On Female Literacy, M.Phil thesis (2000), University of Manchester, UK (under publication).

Podcasts

Basir recorded a series of podcasts for Royal Literary Fund: 1. *Why I write* 2. *How I write* 3. *Writers who inspire me* 4. *The best advice I ever received* 5. *Stage or Book* (with Julia Copus) and 6. *Poets of the ghazal* (with Mimi Khalvati & Debjani Chatterjee).

(ایم فل تھیسس، زیرِ طبع)

رسائل اور اخبارات جن میں غزلیں / نظمیں شائع ہوئیں:

پاکستان: راوی، فنون، سیپ، ماہِ نو، محراب، ادبیات، محور، پطرس، تسطیر، کولاژ، ادبِ لطیف، سپتک، اسالیب، ادبِ عالیہ۔

برطانیہ: پرواز، مخزن، روزنامہ جنگ۔

غزلوں اور نظموں کے انگریزی تراجم

1. *Orbis,* autumn 1982, no 46; the international literary magazine (Double Issue), England.

2. *Wasafri* Issue 26, Autumn 1997, edited by Susheila Nasta (Dept. of English, Queen Mary & Westfield College, London, 1997).

3. *A little Bridge* by Debjani Chatterji, Simon Fletcher & Basir Sultan Kazmi (Pennine Pens, Hebden Bridge, 1997.

4. *The Northern Durbar: Poems Celebrating Fifty Years of Independence* edited by Shripati Upadhyaya & Brian Lewis (Pontefract Press & Kala Sangam, Pontefract & Bradford, 1997).

5. *Agenda: An Anthology* Vol. 35, Winter-Spring 1998 (Agenda Magazine, London, 1998).

6. *Poems for the Waiting Room Project* (Hyphen 21, London, 2001).

7. *Dream Catcher* Issue 11, Autumn 2002, edited by Paul Sutherland (Dream Catcher, Lincoln, UK, 2002).

8. *Jade Horse Torso*: Poems and Translations by Debjani Chatterjee (Sixties Press, London, 2003).

9. *The EMLIT Project: European Minority Literatures in Translation* edited by Paula Burnett (Brunel University Press, London, 2003). Ghazal: 'Tomorrows Trees' along with Urdu original and translations in French, German, Spanish and Italian.

10. *The EMLIT Project: Writers Reading: A Sampler CD* to accompany The EMLIT Project European Minority Literatures in Translation edited by Paula Burnett (Brunel University Press, London, 2003). Urdu original of 'Tomorrows Trees' recited by the poet.

11. *The EMLIT Project: European Minority Literatures in Translation website* edited by Paula Burnett (Brunel University Press, London, 2003). 'Tomorrows Trees' along with Urdu original and translations in French, German, Spanish and Italian.

12. *Poetry Leeds*, Issue 1, Winter Edition, 2003; Sixties Press.

13.http://DebjaniChatterjee.mysite.wanadoo-members.co.uk

14.http:/mysite.freeserve.com/DebjaniChatterjee Debjani's website.

15. *Generations of Ghazals: Ghazals by Nasir Kazmi and Basir Sultan Kazmi,* edited by Debjani Chatterjee (Redbeck Press, Bradford,

Vijayawada, Andhra Pradesh, India, 2017)

29. Amaravati Poetic Prism, International Multilingual Poetry Anthology (The Cultural Centre of Vijayawada & Amaravati (CCVA), Vijayawada, Andhra Pradesh, India, 2018)

مشاعروں میں شرکت

پاکستان، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، ہندوستان، دوبئ، ابوظہبی، بحرین، دوحہ قطر، کویت، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، فرانس، جرمنی، سپین، ہالینڈ، بیلجیم۔

ڈرامے جو سٹیج ہوئے

’بساط‘، پہلا ایکٹ، دوسرا منظر: پرل کونٹینینٹل، لاہور، تقریبِ اجراء 1987 اور پی ٹی وی ڈرامہ فیسٹیول، 1987۔ اداکار: آصف سیماب، انوار احمد۔

’روبوٹ چارسوبیس‘ [Robot 420(one act play] 1992

’نئے افق‘ [New Horizons(long play)] 1992

شریکِ درد [Something to Share(one act play)] 1993

Robot 420 (Urdu, English, Bengali), staged at Werneth Park, Oldham & Abraham Moss Centre, Manchester, June/July1992.

New Horizons (Urdu, English, Bengali), staged at Sixth Form College Oldham (Dec.1992), Nia Centre, Manchester (1993); Colesium Theatre, Oldham (23.05.1994), Octagon Theatre; Bolton (30.05.1994); Contact Theatre, Manchester (12.06.1994).

Something to Share (English translation), staged at Unity Theatre Liverpool (25-27 March, 1993); Green Room Manchester (7 April, 1993).

مقالات اور خصوصی شمارہ

۱۔ محمد تصور عباس، ’’باصِر سلطان کاظمی کی ادبی خدمات‘‘، مقالہ برائے ایم فل، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل ۲۰۱۹۔

۲۔ خدیجہ سعید، ’’باصِر سلطان کاظمی کی کلیات (شجر ہونے تک) کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ‘‘، مقالہ برائے بی اے آنرز، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، پاکستان، ۲۰۱۸۔

۳۔ طاہرہ خالد، ’’باصِر سلطان کاظمی بطور غزل گو‘‘، مقالہ برائے ایم اے، پنجاب یونیورسٹی، پاکستان، ۲۰۱۴۔

۴۔ سپتِنک، ’’اردو ادب کا روشن ستارہ، باصِر سلطان کاظمی‘‘، جلد ۲۷، شمارہ ۳، مارچ، ۲۰۱۶، کلاسیک لاہور۔

UK, 2003).

16. *Is a religious poem possible in the early 21st century?* Edited by David Hart, Flarestack, 2004.

17. *Masala: Poems from India, Bangladesh, Pakistan and Sri Lanka*. Macmillan Children's Books, UK, 2005.

18. *Hair: A Journey Into The Afro & Asian Experience*. Shorelines, Manchester, UK, 2006.

19. *Private, No 39: I am Pakistan*, Winter 2007-08; Italia (International Review of Black and White Photographs and texts.

20. *Fire* nos 29/30, Special International Double Issue; edited by Jeremy Hilton, Oxforshire, UK, March, 2008.

21. *The Suitcase Book of Love Poems,* edited by Martin De Mello (Suitcase/Shorelines, Manchester, 2008).

22. *Moving Worlds: A Journal of Transcultural Writings*, Volume 9, Number 2, Leeds, UK, 2009.

23. *Pakistani Diasporas: Culture, Conflict and Change*; edited by Virinder S. Kalra, Oxford University Press, 2009.

24. *Another Bridge by Debjani Chatterji, Brian D'Arcy, Simon Fletcher & Basir Sultan Kazmi*. (Sahitya Press, Sheffield, 2012.)

25. *Sweet Tongues, Crocus Book of Food Poems* (Commonword, Manchester, 2013).

26. *Atlanta Review, Pakistan Issue*, Volume XX, Issue Number 2, 2014.

27. *Writing the City in British Asian Diasporas*. (Routledge UK & New York, 2014)

28. Amaravati Poetic Prism, International Multilingual Poetry Anthology (The Cultural Centre of Vijayawada & Amaravati (CCVA),

''موجِ خیال''

(۱۹۹۷ء)

فاری شا (راولپنڈی)

کہاں کی آہ و فغاں لب ہلا نہیں سکتا
وہ رات ہے کہ دیا بھی جلا نہیں سکتا

وہ نقش چھوڑ گئے زندگی میں اہلِ ہنر
فنا کا ہاتھ بھی جن کو مٹا نہیں سکتا

وہ پیڑ دیکھے ہیں میں نے سفر میں اب کے برس
زمینِ شعر میں جن کو اُگا نہیں سکتا

جو میرا دوست نہ ہو کر بھی میرے کام آیا
میں ایسے شخص کو دشمن بنا نہیں سکتا

شریکِ سازشِ دل ایسا کون تھا باصرؔ
تُو جس کا نام بھی ہم کو بتا نہیں سکتا

..... ○ .....

☆

دُور سایہ سا ہے کیا پھولوں میں
چھپتی پھرتی ہے صبا پھولوں میں

اِتنی خوشبو تھی کہ سَر دُکھنے لگا
مجھ سے بیٹھا نہ گیا پھولوں میں

چاند بھی آ گیا شاخوں کے قریب
یہ نیا پھول کِھلا پھولوں میں

چاند میرا ہے ستاروں سے الگ
پھول میرا ہے جدا پھولوں میں

چاندنی چھوڑ گئی تھی خوشبو
دھوپ نے رنگ بھرا پھولوں میں

تتلیاں قمریاں سب اُڑ بھی گئیں
میں تو سویا ہی رہا پھولوں میں

رُک گیا ہاتھ ترا کیوں باصرؔ
کوئی کانٹا تو نہ تھا پھولوں میں

○

☆

وہ ہو رہے گا بالآخر جو ہونے والا ہے
جو ہو رہا ہے کچھ اس پر بھی تم نے سوچا ہے

اُفق کی آنکھ میں پھیلی ہوئی ہے لالی سی
یہ آسمان کہاں ساری رات جاگا ہے

سنو کہ آج تمہیں یاد کے دریچوں سے
صدائے رفتہ نے اک بار پھر پکارا ہے

گزر نسیمِ سحر اِس چمن سے آہستہ
کہ پتا پتا بہاروں کے دل کا ٹکڑا ہے

بھٹکتے پھرتے ہیں ہم جس کی دُھن میں مدت سے
جو سوچیے تو وہ منزل بھی ایک رَستا ہے

مرے سفر میں کئی منزلیں پڑیں لیکن
تری گلی میں عجب طرح دل دھڑکتا ہے

وہ قافلہ تو کبھی کا گزر چکا باصرؔ
کھڑے ہو راہ میں اب انتظار کس کا ہے

○

چمن کوئی بھی ہو

(۲۰۰۹ء)

ہم کہ جو ہر ابر کو ابرِ کرم سمجھا کیے
آ گئے اِس دیس میں اور دھوپ کو ترسا کیے

اُس نے اپنے منہ پہ اُنگلی رکھ کے آنکھیں بند کیں
میں نے کچھ کہنے کو اپنے ہونٹ جونہی وا کیے

روز لگ جاتے ہیں اُس کے صحن میں کاغذ کے ڈھیر
مستعد خط لکھنے والوں سے زیادہ ڈاکیے

ایک سورج کے لیے یہ کہکشاں در کہکشاں
اک زمیں کے واسطے سو آسماں پیدا کیے

خیر ہو چارہ گری کی میرے چارہ گر تجھے
مدتیں گزریں کسی بیمار کو اچھا کیے

..... ○ .....

☆

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

صورتِ حالات ہی پر بات کرنی ہے اگر
پھر مخاطب ہو کوئی بھی انجمن کوئی بھی ہو

تارِ گیسو یا رگِ گُل سے ہوئے ہم بے نیاز
دار تک جب آ گئے عاشق رسن کوئی بھی ہو

ہے وہی لاحاصلی دستِ ہنر کی منتظر
آخرش سر پھوڑتا ہے کوہکن کوئی بھی ہو

ہیں جو پُر از آرزو ہوتے نہیں محتاجِ مے
رات دن مخمور رکھتی ہے لگن کوئی بھی ہو

ہے کسی محبوب کی مانند اُس کا انتظار
دیدہ و دل فرشِ رہ مشتاقِ فن کوئی بھی ہو

شاعری میں آج بھی ملتا ہے ناصِر کا نشاں
ڈھونڈتے ہیں ہم اُسے بزمِ سخن کوئی بھی ہو

عادتیں اور حاجتیں باصِر بدلتی ہیں کہاں
رقص بن رہتا نہیں طاؤس بَن کوئی بھی ہو

○

☆

قرار پاتے ہیں آخر ہم اپنی اپنی جگہ
زیادہ رہ نہیں سکتا کوئی کسی کی جگہ

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

دل و نظر کی جو بچھڑے ہوئے تھے مدت سے
ہوئی ہے آج ملاقات اک پرانی جگہ

ہیں اپنی اپنی جگہ مطمئن جہاں سب لوگ
تصورات میں اپنے ہے ایک ایسی جگہ

یہاں نہ جینے کا وہ لطف ہے نہ مرنے کا
کہا تھا کس نے کہ آ کر رہو پرائی جگہ

گِلہ بھی تجھ سے بہت ہے مگر محبت بھی
وہ بات اپنی جگہ ہے یہ بات اپنی جگہ

نہیں ہے سہل کوئی جانشینِ قیس ملے
پڑی ہوئی ہے بڑی دیر سے یہ خالی جگہ

کیے ہوئے ہے فراموش تو جسے باصِر
وہی ہے اصل میں تیرا مقام تیری جگہ

○

ہوائے طرب

(۲۰۱۰ء)

ایک دروازہ کیا کھُلا باہر گھر کا ہر فرد چل دیا باہر
دیکھ یخ بستہ ہے ہوا باہر اِس طرح ایک دم نہ جا باہر
چل دیے یوں صنم کدے سے ہم جیسے مل جائے گا خدا باہر
ایک تجھ سے رہے ہمیشہ دور ورنہ کیا کچھ نہیں ملا باہر
گھر میں آ کر سکوں ملا باصرؔ کس قدر تیز تھی ہوا باہر

..... ○ .....

☆

بیٹھے رہیں گے وہ تو ہمیشہ دبا کے بات
ہم ہی کریں گے اُن سے کسی روز جا کے بات
کچھ بھی نکال سکتے ہیں مطلب وہ بات کا
کرتا ہوں اِس لیے میں بہت بچ بچا کے بات
پیچیدہ ہو گئے ہیں ہمارے تعلقات
کرنی پڑی ہے مجھ کو گھما کے پھرا کے بات
اک ہم کہ لے کے بیٹھ گئے ایک لفظ کو
اک وہ کہ چل دیئے جو ہنسی میں اُڑا کے بات
کہتا ہوں دل کی بات گھٹا کر رقیب سے
کرتا ہے وہ جو آگے بڑھا کے چڑھا کے بات
وہ جو بنی ہوئی ہے رکاوٹ سی درمیاں
ملنا ہو اب ہمیں تو ملیں وہ ہٹا کے بات
مطلوب واعظوں کو ہیں شاید ہمارے اشک
ہنسنے کی بھی وہ کرتے ہیں اکثر رُلا کے بات
باصرؔ بیانِ سادہ کو پایا ہے بے اثر
کیجیے ذرا سنوار کے قدرے بنا کے بات

○

☆

منعم نہ ہاتھ کھینچ مدد سے غریب کی
روزی ہے تیرے رزق میں اس کے نصیب کی
حیران کن تھی چُپ بھی تمہاری مرے لیے
بولے ہو اب تو بات بھی تم نے عجیب کی
سامانِ عیش دیکھ کے بزمِ نشاط میں
رہتی ہے یاد کس کو نصیحت طبیب کی
کب تک کرو گے اہلِ سیاست پہ اعتبار
یارو کبھی سنو کسی شاعر ادیب کی
ہو جن کی سب توجہ سمندر کے اُس طرف
اُن کو صدا سنائی نہ دے گی قریب کی
سینہ بہ سینہ کرتی ہے یہ ہر طرف سفر
حق بات کو نہیں ہے ضرورت نقیب کی
باصرؔ بلا مقابلہ وہ منتخب ہوا
میری شکستہ پائی ہے محسن رقیب کی

○

براہِ راست

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

صد شکر پروردگار کا، دیر آید درست آید ناصر کاظمی کے شعر کے معنی و مفہوم دونوں پر پورا اترنا اوران کے لائق فرزندارجمند جناب باصر کاظمی کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کرنا ادارہ چہارسو کے لیے باعث فخر اور باعث انبساط ہے!

قارئینِ چہارسو کے لیے یہ خاص پیشکش ، مانند سوغات ہونی چاہیے۔اس خاص اوراہم موقع پرہم جناب باصرِ سلطان کاظمی صاحب کے فراخ دلانہ قلمی تعاون اور بے لوث محبت کے لیے ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں!!

موقع کی مناسبت اور وقت کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ کا وقت ضائع کرنا کسی طور مناسب نہیں، آیئے اوّلین فرصت میں جناب ناصر کاظمی کے فرزندارجمند باصر سلطان کاظمی سے ہم کلام ہوجایئے اوراس خاص اشاعت کے حوالے سے اپنی فراخ دلانہ سے ضرور سرفراز کیجیے!!!

.....گلزار جاوید

☆ بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تبرک کے طور پر گفتگو کا آغاز ناصر صاحب کی یادوں سے کیجیے۔ بطور والد، بطور انسان اور بطور شاعر ناصر صاحب کے بارے کچھ نیا، کچھ الگ بتلایئے؟

☆☆ اِس ضمن میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ایک پوری کتاب ’’ناصِر کاظمی: شخصیت اورفن‘‘، اکادمی ادبیات پاکستان کے ایما پر لکھی جو 2007 میں شائع ہوئی۔ ناصِر کے مجموعوں ’پہلی بارش‘، ’سُر کی چھایا‘ اوران کے کیے ہوئے ولی دکنی، میؔر، غالبؔ اور انیسؔ کے انتخابوں کے طویل دیباچے اور ’ناصِر کاظمی کا دیوان‘، مطبوعہ ’ہجر کی رات کا ستارہ‘، طبع دوم، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، 2013۔فوری طور پر کچھ نیا، کچھ الگ ذہن میں نہیں آرہا۔

☆ بیت بازی کے مقابلے میں شرکت کا فیصلہ کسی کے اصرار پر کیا تھا یا دل کی آواز پر، مقابلے میں پڑھے گئے اشعار کی نسبت ناصر صاحب کی اصلاح سے پہلے اور بعد کی صورت حال میں ہماری دلچسپی فطری ہے؟

☆☆ پی ٹی وی پر نوجوانوں کے لیے ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس میں بیت بازی اور شعروسخن کے پروگرام ہوتے۔اس کے میزبان شوکت تھانوی مرحوم کے بیٹے خورشید شوکت تھے۔ میری اس میں شریک ہونے کی خواہش پاپا نے خورشید صاحب تک پہنچادی۔اس پروگرام اور مقابلوں میں پڑھے گئے اشعار کی نسبت میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے،’موجِ خیال‘ کے دیباچے میں یہ لکھا تھا:

سکول میں یہ میرا آخری سال تھا جب ٹیلیویژن پر نوجوانوں کے لیے شعروادب کا ایک پروگرام شروع ہوا۔ میں نے بیت بازی کے دوتین پروگراموں میں حصہ لیا اور ایک پروگرام میں اپنی نظم نما غزل سنائی۔ ع دُور سایا سا ہے کیا پھولوں میں۔اس کے بیشتر اشعار پاپا کی اصلاح سے کسی قابل ہوئے۔اس سے اگلے برس جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا تو یہ غزل ’راوی‘ میں چھپی جو ایک اعزاز تھا۔کالج میں شعر کہنے کے شوق کو گویا پَر لگ گئے۔’مجلسِ اقبال‘ کے اجلاس بہت بھرپور ہوتے تھے اور ان میں اپنی تخلیقات پیش کرنا بہت بڑا اعزاز تھا۔بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کے لیے کالج کی ٹیمیں ملک بھر کے کالجوں میں بھیجی جاتی تھیں۔ٹرافیاں، تمغے ایک طرف، مفت کی سیر الگ۔سو میرا شعر کہنا جاری رہا اور پاپا اس لیے اصلاح اور حوصلہ افزائی کرتے رہے کہ یہ تخلیقی عمل میری نشوونما میں مدد ثابت ہوگا۔لیکن وہ میری اصل ترقی تعلیمی میدان میں دیکھنا چاہتے تھے۔

پاپا کو شاذ ہی کوئی شعر پسند آتا۔ جو غزل میں انہیں دکھاتا، اصلاح کے بعد اس میں باقی کچھ نہ بچتا۔ بے وزن اشعار اور خاص طور سے تلفظ کی غلطیوں پر بہت ڈانٹ پڑتی۔’’یہ لفظ ایسے نہیں باندھا جا سکتا؛‘‘ وہ کہتے اور پھر اساتذہ کے کلام سے مثالیں دیتے جو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا۔اشعار کی باریکیوں پر اتنی تفصیلی گفتگو کرتے کہ ہیرا تراشنے کا عمل بہت آسان دکھائی دیتا۔مختلف شعراء کی کتابیں کھلتیں اور کئی بار آدھی رات ہوجاتی۔ باجی آکے یاد دلاتیں کہ اِسے صبح کالج بھی جانا ہے۔ پاپا مزید برہم ہوجاتے کہ اپنا وقت بھی برباد کرتا ہے اور میرا بھی۔کبھی کبھار میرے کسی مصرع کو پسندیدگی کا نشان نصیب ہوتا اور اگر کوئی پورے کا پورا شعر اس کا مستحق قرار پاتا تو یہ ایک واقعہ ہوتا۔ پھر پاپا سب کچھ بھول جاتے اور باجی (میری والدہ) کو بھی بلا لیتے اور کہتے، ’’آخر میرا بیٹا ہے نا!‘‘ باجی خوش تو ہوتیں لیکن بھرپور کوشش کرتیں کہ اُن کی خوشی ظاہر نہ ہونے پائے۔ کہا کرتیں کہ گھر میں ایک شاعر بہت ہے۔اگلے ہی لمحے پاپا حقیقت کی دنیا میں واپس آجاتے اور لاڈ سے کہتے، ’’بھاگ جا، اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔ یہ راستہ خوشی تو دیتا ہے لیکن بے شمار دُکھ دینے کے بعد۔‘‘ اُس دور کی چند ڈائریاں میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں اور میری زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ وہ اشعار/مصرعے ہیں جن پر پاپا

نے پسندیدگی کے نشان لگائے تھے۔ میں انہیں یہاں نقل کرنا چاہوں گا کہ انہیں کے سہارے میری یہ کتاب آپ تک پہنچ رہی ہے۔

ع ہوا چلی اور خوب چلی پھر
ع میں تری رات کا دیا ہوتا
ع وہی ننھے ننھے پودے تھے گھنے درخت کل کے

میں یاد کرتا ہوں تجھ کو جو آج کل اتنا
سبب یہ ہے کہ مجھے اور کوئی کام نہیں

جیسے کوئی پکار رہا ہو کہیں مجھے
یہ آدھی رات کس کی صدا یاد آگئی

تازہ تھا زخمِ ہجر تو تدبیر کچھ نہ کی
اب لاعلاج ہے تو دوا یاد آگئی

آوازِ رفتگاں مجھے لاتی ہے اِس طرف
یہ راستہ اگرچہ مری رہ گزر نہیں

اِس چمن کو بنانے والے نے
کیا بنایا تھا بن گیا کیا ہے

بعد موت کے روح ہماری
دنیا کو کیا پاتی ہو گی

سنو کہ آج تمہیں یاد کے دریچوں سے
صدائے رفتہ نے اک بار پھر پکارا ہے

آؤ کہ گِن سکوں گا نہ شامیں فراق کی
یہ انگلیاں تو ختم ہوئیں سب حساب میں

(یہ غزل پاپا کی وفات کے بعد مکمل ہوئی)

☆ بظاہر لگتا یہ ہے کہ ناصر صاحب نے آپ کے شوق اور لگن کو آزمانے کے لیے کہا ہوگا ''بھاگ جا'' یہ راستہ خوشی تو دیتا ہے لیکن بے شمار دُکھ کے بعد، صحیح صورت حال آپ سے بہتر کون بتلا سکتا ہے؟

☆☆ بے شک، یہ پاپا نے میرے شوق اور لگن کو آزمانے کے لیے کہا تھا، اور اس راہ پر چلنے کی دشواریوں سے آگاہ کرنے کے لیے۔

☆ گاہے گاہے باز خواں کے طور پر کچھ تفصیلات اپنی سیکرٹری شپ اور ناصر صاحب کی ناراضگی کے حوالے سے بھی بتلا دیجیے؟

☆☆ میرا سیکرٹری کا انتخاب پاپا کے انتقال سے ڈھائی ہفتے قبل ہوا۔ مجھے انتخابی مہم میں مصروف دیکھ کے وہ بہت سیخ پا ہوتے۔ ایک بار تو باقاعدہ میری پٹائی کر دی اور چھوٹے بھائی حسن سے کہا کہ کل سے اس کے خلاف مہم چلاؤ۔ اُن کی دوسری تشویش یہ تھی میں وقت تو ضائع کر ہی رہا تھا، 'بے عزتی' بھی کرواؤں گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں اپنی 'ہٹ دھرمی' سے باز آنے والا نہیں تو اُن کی خواہش یہ ہوتی کہ میں باعزت طریقے سے ہار جاؤں اور اِس طرح اپنی 'بھڑاس' نکال لینے کے بعد پڑھائی کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔

☆ کچھ روداد سائنس سے دل اُچاٹ ہونے، بھائی کے ساتھ مل کر گھر میں لیبارٹری قائم کرنے کی سنا دیجیے؟

☆☆ نویں جماعت میں پہنچ کر مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ سائنس پڑھوں یا آرٹس۔ پاپا بہ تکرار کہتے کہ زمانہ سائنس کا ہے۔ چچا عنصر کی خواہش تھی کہ میں بی ایس ای انجینئرنگ کرتا، جبکہ باجی کا مدعا بس اتنا تھا کہ میں 'سیدھا سیدھا' ایم اے کروں، پھر جو مرضی کروں۔ میرے نزدیک سائنس پڑھنے کا مطلب صرف ڈاکٹر یا انجینئر بننا تھا۔ اگرچہ فزیالوجی میرا پسندیدہ مضمون تھا لیکن ڈاکٹری میں جو 'خون خرابہ' اور 'چیر پھاڑ' ہوتی ہے، اس سے میری جان جاتی۔ انجینئرنگ میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس سے میں بھاگتا لیکن کوئی ایسی بات بھی نظر نہ آتی جو اپنی طرف کھینچتی۔ سائنس دان بننے کا اگر ہمارے وطن میں کوئی تصور ہوتا تو میں ضرور یہ کوشش کرتا۔ سائنس سے میرے عشق کا یہ عالم تھا کہ آرٹس کے مضامین چُننے کے باوجود فزیالوجی کا بھی انتخاب کیا اور میرے جو دوست فزکس، کیمسٹری پڑھتے تھے ان کی کتابیں مستعار لے کر پڑھتا۔ میں نے اور حسن نے اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا بچا کر گھر میں ایک چھوٹی سی لیبارٹری بنالی۔ موجدوں کی زندگیوں اور ان کی ایجادات کے بارے میں کتابیں اکٹھی کیں۔ 'Seven Inventors' جانے کتنی بار پڑھی۔ ذہن پر یہ بھوت سوار تھا کہ کچھ ایجاد کیا جائے، لیکن کیا؟ سب کچھ تو ایجاد ہو چکا تھا۔

☆ آپ کی زندگی میں پتنگ بازی اور شطرنج کے کھیل کا دخل بھی کافی بتلایا جاتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے کچھ احوال ان اشغال کا بھی منظر عام پر آنا ضروری ہے؟

☆☆ میرے دوست ساجد علی نے میرے دوسرے شعری مجموعے چمن کوئی بھی ہو کے دیباچے میں لکھا:

ستر کی دہائی ہماری آوارہ گردیوں اور رتجگوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں شاعری کے علاوہ باصر کو شطرنج سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ یا تو ہر وقت شطرنج کی بساط سامنے رکھے اکیلا ہی کسی گرینڈ ماسٹر کی گیم کو سمجھنے میں دماغ سوزی میں مصروف ہوتا یا پھر شطرنج کے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑیوں کے بارے میں کتب

کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اسی زمانے کو یاد کرتے ہوئے اس نے یہ شعر کہے ہیں:

کھلاڑی مجھ سے بہتر بیسیوں پیدا ہوئے ہیں
مگر شطرنج سے جو عشق مجھ کو تھا کسے تھا

یہی بچائے گا تم دیکھنا مری بازی
بساط پر جو یہ ناچیز سا پیادہ ہے

شاعری اور شطرنج کے علاوہ باصر کو پتنگ بازی کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے بسنت منانے کی تیاری کرتا، ڈور کو مانجھا بھی خود لگاتا تھا۔ بسنت کے دن سب دوست اس کے گھر کی چھت پر جمع ہوتے اور خوب ہلہ گلہ ہوتا۔ میں اور بعض دوسرے دوست تو محض باصر کی خوشی کے لیے شریک ہوتے تھے کیونکہ ہمیں پتنگ بازی کے بارے میں سرے سے کچھ معلوم نہ تھا۔

☆ باقر رضوی صاحب جب آپ کو اصرار کر کے سید وقار عظیم کے روبرو لے گئے اور شعر سنانے کی فرمائش کی تو آپ کی کیفیت کیا تھی۔ ممکن ہو تو مذکورہ بالا چند اشعار قارئین کے اشتیاق کے پیشِ نظر سنا دیجیے؟

☆☆ سجاد باقر رضوی صاحب کو میرے شعر کہنے کا علم ہوا تو کھِل اٹھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے کسی مصلحت یا اندیشے کے بغیر اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی۔ مذکورہ نظم/غزل پر مجھے با قاعدہ انعام دیا۔ ایک شعر پر تو بہت ہی محظوظ ہوئے:

آپ سا بے وفا نہیں دیکھا
ہم نے طوطا اُڑا کے دیکھ لیا

باقر صاحب اورینٹل کالج میں استاد تھے۔ ساتھ لاء کالج اور اس کی دیوار کے دوسری طرف ہمارا اسکول، سینٹ فرانسس ہائی سکول تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر چھٹی کے بعد میں اور حسن بس سٹاپ کی طرف جا رہے تھے کہ باقر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اصرار کر کے ہمیں اپنے کالج لے گئے۔ پہلے سیون اپ سے ہماری تواضع کی پھر ہمیں پروفیسر وقار عظیم کے کمرے میں لے گئے۔ ہمارا تعارف کرایا اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے شعر سنانے کو کہا۔ میں اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ بہت کہا کہ وہ تو بچوں کے پروگرام کے لیے تھے، اور وہ تو کچھ بھی نہیں تھے، لیکن باقر صاحب کی فرمائش حکم میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے کپکپاتی آواز میں جو چار پانچ اشعار تھے سنا دیئے۔ وقار صاحب شفقت سے مسکراتے رہے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

☆ سنا ہے! ابتدا میں کچھ لوگ آپ کی نسبت ناصر صاحب سے لکھوانے کا تاثر رکھتے تھے۔ آپ کے احساسات اور اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے آپ کی کاوشات سے باخبری ضروری بھی ہے اور لازمی بھی؟

☆☆ میں نے اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے کوئی خاص کاوش نہیں کی۔ پاپا ہی نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ ایسا ہو گا لیکن تم اس کی زیادہ فکر نہ کرنا۔ وقت کے ساتھ لوگ تمہیں جان جائیں گے۔ .Just be your self

☆ ہر بڑے باپ کے بیٹے کی طرح آپ کو بھی اپنی شناخت بنانے کے لیے یقیناً کڑی جدوجہد کرنا پڑی مگر ہم آپ کی زبانی اُن سازشی لوگوں کے بارے آگاہی کے خواہشمند ہیں جو آپ کا موازنہ ہمعصروں کے بجائے ناصر کاظمی سے کرنے پر بضد تھے؟

☆☆ میرا موازنہ ہمعصروں کے بجائے ناصر کاظمی سے کیا جانا ایک فطری بات تھی، اور ہے۔ میرے بھی خواہ بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ اپنی شناخت بنانے کے لیے ہر شخص کو کڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، بڑے باپ کا بیٹا ہونا شرط نہیں۔ میرا ایک شعر ہے:

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

☆ وہ کونسی وجوہات تھیں کہ اوائل عمر میں ہی ناصر صاحب نے آپ کو الگ راہ پر چلنے کے لیے باریک لکیر کو واضح کرنے کے گُر سکھانا ضروری سمجھا؟

☆☆ اپنی شناخت بنانے کے لیے

☆ وہ کون سے رائج الوقت فیشن تھے جن سے پرہیز کی ناصر صاحب نے نصیحت فرمائی اور آپ نے اس نصیحت پر کس حد تک عمل کیا؟

☆☆ بہت زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ اور برتے جانے والے مظامین کے اظہار سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی تھی لیکن صرف ابتدائی دور میں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب کوئی شاعر اپنی انفرادیت اور پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسے ہر طرح کی آزادی میسر آ جاتی ہے۔

☆ بلند قامت اور قادر الکلام شاعر کے ہونہار شاعر فرزند کو غیر شاعرانہ خیالات کو منظوم کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ کوئی خیال غیر شاعرانہ نہیں ہوتا۔ بیان شاعرانہ ہونا چاہیے۔

☆ انیسویں صدی کے مشہور ولندیزی مصور وان گوخ نے مصوری کے لیے سب سے بڑا چیلنج چھ رنگوں میں توازن بتلایا ہے جبکہ شاعری بالخصوص اردو میں قلبی واردات، روحانی کیفیات، تخیل اور دلبر و دلکش الفاظ میں پیش کرنے کا نام ہے۔ آپ کے ہاں کس چیز یا عمل کو زیادہ دخل ہے؟

☆☆ ان سب کا

☆ آپ کی شاعری کو ایک ہی وقت میں Anti ،Thesis Thesis اور Synthesis بتلا کر قاری کو مشکل میں ڈالنا کیوں ضروری ٹھہرا؟

☆☆ یہ تو ڈاکٹر قیصر عباس زیدی کا کہنا ہے۔ قاری کو مشکل میں پڑنے کی بجائے اپنا تھیسس قائم کرنا چاہیے۔

☆ آپ کے رومان کو انسان کے انفس اور آفاق سے یکساں مربوط،

کس مماثلت اور یکسانیت کے سبب گردانا جاتا ہے؟

☆☆ جاوید اقبال اعوان کا پورا بیان درج کرتا ہوں:

باصر کاظمان انسان کے انفس اور آفاق سے یکساں مربوط ہے۔اس کی شاعری ہار نہ ماننے اور پُر تیقن مسافت کا اسم ہے۔دل کی دھڑکنیں گنتے سمے وہ حالات کی نبض بھی ٹٹول لیتا ہے۔اس کی تشخیص چشم کشا، رہ نما اور جادہ پیما ہے۔

☆ کبھی کسی محفل یا مجلس میں، آپ سے صدا کے بھرم اور نوا گری کے اعتبار کو محبت کا نقطۂ آغاز سمجھنے کی بابت دریافت نہیں کیا گیا؟

☆☆ نہیں

☆ لندن کے ایک بزرگ کے خیال میں آپ کی نظم، غزل سے آگے کی چیز ہوگئی ہے۔آپ کے خیال میں یہ رائے اگر درست ہے تو اس کی وجوہات کیا ہیں اور آپ کے شعری مستقبل پر اس کے اثرات کس نوعیت کے ہو سکتے ہیں؟

☆☆ مذکورہ بزرگ کا تعلق لاہور سے ہے۔ان کی رائے کا ذکر صباحت عاصم واسطی نے کیا ہے اور کچھ یوں:

حال ہی میں لندن میں باصر کی پذیرائی میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ایک بزرگ تجزیہ نگار نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے آگے چل کر باصر کی نظم اُس کی غزل سے زیادہ قبولیت کی سند حاصل کرے۔گو کہ بنیادی طور پر مجھے اِس تجزیے سے اختلاف ہے مگر یہ بیان اِس بات کی طرف ضرور توجہ مبذول کراتا ہے کہ باصر کی نظم کو نظر انداز نہیں جاسکتا۔بے شک باصر کی نظم بھی اپنا ایک رجحان وضع کیے ہوئے ہے۔باصر کی نظموں کے مضامین موجودہ حالات اور عصری زندگی سے مخترع ہیں۔اُس کی نظمیں، 'خواندگی'، 'قلم دوات'، 'پڑھو گے لکھو گے'، 'بادشاہت جہنم میں'، 'حفظِ ما تقدم'، 'ایک ڈیم فول کو نصیحت'، 'وادی المملوک کے ایک کارکن کی عرض داشت' اور 'شاہی محل کے ایک ملازم کی نجی گفتگو' خاص طور پر غور طلب ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆ جو صاحب سوال مذکور کا موجب بنے آگے چل کر وہی آپ کو غالب کے اسلوب کی پیروی کا کریڈیٹ یا الزام دے کر، داد و تحسین سے بھی نواز رہے ہیں؟

☆☆ اپنے کلام میں اسلوبِ غالب کا اثر مجھے بھی نظر آتا ہے۔

☆ آج کی نشست میں ضدین کو زوجین بنانے کے خیال کی وضاحت بہت سے اُن کھلے دریچوں کو وا کر سکتی ہے؟

☆☆ تخلیقی لمحوں میں شاعر کو ایک جیسی چیزوں میں فرق نظر آتا ہے اور ضدین میں مماثلت۔

☆ جدید اردو شاعری میں اکثر تازہ کاری کا ذکر کیا جاتا ہے۔آپ اپنے لہجے میں جدت اور تازہ کاری برقرار رکھنے یا لانے کے لیے کس طرح کی کوشش کیا کرتے ہیں؟

☆☆ اپنے لہجے میں جدت اور تازہ کاری برقرار رکھنے یا لانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتا۔شاعری کو زندگی سے اس طرح پھوٹنا چاہیے جیسے بقول کیٹس، درختوں پر پتّے۔جب ایسا ہوتا ہے تو تخلیق جدید ہی ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

☆ آپ کی شاعری میں معاشرتی ناانصافیوں اور زیادتیوں پر کڑھنے کا ذکر کس علاقے اور قوم کے پس منظر میں بیان ہوتا ہے؟

☆☆ ہر علاقے اور ہر زمانے کی اقوام کے پس منظر میں۔

☆ صابر حسین صاحب جو لانی فکر، سماجی شعور، تشبیہ گری، استعارا سازی اور پیکر تراشی میں باصر کاظمی کی ناصر کاظمی پر برتری کی جو نشان ہی کی ہے اُس کی بابت آپ کی رائے ریکارڈ پر آنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے؟

☆☆ انہوں نے برتری کی بات نہیں کی، موازنہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ کہتے ہیں:

ناصر کاظمی کی شاعری میں جو پختگی، برجستگی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے وہی پختگی، برجستگی اور بلند آہنگی باصر کاظمی کے کلام میں بھی نمایاں ہے لیکن دونوں کا اندازِ خطاب جدا جدا ہے.....ناصر کاظمی کے ہاں محشر خیالی، فصاحت اور پاسِ وفا جلوہ گر ہیں اور باصر کاظمی کے ہاں جولانیٔ فکر اور سماجی شعور پایا جاتا ہے۔

☆ منصور آفاق صاحب آپ کی شاعری میں کرافٹ کے تکلمانہ انداز، مزاج کی تجزیاتی اپج، خیال کی عجلت پسندی، سرسری مشاہدہ کی بے پناہ گہرائی، مزاح کی حد کو چھوتی ہوئی شگفتگی، محبت میں حقیقت پسندی کے رجحان، لاحاصلی کی نامعلوم خلش اور ہجراں نصیبی کے کامل یقین کی سند عطا کرتے ہوئے درج ذیل شعر کی نشاندہی فرمانا بہت کچھ اُن کہا جاننے کی خواہش پر مجبور کرتا ہے؟

آشنا درد سے ہونا تھا کسی طور ہمیں
تو نہ ملتا تو کسی اور سے بچھڑے ہوتے

☆☆ منصور کی اس رائے کو احباب نے پسند کیا تھا۔

☆ ناصر کاظمی کے ہاں زمینی ہجرت، باصر کاظمی کے ہاں معاشی ناہمواری، تاثر اور تاثیر مگر ایک طرح کی؟

☆☆ ہجرت کی وجوہات کچھ بھی ہوں، اس کا دکھ ایک جیسا ہوتا ہے۔

☆ بہت سے احباب آپ کی ردیفوں کو جداگانہ بتلا کر آپ کے اعترافِ فن کو سوا کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں اُس کے بعد تفصیل جاننا آپ کے قاری اور ناقد کا حق بنتا ہے؟

☆☆ مجھے احباب نے احساس دلایا کہ میری ردیفیں جداگانہ ہیں۔میں نے غور کیا تو دیکھا کہ ان میں بہت سی ردیفیں اسما اور صفات پر مشتمل تھیں، مثلاً، تصویر، شکایت، خبریں، خرابیاں، خراب، ٹھیک۔ایسی ردیفوں کو نبھانا بے حد مشکل ہوتا ہے بالخصوص مطلعوں میں جہاں ایک مصرعے کی ردیف بالعموم زائد ہو جاتی ہے۔بہر حال، یہ تو میں نے بعد میں نوٹ کیا۔

☆ ڈاکٹر مختار الدین احمد کا یہ خیال کہ آپ نے بھگوت گیتا اور ارتھ شاستر کی مدد سے اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا، کس حد تک درست ہے اور اس کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ میری نثری نظموں کے مجموعے 'چونسٹھ خانے چونسٹھ نظمیں' کی نظمیں میرے ڈرامے 'بساط' کے مکالموں سے ابھری ہیں۔ اس ڈرامے کے دونوں مرکزی کردار شطرنج کے اعلیٰ کھلاڑی بھی ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین صاحب نے یہ نہیں کہا کہ میں نے بھگوت گیتا اور ارتھ شاستر کی مدد سے اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا، انہوں نے اس مجموعے پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں ''کئی جگہ بھگوت گیتا اور ارتھ شاستر کی یاد آتی ہے۔ گیتا سے یہ دور دراز کی مماثلت اِس لیے ہے کہ شطرنج کی بساط میدانِ جنگ ہی ہوتی ہے جہاں دو کھلاڑی مہروں سے اپنے بادشاہ کی حفاظت اور دشمن کے بادشاہ کی موت کے لیے جنگ لڑتے ہیں۔ کم و بیش یہی موضوع گیتا کا بھی ہے۔ مثلاً یہ نظم ارجن کے تذبذب کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے ورنہ تاج، ہما اور بادشاہت آج کے موضوع نہیں ہیں، سوائے شطرنج کی بساط پر:

کیا رکھا ہے تاج میں
سر درد کے سوا۔
میں جب بھی کھُلے آسمان تلے ہوتا ہوں،
ڈرتا رہتا ہوں،
کہیں مجھ پر سے ہما نہ گزر جائے۔

گیتا کا پیغام یہ ہے کہ ہمیں اجتماعی فائدے کے لیے سماج کے ایک رکن کی طرح کام کرنا چاہیے۔ اِس میں اگر ذاتی مفاد کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو اس سے قطع نظر کر لینا چاہیے۔ گیتا راہِ عمل اور دھیان کی راہ کے درمیان ایک راستہ نکالتی ہے جو خیر الامور کا رستہ ہے۔ گیتا خود غرضی کے بغیر محنت اور استقلال سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ گیتا کے ساتھ ساتھ اِن نظموں سے کہیں کہیں ارتھ شاستر اور چانکیہ کی یاد بھی آتی ہے لیکن صرف شطرنج کے پس منظر کی وجہ سے۔''

☆ آپ کے خیال کے مطابق وطن عزیز میں Incidental Rhymers کی شناخت اور حیثیت کے تعین کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے اور کس طرح ہونا چاہیے؟

☆☆ ایسے معاملات وقت خود بخود طے کر دیتا ہے۔

☆ پروفیسر حسن عسکری ناصر صاحب کے بڑے مداح اور قدر دان تھے مگر ایک شعر میں لفظ ''گھاس'' کے استعمال کے بعد عسکری صاحب کی گرمجوشی میں فرق آ گیا اگر آج عسکری صاحب حیات ہوتے اور آپ کا شعر:

مشکل ہوا پتنگ کو اپنی سنبھالنا
الجھن ہوئی ہے ڈور سے کوئی دگاڑسی

سن کر اُن کا فرمان کیا ہوتا؟

☆☆ شاید اب تک ان کے نقطۂ نظر میں کچھ لچک پیدا ہو چکی ہوتی۔

☆ اوّل مشکور حسین یاد صاحب نے آپ کو اکڑفوں کا شاعر کیوں ٹھہرایا دوئم:

کیا کیا وہ ہمیں سنا گیا ہے
رہ رہ کے خیال آ رہا ہے

کا حوالہ دے کر ناصر تو کیا میر کو پچھاڑنے کے مغالطے میں مبتلا نظر آتے ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ یاد صاحب نے ناصر اور میر کو پچھاڑنے کی بجائے ناچیز کے اسلوب کی ان بزرگوں کے اسلوب سے مختلف ہونے کی بات کی ہے۔

☆ ڈراما لکھنے کی للک اور وسیلہ کون لوگ بنے۔ ڈرامہ لکھنے سے قبل آپ نے کتنے ڈرامے دیکھے اور پڑھے اور کس رائٹر کو دل، دماغ کے قریب پا کر چھلانگ لگا بیٹھے؟

☆☆ شیکسپیئر، برنارڈ شا، ہنرک ابسن اور اوسکر وائلڈ کے مطالعے نے ڈراما لکھنے کی تحریک اور ترغیب دی۔ انہی کو میں اپنے دل و دماغ کے قریب پاتا ہوں۔

☆ ڈراما بساط کے لیے دس سالوں پر محیط ریسرچ کی ضرورت کیوں آن پڑی اور اس کے نتائج آپ کی منشا کے مطابق تھے کہ نہیں؟

☆☆ کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنا قت کیوں لگا یہ جاننے کے لیے میری کہانی 'مانوس اجنبی' دیکھیے جو ڈرامے کے ساتھ کتاب میں شائع ہوئی۔ اس کے نتائج میری منشا کے مطابق تھے بلکہ احباب نے جو عزت افزائی کی وہ میری توقع سے زیادہ تھی۔

☆ آپ کی ڈراما نگاری پر جس قدر بھی گفتگو کی جائے کم ہے مگر آغا سہیل صاحب نے ''بساط'' کے حوالے سے ابسن اور شا کی کا ذکر کس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ اس ضمن میں آغا سہیل صاحب صاحب کا کہنا ہے:

بساط میں تخلیق کے تیور مجھے ابسن اور شا کی یاد دلاتے ہیں۔ وہی کرداروں کے مکالموں میں نفسیاتی تجزیئے، گفتگو میں لاشعور سے رجوع رکھ کر نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانا، شعور، لاشعور، قبل شعور اور تحت الشعور کے سمندر کو بلو بلو کر گہرائی سے موتی اور سطح سے دور کی کوڑی لانے والی بات کو تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کی زبان میں بیان کرنا۔

☆ جناب جمیل الرحمٰن نے ڈرامہ ''بساط'' کو اردو ادب میں بائبل کا مقام دینے کی بات کس حد تک درست کی ہے؟

☆☆ ان کی مکمل رائے درج کر دیتا ہوں:

میں اسے ایسے ذاتی اور سماجی ضابطۂ حیات کی علامت کے طور پر لے رہا ہوں جس میں ہمارے رویوں کے بنیادی مسائل، جنہیں افسانوں اور

شاعری میں تکرار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، ایک جامع اور CONDENSED شکل میں اس مختصر ڈرامے میں موجود ہیں۔ تاریخی شعور سے لے کر موجودہ نفسیاتی، سائنسی نقطۂ نظر تک۔ تہذیبی اساس کہاں اور کیسے اُٹھتی ہے، اس کے اشارے بھی اس میں موجود ہیں۔ آپ موجودہ ادب کا کوئی مضمون مجھے بتائیں، میں آپ کو اس میں سے نکال کے دکھادوں گا۔ یہ ہے بائبل میرے لیے۔

☆ ترقی یافتہ ممالک کے ادب میں تنقید کی اہمیت وافادیت سے آپ بخوشی شناسائی اور واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں تنقیدی رویے سے آگاہی کے ساتھ آپ کی نسبت لکھی گئی تنقید کی بابت آپ کی رائے اس گفتگو کی پنچ لائن کا کام دے سکتی ہے؟

☆☆ میری کاوشوں کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا گیا، جو کچھ لکھا گیا،، وہ میرے لیے بہت حوصلہ افزا اور باعثِ مسرت ہے۔

☆ آپ کے بارے تاخیر سے قبولیت عام کا تاثر کس بنا پر قائم کیا جاتا ہے؟

☆☆ قبولیتِ عام کا اپنا اپنا تصور ہے۔ میرے خیال میں تو مجھے ادبی حلقوں میں بہت جلد قبول کرلیا گیا۔ زمانہ طالب علمی ہی میں میری غزلیں 'فنون' اور دیگر رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔ مجھے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا، حلقہء اربابِ ذوق اور دیگر ادبی تنظیمیں غزل پیش کرنے کی دعوت دیتیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے میری کاوشیں سامنے آتی گئیں اہلِ ادب میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کاوشوں کی اشاعت کے درمیان وقفے طویل ہوتے کیونکہ میں اپنی تحریروں سے مطمئن ہونے میں بہت وقت لیتا ہوں۔

☆ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے اہل قلم سے آپ کے روابط مثلاً دیجانی چٹرجی اور سائمن فلیچر کے ساتھ جو محفلیں، مجالس برپا کی گئیں اُن کے مقاصد اور نتائج میں ہمیں اور ہمارے قاری کو شریک کیجیے؟

☆☆ 1996 میں جب انگریز شاعر سائمن فلیچر (Simon Fletcher) سے میری دوستی ہوئی تو اس نے اس تعلق کو دو ثقافتوں اور تہذیبوں کے مابین ایک پُل سے تعبیر کیا اور ایک نظم A Little Bridge of Sympathy لکھی۔ اس سے اگلے برس آرٹس کونسل آف انگلینڈ کی سپانسرشپ پر سائمن اور میں نے پاکستان کا دورہ کیا۔ لاہور میں سائمن کی بہت پذیرائی ہوئی۔ مختلف ادبی تنظیموں اور تعلیمی اداروں نے اُس کے اعزاز میں تقاریب منعقد کیں جہاں اُس نے اپنی نظمیں سنائیں اور گفتگو کی۔ ایک دوست نے سائمن کے لئے کوہ مری کی سیر اور ٹیکسلا کے دورے کا انتظام کیا اور اُس نے ایک نظم Dreaming Of Taxila کہی۔ ناصر کاظمی کی پچیسویں برسی کے موقع پر آرٹس کونسل الحمرا میں ایک خصوصی تقریب احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں ہوئی۔ انتظار حسین اور شہرت بخاری مہمانانِ خصوصی تھے۔ سائمن نے اس موقع کے لئے خصوصی طور پہ ایک نظم لکھی۔

سائمن اور میرے پاکستان کے سفر کی تیاری کے دوران ہمارا رابطہ آرٹس کونسل کی مشیر ڈاکٹر دیجانی چیٹرجی (Debjani Chatterjee) سے ہوا۔ دیجانی ہندو ہیں اور ان کی مادری زبان بنگالی ہے۔ وہ ہندی سے بھی بخوبی واقف ہیں اور انگریزی کی انعام واعزاز یافتہ معروف شاعرہ ہیں۔ ہم تینوں نے کئی معاملوں میں اپنے خیالات ایک سے پائے۔ کچھ عرصے بعد ہم نے ایک گروپ 'منی مشاعرہ' (Mini Mushaira) تشکیل دیا جس کا مقصد ادب کے ذریعے مختلف قومیتوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔ 'منی مشاعرہ' کے انتظامی امور میں دیجانی کے آئرش شوہر، شاعر برائن ڈارسی (Brian D'Arcy) نے ہماری بہت مدد کی۔ میں نے سائمن اور دیجانی کی نظموں کے اردو میں تراجم کئے اور انہوں نے میری اعانت سے میری غزلوں اور نظموں کو انگریزی میں ڈھالا۔ مختلف شہروں کی لائبریریوں، ادبی تنظیموں اور تعلیمی اداروں نے ہمیں اپنی شاعری سنانے اور ورکشاپس کرنے کے لئے بلانا شروع کیا۔ ایسی بیشتر محفلوں میں اردو سمجھنے والا کوئی نہ ہوتا لیکن پھر بھی مجھ سے اردو سنانے کی فرمائش ضرور کی جاتی۔ شرکا اردو شاعری، بالخصوص غزل کا لحن بہت شوق سے سنتے۔ چنانچہ ہوتا یوں کہ میں اپنی شاعری کا اردو متن بھی سناتا اور اپنے ساتھیوں کی نظموں کے تراجم بھی۔ ہم نے ایک شعری مجموعہ A Little Bridge ترتیب دیا جسے 1997 میں Pennine Pens نے شائع کیا۔ اس میں سائمن اور دیجانی کی نظمیں اور میری غزلوں کے تراجم تھے جو دیجانی نے میری معاونت سے کئے تھے۔ اردو جاننے والے حلقوں میں ان تراجم کے معیار کو سراہا گیا۔ اشفاق نقوی اور انتظار حسین نے کالم لکھے۔ غزل کی ہیئت اور تابناک روایت سے متاثر ہوکر سائمن اور دیجانی نے انگریزی میں غزل کہنے کی کوشش کی لیکن اسے بے حد مشکل پایا۔ وہ یا تو صرف قافیہ نبھا پاتے تھے یا ردیف۔ دونوں کو ایک ساتھ تواتر کے ساتھ نبھانا انہیں ناممکن لگتا۔ لیکن انہوں نے ہار نہیں مانی اور اشعار پر مبنی، غزلوں سے ملتی جلتی، نظمیں لکھتے رہے۔

2006ء میں دیجانی اور میں نے پاکستان کا دورہ کیا۔ سائمن کی طرح دیجانی کی بھی بے حد پزیرائی کی گئی۔ یہ شاید اس سفر کا اعجاز تھا کہ دیجانی نے چار مکمل اور بھرپور انگریزی غزلیں لکھیں۔ ایک کا عنوان 'لاہور' تھا۔ باغِ جناح لائبریری میں منعقدہ تقریب میں، جس کے صدر احمد ندیم قاسمی تھے اور مہمانِ خصوصی شہزاد احمد تھے۔ برٹش کونسل لاہور، حلقہء اربابِ ذوق، ناصر کاظمی سوسائٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، شعبہء فلسفہ پنجاب یونیورسٹی اور شعبہء انگریزی ایف سی کالج نے دیجانی کے اعزاز میں خصوصی تقاریب کا اہتمام کیا۔ دیجانی کی لاہور آمد کے بارے میں انتظار حسین نے 'دوستی کی پینگ امبر' کے عنوان سے ایک کالم لکھا۔ دیجانی کے دورے کے بعد برٹش کونسل اور منی مشاعرہ نے ایک وڈیو کانفرنسنگ مشاعرہ منعقد کیا جس میں برطانیہ اور پاکستان کے نمایاں شعراء نے برٹش کونسل کے مانچسٹر اور لاہور کے مراکز میں بیٹھ کر شرکت کی۔

☆ آپ کے شعر:

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

سلاؤ کے میکنزی سکوائر میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ کس بنا پر نصب کیا گیا؟

☆☆ لندن سے ملحق شہر سلاؤ میں مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ 2008 میں وہاں کی انتظامیہ نے مختلف زبانوں میں کی گئی شاعری کے نمونے اپنے نئے مال کی آرائش کا حصہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اردو کی نمائندگی کے لیے میرا شعر منتخب ہوا۔ عربی شاعری کا نمونہ معروف شاعر محمود درویش کے کلام سے لیا گیا۔

☆ کچھ تفصیل ملکہ برطانیہ کی جانب سے ملنے والے ایم۔بی۔ای اعزاز برائے ادب کی ہمارے قارئین سے شیئر کیجیے؟

☆☆ مئی 2013 کا دوسرا ہفتہ تھا۔ حسبِ معمول ڈاک دیکھتے ہوئے ایک لفافے پر نیلی روشنائی میں 'آن ہر میجسٹیز سروس' (On Her Majesty's Service) دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک سرپرائز برآمد ہوا۔ کابینہ آفس کے سیریمونیل آفیسر (Ceremonial Officer) رچرڈ ٹلبروک (Richard Tilbrook) نے لکھا تھا:

The Prime Minister has asked me to inform you, in strict confidence, that having accepted the advice of the Head of the Civil Service and the Main Honours Committee, he proposes to submit your name to the Queen. He is recommending that Her Majesty may be graciously pleased to approve that you be appointed a Member of the Order of the British Empire (MBE) . . . Before doing so, the Prime Minister would be glad to know that this would be agreeable to you.

اِس خط کے ساتھ منسلک فارم میں بتایا گیا تھا کہ اعزاز قبول کر لینے کی صورت میں لندن گزٹ میں میرے نام کے ساتھ یہ عبارت (citation) شائع ہونا تھی:

Poet. For Services to literature

یہ اعزاز میں نے فروری 2014 میں شہزادہ چارلس سے بکنگھم پیلس میں وصول کیا۔ اس سے چند ماہ قبل ملکہ الزبتھ اور ان کے شوہر ڈیوک آف ایڈنبرا نے برطانیہ کی شاعری کو celebrate کرنے کے لیے ایک عشائیہ دیا جس میں دیبجانی چیٹر جی اور میں بھی مدعو کیے گئے۔ وہاں ہمیں ملکہ معظمہ سے بات چیت کا خصوصی موقع ملا۔ دیبجانی نے ملکہ معظمہ سے کہا کہ اُس محفل میں وہ ہندوستان کی نمائندگی کر رہی تھیں اور میں پاکستان کی۔ میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ناچیز واحد شاعر یا ادیب ہے جسے انگریزی کے علاوہ کسی زبان میں کام کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے کوئی اعزاز دیا۔

☆ نصف صدی سے اوپر علمی، ادبی اور شعری سفر کے بعد کوئی آپ سے اس کا نچوڑ، اس کا ثمر، اس کا مستقبل دریافت کرے تو آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ پہلے تو یہ معروف شعر سناؤں گا:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

پھر اپنا یہ شعر پیش کرنے کی جسارت کروں گا:

تھی بے اثر غزالِ شکستہ کی آہِ نرم
اب چاہیے ہے شیرِ ببر کی دہاڑ سی

☆ تخلیق کار اپنے عصر کا عکاس ہوا کرتا ہے آپ نے بھی تمام عمر زندگی کے تلخ و شیریں حالات و واقعات، مشاہدات و تجربات اور محرمیوں کی نشان دہی میں صرف کی ہے مگر نیو ورلڈ آرڈر، منی ورلڈ آرڈر اور کرّہ ارض کے سر پر منڈلاتی تیسری عالمی جنگ کی روشنی میں اپنے قاری کو کس طرح کا حوصلہ، تسلی، دلاسہ یا اُمید دلانے کی پوزیشن میں ہیں؟

☆☆

وقت اچھا بھی آئے گا ناصِر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

۔ حوری ۔

چین میں بنی مصنوعی عورت چینی مارکیٹ میں پیش کر دی گئی ہے۔ جسم کا گوشت 100% فانٹافلش میٹریل جو سلیکون پارٹس سے بنایا گیا ہے۔ ایک چارج پر بغیر کسی رکاوٹ کے 72 گھنٹے کام کرتا ہے۔ کوئی روح/روح نہیں۔ کھانے کی ضرورت نہیں۔ اسے "HOORI" کا نام دیا گیا ہے جس کی مارکیٹ قیمت 200000+ ٹیکس ہے۔ یہ مصنوعی ذہانت پر کام کرتا ہے لہذا یہ 99% درستی کے ساتھ کوئی بھی زبان بول سکتا ہے۔

کمپنی ہندوستان کے نوجوانوں کو نشانہ بنانے کے لیے جلد ہی اس "HOORI" کو ہندوستان میں لانچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کوئی جہیز نہیں۔۔۔ کوئی زائچہ نہیں۔۔۔ کھانا پکاتا ہے، گھریلو کام کرتا ہے، کوئی دلیل نہیں، کوئی مطالبہ یا حکم نہیں!!!

- افسانہ -

مانوس اجنبی

باصر سلطان کاظمی

۱۹۷۵ء کی سردیاں تھیں۔ میں نے ایم اے کا امتحان دے رکھا تھا اور نتیجہ آنے میں ابھی مزید کئی ماہ باقی تھے۔ ہمارے ہاں بیشتر امتحانات اور اُن کے نتائج کے درمیان کم از کم دو موسموں کا وقفہ ضرور ہوتا ہے۔ شاید اِس کے پیچھے یہ حکمت ہے کہ طلباء کو آنے والی ممکنہ بیروزگاری کے لیے تیاری کرا دی جائے۔ مجھے ایک تو لکھنے پڑھنے سے کچھ شغف ہے، دوسرے شطرنج کا شوق اُن دنوں جنون کی حد تک تھا، لہٰذا بیکاری کا احساس تو بہت دور کی بات ہے، مجھے مصروفیت کا اِتنا لطف پھر کبھی نہیں آیا۔

ایک روز دوپہر سے کچھ پہلے میں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا شطرنج کی ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ وہ کتاب ویسے تو دنیا کے عظیم کھلاڑیوں کے مابین کھیلی گئی بازیوں اور اُن کے تفصیلی تجزیوں پر مشتمل تھی لیکن، غالباً اُس کے دیباچے میں یا کسی اور جگہ، شطرنج سے انسانوں کے عشق کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا کہ ایک شہزادی کو یہ کھیل اتنا بھا گیا تھا کہ اُس نے نہ صرف اِسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور ایک ماہر ترین کھلاڑی بن گئی، بلکہ یہ اعلان بھی کروا دیا کہ شادی اُس سے کرے گی جو اُسے شطرنج کی بساط پر مات دے گا۔ مصنف نے یہ بات بڑے سرسری انداز میں کہی تھی اور 'پھر کیا ہوا' پر روشنی ڈالے بغیر اور باتوں میں لگ گیا تھا۔ مگر مجھے یہ صورتحال اتنی دلچسپ اور عجیب و غریب لگی کہ میرے لیے اُس کا ساتھ دینا ممکن نہ رہا۔

پہلے تو مجھے یہ یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ ہر مصنف مبالغے سے کام لیتا ہے لیکن یہاں تو حد ہی ہو گئی تھی۔ پھر مجھے بچپن میں سنی اور پڑھی ہوئی کہانیوں کے حوالے سے یاد آیا کہ شہزادیاں اپنی شادی کے سلسلے میں عجیب و غریب شرائط رکھا کرتی تھیں۔ اِس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آتی تھی۔ انسان کا اعلیٰ ترین کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بادشاہ بن جائے، لیکن ایک بادشاہ زادی اِس 'کمال' کی اِس حد تک عادی ہو چکی ہوتی کہ اُسے 'کچھ اور' کی جستجو ہوتی۔ شہزادی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عورت بھی حسین ترین ہوتی، کیونکہ اُس کے باپ نے اپنے وقت کی حسین ترین عورت سے شادی کی ہوتی، اور وہ خود بھی ایک حسین ترین جوڑے کا فرزند ہوتا، کیونکہ۔۔۔ سو دنیا جہان کے شہزادے اُس سے شادی کے امیدوار ہو جاتے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک، یا یوں کہہ لیں کہ کوئی کسی سے کم نہیں۔ اب شہزادی کے لیے اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا محال ہو جاتا۔ لہٰذا اپنے مزاج، ماحول اور موقع محل کے مطابق جو بھی اُس کے من میں آ جاتا وہی اُن امیدواروں کے لیے اعلیٰ ترین کمال کا معیار ٹھہرتا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ 'چاند پر تھگلی لگانا' اور 'ہتھیلی پر سرسوں جمانا' قسم کے محاورے انہی شہزادیوں کی دین ہیں۔ چنانچہ مجھے یقین آ گیا، مگر اِس یقین کا آنا تھا کہ ایک محشرِ خیال برپا ہو گیا۔ شہزدی کے باپ یعنی بادشاہ کا کیا ردِعمل ہوا ہو گا؟ کیا شہزادے واقعی عقل کے، معاف کیجیے حُسن کے اتنے اندھے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، شطرنج سیکھنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے میں جُت گئے ہوں گے؟ پھر معاملہ شہزادوں تک محدود نہ رہا ہو گا۔ شطرنج کے کھلاڑیوں نے اِس اعلان کو کیسے سنا ہو گا۔ دشمن رشک سے مرے جاتے ہوں گے۔ کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں، مگر اِس طرح؟ شطرنج کھیلنے کے لیے عقل چاہیے، لیکن عقلمند لوگ شطرنج نہیں کھیلتے۔ اب عقلمند لوگ اپنی عقل کو کوستے ہوں گے۔

کیمیا گر بہ غصہ مردہ و رنج
ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

ہاں آخر کسی احمق نے تو یہ 'خزانہ' پایا ہو گا۔ احمق؟ اور نہیں تو کیا۔ اب یہ اُس کی خوش قسمتی کہ شہزادی اُس سے بھی بڑی احمق تھی۔

میں سوچتا گیا۔ میری سوچوں نے رگ و پے میں سرایت کرنا شروع کر دیا۔ جسم میں اک سنسنی سی دوڑنے لگی۔ دھوپ کی خوبصورتی اور خوشگوار تمازت نے پہلے ہی خمار کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ گہری تنہائی، وسیع خاموشی اور پرندوں کی آوازوں نے ماحول کو خوابناک بنایا ہوا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور جانے کتنی دیر کھویا رہا۔ چونکا اُس وقت جب مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر، جو اَب تک خالی پڑی تھی، کسی کے بیٹھے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے دیکھا، اُس پر ایک شخص بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں سمجھا کہ وہ چچا یا بھائی کا ملنے والا ہو گا جو غلطی سے میرے پاس بھیج دیا گیا تھا یا پھر اُن کے آنے تک اُسے صحن میں بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ چچا تو دفتر گئے ہوئے تھے اور بھائی کالج۔ گویا وہ میرے ہی پاس آیا تھا۔ اور اِس میں حیران ہونے کی کیا بات تھی۔ صبح سے شام تک جن بے شمار لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ سب کے سب پہلے سے آپ کے واقف ہوں۔ آپ اکثر کسی نہ کسی سے پہلی بار مل رہے ہوتے ہیں۔ مگر یوں نہیں ملتے۔ وہ تو ایسے آ کر بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بہت ہی گہرا دوست، جو علیک سلیک کی، اور بعض اوقات کچھ بھی کہنے کی، ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جیسے وہ کہیں باہر سے نہ آیا ہو بلکہ آپ ہی کے ساتھ رہ رہا ہو اور چند لمحے پہلے بھی آپ کے ساتھ ہی تھا۔

اجنبی کی آنکھیں مجھ سے ہم کلام تھیں اور اُس کے رویے سے گہری شناسائی بلکہ ربطِ قلبی ظاہر ہوتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے بات شروع کروں۔

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔'' بالآخر وہی بولا۔

''کیوں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ نے مجھے آزاد کرایا ہے۔''

''میں نے،؟ کب؟ کیسے؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی۔ میں اِس کتاب میں بند تھا۔''

''آپ کون ہیں؟''میں نے گویا سکتے کے عالم میں کہا۔

''میں وہی احمق ہوں جس سے شہزادی ہار گئی تھی۔''

''اچھا۔۔۔؟؟''میں نے کہا لیکن میرے منہ سے آواز نہ نکلی۔

''لیکن میں صرف شطرنج کا کھلاڑی نہیں تھا۔ میں شطرنج کو زندگی نہیں سمجھتا تھا بلکہ زندگی کو شطرنج کی بساط جانتا تھا۔ زندگی کی کتاب میرے نزدیک اصل کتاب ہے، حرارت اور گہما گہمی سے معمور۔ اگر کسی ادیب نے میرے بارے میں سوچا ہوتا تو اُس کی کتاب میرے لیے قید خانے کی بجائے ایک گھر ثابت ہوتی، جس میں مَیں آزادی سے رہتا۔ جب چاہتا لوگوں سے ملنے باہر آتا، لوگ مجھ سے ملنے میرے پاس آتے۔ لیکن شطرنج کی یہ کتاب میرے لیے ایک سرد خانہ تھی جہاں میں حروف اور ہندسوں کی برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ کتاب سینکڑوں لوگوں نے پڑھی ہے مگر کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑی۔ اور پڑتی بھی کیسے؟ اِس کے مصنف کی طرح اِس کے پڑھنے والوں کو بھی صرف شطرنج سے دلچسپی تھی۔ آپ نے مجھے پتہ نہیں کیسے دیکھ لیا، یا آپ جانے یہ کتاب کیوں پڑھ رہے تھے۔''

''میں اَدب کا طالب علم بھی ہوں اور شطرنج کا شیدائی بھی۔''

''اچھا۔'' وہ ایسے خوش ہوتے ہوئے بولا، گویا میں اُس کا شیدائی تھا۔''میں نے آپ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا لیکن مجھے گمان بھی نہ تھا کہ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں، مگر آپ کی توجہ واقعی مجھ پر مرکوز تھی۔ پھر آپ کو احساس ہوا کہ میں ایک غلط جگہ پڑا ہوں۔ آپ مجھے دیکھتے گئے، میرے بارے میں سوچتے گئے۔ آپ کی نگاہ اور آپ کے خیال کی گرمی سے میرے اِردگرد کی برف پگھلنا شروع ہوگئی۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے جسم میں زندگی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں کھڑا ہوسکتا ہوں۔ میں واقعی کھڑا ہوگیا۔ میں نے اپنے پاؤں ہلائے، میں چل سکتا تھا۔ میں چل پڑا۔ کسی دیوار، کسی دربان نے مجھے نہ روکا۔ میں کتاب سے باہر آ گیا۔ مصنف کی نیت مجھے قید کرنے کی نہ تھی۔ ایسا تو اُس سے سہواً ہو گیا تھا۔''

میں نے اپنی انگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی۔''آپ خواب نہیں دیکھ رہے۔ میں کوئی بھوت پریت نہیں۔ آپ جیسا ایک انسان ہوں اور میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے اُس میں ذرّہ برابر جھوٹ نہیں۔'' اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں سچ مچ جاگ رہا تھا، بلکہ میں اتنا بیدار تو کبھی بھی نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ اُسے چھو کر اُس کے ہونے کی مزید تصدیق کروں لیکن میں باز رہا، اِس خدشے کے تحت کہ کہیں وہ واقعی میرا واہمہ ہی نہ ہو اور میرے چھونے پر غائب ہو جائے۔ میرے ذہن میں جو بے شمار سوالات اُمنڈ رہے تھے اُن کے جواب پھر کون دیتا؟

''لیکن آپ تو بہت پرانے زمانے کے باسی ہیں جبکہ یہ مصنف جس نے بقول آپ کے آپ کو قید کیا تھا، اِس زمانے کا آدمی ہے۔ ابھی زندہ ہے۔''

میں نے کہا۔

''وقت کبھی نہیں مرتا۔ یہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے، انسانوں کے سینوں میں، فطرت کے مظاہر میں، کتابوں میں، اپنی صحیح یا بگڑی ہوئی صورت میں۔ ہم نے حساب کتاب کی سہولت کے لیے اِسے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ آج ہم ایک بیج بوتے ہیں، وہ بظاہر مٹی میں غائب ہو جاتا ہے لیکن کل ایک پودے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور تن آور درخت بن جاتا ہے۔ اِسی طرح ہم حال میں جو کچھ کرتے ہیں وہ بظاہر ماضی میں گم ہو جاتا ہے لیکن مستقبل میں سامنے آتا ہے اور پھر ماضی میں چلا جاتا ہے۔ اِس طرح ماضی بار بار نمودار ہوتا رہتا ہے، البتہ ہر بار نئی صورت میں، اِسی لیے ہمیں یہ گمان گذرتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔۔۔ گویا ماضی میں جو کچھ ہے وہ مستقبل میں ظاہر ہوگا اور جو کچھ مستقبل میں ہوگا وہ ماضی میں موجود ہے۔ ازل سے ابد تک زمانہ ایک ہی ہے۔ ہم اِس کی مختلف صورتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے اِسے مختلف ادوار میں بانٹ دیتے ہیں۔ گویا سب انسان ہم عصر ہیں۔ ایک زمانے کے لوگ دوسرے زمانے کے لوگوں سے ہم کلام ہوتے ہیں، اُن کو خوشیاں دیتے ہیں، غم بھی دے سکتے ہیں؛ اُن کی راہنمائی کرتے ہیں، بھٹکا بھی دیتے ہیں۔ مگر آپ توجہ نہیں دے رہے میری بات پر۔ آپ کا دھیان کہیں اور ہے۔''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔ البتہ میرے دھیان میں اپنے مرحوم والد کی کچھ باتیں اور شعر آ رہے تھے۔''

''آپ کے والد شاعر تھے؟''

''جی ہاں، ناصر کاظمی اُن کا نام ہے۔ وہ شطرنج کے ایک اعلیٰ کھلاڑی بھی تھے۔ یہ انہوں نے مجھے سکھائی تھی۔''

''اچھا۔'' اُس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔''کون سے شعر ہیں جو آپ کو یاد آئے اِس وقت؟ شاعری مجھے بھی بہت پسند ہے۔''

''اُن کی نظم 'ارضِ وطن' کا آخری بند۔ اتفاق سے یہ اُن کی زندگی کے آخری سال میں لکھی گئی تھی۔ اِس میں ارضِ وطن سے خطاب کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں:

میں تیرے لیے پھر آؤں گا
ہر عہد میں تیری نسلوں کو
خوشیوں کے گیت سناؤں گا''

''واہ، خوب۔ میں یہی تو کہہ رہا ہوں۔ کمال ہے، عجیب اتفاق ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ یہ مصرعے فلسفۂ آواگون کے زیرِ اثر لکھے گئے ہیں۔ یعنی ایک آدمی کئی کئی جنم لیتا ہے۔''میں نے کہا۔

''نہیں نہیں۔'' اُس نے کہا۔''جنم ایک ہی ہوتا ہے۔ وہی آدمی بار بار سامنے آتا ہے۔ خوب، کچھ اور کلام سناؤ اُن کا۔''

مجھے پاپا کی شاعری اتنی پسند ہے کہ میں اُن کے سارے کلام کا حافظ ہوں۔ لہٰذا مجھے جب بھی اُن کے شعر سنانے کے لیے کہا جاتا ہے، میری سمجھ میں

نہیں آتا کہ کیا سناؤں، کہاں سے سناؤں۔ مگر اُس وقت مجھے اُس نووارد کے حسبِ حال کچھ شعر یاد آرہے تھے۔ میں رواں ہوگیا:

''خوشبوؤں کی اُداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں''

وہ اچھل پڑا، پھر ساکن ہوگیا اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ ''وہ واقعی ایک اُداس شہزادی تھی۔'' اور پھر میری طرف فرمائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی!
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصرؔ
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی!
نہ چھیڑ اے خلشِ درد بار بار مجھے
چھپائے بیٹھا ہوں سینے میں ایک عمر کے راز

لیکن جناب میں تو آپ کو تنگ کروں گا۔ آپ کو اپنے راز بتانے ہوں گے۔ آپ مجھے انکار نہیں کرسکتے۔ میں بقول آپ کے آپ کا محسن ہوں۔''

وہ سوچ میں گم ہوگیا۔ غالباً اپنے خیالات کو ترتیب دے رہا تھا۔

''بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں''

مگر وہ بدستور کھویا رہا۔

''کچھ کہہ کے خموش ہو گئے ہم
قصہ تھا دراز کھو گئے ہم!

اچھا یہ بتائیں۔'' میں نے کہا۔ ''ماضی کے لوگ جس طرح حال کے لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہ تو سمجھ میں آتا ہے۔ اُن کی باتیں، اُن کی عادتیں، اُن کے طور اطوار، رسم و رواج، کتابوں کے ذریعے یا سینہ بہ سینہ یا لہو کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتے آتے ہیں۔ مگر حال کے لوگ ماضی کے لوگوں پر کس طرح اثر انداز ہوسکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جس طرح اِس کتاب کے مصنف اور آپ مجھ پر ہوئے۔'' اُس نے مسکرا کر کہا۔

''یہ جو کچھ ہوا، یعنی جو کچھ آپ نے بتایا ہے کہ ہوا، میری سمجھ سے باہر ہے۔ اِسی کی تو میں وضاحت چاہ رہا ہوں۔''

''آدمی کا ایک وجود وہ ہوتا ہے جو اُس کے جسم کا پابند ہوتا ہے اور ایک وجود وہ جو اُس کے جسم سے ماورا ہوتا ہے۔ یہ دوسرا وجود لوگوں کے ذہنوں میں ہوتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ ہوا میں ہوتا ہے اور کسی بھی وقت کسی کے ذہن میں آسکتا ہے اور پھر اُس کی زبان یا قلم کے ذریعے دوسروں کے ذہنوں میں منتقل ہوجاتا ہے۔ یہی دوسرا وجود میرے خیال میں آدمی کا اصل وجود ہوتا ہے جو کبھی مرتا نہیں، کبھی بے جان نہیں ہوتا۔ یہی وجود دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے ۔۔۔ نہ صرف اپنے ہم عصروں پر بلکہ بعد میں آنے والی نسلوں پر بھی۔ اور یہی وجود، چونکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے، لہٰذا آنے والی نسلیں بھی اِس پر اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ مثلاً، ماضی کی کسی شخصیت یا کردار کے کسی عمل، اُس کی کسی بات یا اُس کے بارے میں کسی بات کو، جسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا رہا ہو، حال کی کسی شخصیت یا کردار کے کسی عمل یا بات کی وجہ سے یا کسی واقعے یا حادثے کے باعث، ایک دم بہت اہمیت حاصل ہوسکتی ہے۔ اِسی طرح ماضی کی کسی شخصیت یا کردار کے جس عمل، جس بات کو بہت عظیم الشان سمجھا جاتا ہو، حال کے لوگ اُسے یکسر غلط یا انتہائی غیر اہم قرار دے سکتے ہیں۔ اِس طرح ماضی کی شخصیتیں بالکل بدل کے رہ جاتی ہیں، بہتر ہوجاتی ہیں یا بدتر، زیادہ اہم ہوجاتی ہیں یا کم اہم، نام آور بن جاتی ہیں یا گمنام ہوجاتی ہیں۔ اور ۔۔۔ پابند ہوجاتی ہیں ۔۔۔ یا ۔۔۔ آزاد!'' وہ مسکرایا۔

میں پوری طرح قائل نہیں ہوا، کیونکہ بات ہی پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن میں لاجواب ضرور ہوگیا۔ میرے لیے اُس کے وجود کو تسلیم کرتے ہی بنی اور میں نے بحث کے انداز کو چھوڑتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھانا چاہا۔ مگر اتنے میں مجھے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع ملی۔ مہمان میرے پاس صحن ہی میں بھیج دیا گیا۔ میں اُٹھ کر اُس سے ملا۔ علیک سلیک کے بعد اُسے اپنی کرسی پر بیٹھنے کو کہا ۔۔۔ دوسری کرسی پر تو اجنبی بیٹھا تھا ۔۔۔ مگر یہ کیا؟ وہ تو وہاں نہیں تھا۔ اُس کی کرسی خالی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میرا مہمان کتنی دیر رُکا، اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے کیا باتیں کیں۔

دن ڈھلا رات پھر آگئی، منزلوں خامشی چھا گئی۔ دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا۔ سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو۔ عجیب مانوس اجنبی تھا۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ۔ مجھے تو حیران کر گیا وہ۔ بس ایک موتی سی چھب دِکھا کر، بس ایک میٹھی سی دُھن سنا کر، مرے تو دل میں اُتر گیا وہ۔ وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں۔

میں جانے کب سویا، کب اُٹھا۔ آنکھ کھلی تو ایسا لگا جیسے کئی برس سونے کے بعد جاگا ہوں۔ ہر چیز عجیب عجیب، نامانوس سی دکھائی دے رہی تھی۔ اِرد گرد جو لوگ تھے تصویروں یا ہیولوں کی مانند لگ رہے تھے، جو کسی بھی وقت غائب ہو سکتے تھے۔ مجھے سکول میں پڑھی ہوئی رِپ وین وِنکل کی کہانی یاد آنے لگی۔ رِپ وین وِنکل کو گھر سے کچھ دور کسی نے کچھ کھلا دیا، اور وہ سو گیا تیس برس کے لیے۔ جاگا تو ظاہر ہے کہ ۔۔۔ ''بال چاندی ہوگئے، سونا ہوئے رخسار بھی'' اپنی بستی میں آیا تو اُسے کس نے پہچاننا تھا؟ اُس کی اپنی بچی، اپنی بچی کو گود میں اٹھائے پاس سے گذر گئی۔ اُس نے اُسے روک کر بتایا، لوگوں کو بتایا کہ وہ کون ہے مگر کون مانتا؟ اُسے کسی نے قبول نہ کیا۔ ع اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا۔ مگر مجھے تو آئینے سمیت سب نے پہچان لیا۔ سب کچھ وہی تھا، میں بھی وہی تھا۔ ہاں ۔۔۔ تو پھر وہ اجنبی رِپ وین وِنکل تھا۔ اُس کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ تو میرا وہم تھا۔ خواب تھا یا خیال تھا۔ اِسی طرح کی سوچوں میں گم، اپنے معمولات سے گزرتا ہوا،

میں بالآخر صحن میں پہنچ گیا۔ کتاب پھر نہیں پڑھی جارہی تھی۔ 'نشاطِ خواب' کا یہ مصرع ذہن میں گھومنے لگا۔۔۔ ''ہر لفظ ایک شخص ہے ہر مصرع آدمی'' پھر وہ ہوا جس کی مجھے توقع نہ تھی۔ اجنبی پھر آموجود ہوا۔ مجھے ہکا بکا اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ ''تمہیں یقین نہیں آیا نا کہ میں ہوں؟ لو مجھے ہاتھ لگا کر دیکھو۔'' اُس نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اُسے چھونے سے احتراز کرتے ہوئے جھوٹ بولا۔ ''میں تو کل سے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' یہ بات سچ تھی۔ ''ویسے مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ تم دوبارہ بھی آؤ گے، اگرچہ تم سے کرنے کی بیسیوں باتیں ذہن میں ابھرتی رہیں۔ ہماری ملاقات بہت ادھوری رہ گئی تھی۔'' وہ منتظر نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ''سب سے پہلے یہ بتاؤ۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم چلے کہاں گئے تھے؟''

''میں نے کہاں جانا تھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرا وجود زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے۔ میرے بارے میں اپنے پیمانوں سے نہ سوچو۔''

''میری سمجھ میں تمہاری بات آدھی آتی ہے، آدھی نہیں۔ اوہ معاف کریں میں آپ کو تم تم کہے جارہا ہوں۔ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔''

''پھر وہی بات۔ بھئی میں کبھی تمہاری عمر کا تھا اور تم بھی کبھی میری عمر کے ہوجاؤ گے، حساب برابر۔۔۔''

''یوں تو آدمی بزرگوں کا احترام بھی نہ کرے کہ وہ کبھی اُس جتنے تھے اور کبھی وہ اُن جتنا ہوجائے گا۔''

''میں تمہارے بزرگوں کی نہیں، اپنے جیسوں کی بات کر رہا تھا، جو وقت کی قید سے بلند ہوچکے ہوں، جو سب کے ہم عصر، ہم عمر بن چکے ہوں۔''

''اچھا بابا، 'تم' ہی سہی۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری بات آدھی سمجھ میں آتی ہے، آدھی نہیں۔ اور کچھ باتیں جو میں اپنے خیال میں سمجھ گیا تھا، بعد میں گڈمڈ ہوتی رہیں۔ مثلاً پہلی ہی بات کہ تم لفظوں میں قید تھے۔ یعنی کوئی شخص دو جملے لکھ کر کسی کو بھی قید کرسکتا ہے؟''

''بالکل۔ قید تو ایک طرف، ایک جملے سے آپ کسی کو ہلاک کرسکتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''میرا مطلب ہے۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ اگر کوئی ادیب تمہارے بارے میں لکھتا تو اُس کی کتاب تمہارے لیے ایک آزاد گھر ہوتی۔ اب اِس کے ساتھ ساتھ اِس شطرنج کی کتاب کا مصنف بھی وہی کچھ کرتا جو اُس نے کیا تو پھر کیا ہوتا؟ تم آزاد ہوتے یا قید؟''

''اُس کتاب میں آزاد اور اِس کتاب میں قید۔۔۔ بیک وقت۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آدمی کا دوسرا وجود اُس کا اصل وجود ہوتا ہے، جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے، جو ہر وقت کئی جگہ موجود ہوسکتا ہے۔۔۔ اچھا اگر یہ دوسرا وجود تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو پہلے، یعنی جسمانی اور ٹھوس، وجود ہی کو دیکھ لو۔ تمہارے ملنے والوں میں سے کسی دو افراد کی تمہارے بارے میں ایک رائے نہیں ہوگی۔۔۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا تم جتنے لوگوں سے ملے، تمہارے اُتنے ہی وجود ہوئے، الگ الگ، ایک دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات بالکل اُلٹ۔ پھر سوچو، بعض جگہیں ایسی ہوں گی جہاں تم ہمیشہ خود کو آزاد محسوس کرتے ہوگے اور کئی جگہیں ایسی جہاں تمہارا ہمیشہ دم گھٹتا ہوگا۔''

''لیکن میں ایک وقت میں تو ایک جگہ ہی ہوں گا۔ آزاد یا قید۔''

''درست، مگر وہ جگہیں تو بیک وقت اپنی اپنی جگہ موجود رہیں گی اور ہمارے ساتھ اُن کا اپنا اپنا تعلق بھی۔''

''اِس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اگرچہ اِس وقت اِس کتاب سے آزاد ہو چکے ہو مگر چونکہ یہ کتاب اِسی طرح موجود ہے اور رہے گی۔۔۔ ہزاروں جگہ۔۔۔ تم اِس میں قید بھی ہو۔'' میں نے ہار نہ ماننے کی آخری کوشش کی۔

''بجا فرمایا۔ میں تمہارے لیے آزاد ہوں اور ہمیشہ رہوں گا اور جو شخص بھی تمہاری طرح اِس کتاب کو پڑھے گا، اُس کے لیے بھی میں آزاد ہوجاؤں گا۔ لیکن جو اِسے صرف شطرنج کی کتاب سمجھ کر پڑھے گا، جیسا کہ لوگ اب تک کرتے آئے ہیں، اُسے تو میں نظر ہی نہیں آؤں گا۔''

یہاں سے خاموشی کے ایک طویل وقفے کا آغاز ہوا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ کبھی سب کچھ روشن ہوجاتا، کبھی مکمل تاریکی؛ کبھی تاریکی میں ہزاروں ستارے سے جگمگانے لگتے، کبھی اُجالے میں سائے سے لہرانے لگتے۔ یہ باتیں میرے لیے اتنی نئی اور عجیب تھیں کہ جب بہت دیر بعد میں اپنے آپ میں واپس آیا تو میری زبان پر وہی جملہ تھا۔ ''تمہاری باتیں میری سمجھ میں آدھی آتی ہیں، آدھی نہیں۔'' وہ مسکراتا رہا۔ خاموشی کے ایک اور وقفے کے بعد میں پھر اپنے سوالوں کی طرف آیا۔

''تم نے کہا تھا کہ تم شہزادی سے جیت گئے تھے۔ پھر تو تم شہزادے بن گئے ہوگے اور شاید بعد میں بادشاہ بھی۔''

''میں نے یہ کب کہا تھا کہ مجھ سے شہزادی کی شادی بھی ہوگئی تھی۔''

''اوہ!'' میرے منہ سے نکلا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ کہیں شہزادی کو جیت لینے کے بعد شہزادی کے کسی دوسرے امیدوار نے یا بادشاہ نے ہی اِسے قتل تو نہیں کروا دیا تھا؟ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری عمر ستائیس، اٹھائیس برس سے زیادہ نہیں لگتی۔ کیا تم نے اتنی ہی عمر پائی تھی؟''

''نہیں، میں نے بہت لمبی عمر پائی تھی۔ تمہارے سامنے اِس عمر میں اِس لیے ہوں کہ تمہارے ذہن میں میری زندگی کا یہی دور آیا تھا۔ اگر تم میرے بچپن یا بڑھاپے کے بارے میں سوچتے تو میں اُن صورتوں میں تمہارے سامنے آتا جو میری اپنے بچپن یا بڑھاپے میں تھیں۔'' اجنبی مجھے انکشافات کے صدمے

پہنچائے جارہا تھا۔

''تو جب تم نے شہزادی کی شرط پوری کر دی تھی تو اُس نے تم سے شادی کیوں نہیں کی؟''

''میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ شہزادی نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔''

''پھر تمہاری شادی کیوں نہ ہو سکی؟ کیا شہزادی کے کسی امیدوار نے یا بادشاہ نے تمہیں ڈرایا دھمکایا تھا؟''

''نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔''

''اوہ! کیا شہزادی کو کچھ ہو گیا تھا؟'' اب کے مجھے خیال آیا کہ شہزادی کو بھی تو قتل کیا جا سکتا تھا یا ممکن ہے وہ کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو گئی ہو۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''پھر تم ہی بتا دو کہ کیا ہوا تھا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''جب تمہیں یقین ہی نہیں آئے گا تو بتانے سے فائدہ؟''

''مجھے کیوں یقین نہیں آئے گا؟''

''کسی کو بھی نہیں آیا تھا۔ اوّل تو میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا، کیونکہ اِس کی ضرورت نہ تھی، لیکن جن چند دوستوں کو بتایا۔۔۔ کیونکہ اُنہیں بتانا پڑ گیا تھا۔۔۔ اُن میں سے بھی ایک کے سوا کسی نے یقین نہیں کیا۔''

''میں انسان اور زندگی کے امکانات کے لامحدود ہونے پر ایمان رکھتا ہوں۔ دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی۔''

''یہ بات ہے تو سنو۔ شہزادی سے شادی میں نے نہیں کی تھی۔''

''کیا؟ کیوں؟ کیا وہ بدصورت تھی؟ کیا اُس میں کوئی بڑا نقص تھا؟''

''نہیں۔ اُس جیسی حسین عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اور عیب شاید اُس میں ہوں لیکن مجھے نظر نہیں آئے۔ بس ایک خرابی تھی اُس میں، اُس کا بادشاہ زادی ہونا اور اِسی بناء پر میں نے اُس کے ساتھ شادی کرنے سے معذرت چاہی تھی۔''

''شہزادی ہونا۔۔۔ خرابی؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ تو کسی عورت کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے والدین خواب دیکھتے رہتے ہیں کہ کسی دن اُن کا بیٹا کسی شہزادی کو بیاہ کر لائے یا اُن کی بیٹی کے لیے کسی شہزادے کا پیغام آئے۔''

''تم نے اُس بادشاہ کی کہانی نہیں سنی جس نے تمام عمر کی جستجو کے بعد آبِ حیات حاصل کیا، لیکن پھر پینے کا ارادہ ترک کر دیا؟ ہماری بیشتر خواہشات، جو بہت مسحور کن ہوتی ہیں، جب پوری ہو جاتی ہیں یا پوری ہونے لگتی ہیں تو اُن کی حقیقت کھلتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نتائج وہ نہیں نکلے جو ہمارے خیال میں نکلنے چاہئیں تھے، وہ خوشی نہیں ملی جس کی ہمیں آس رہی تھی، وہ سکون حاصل نہیں ہوا جس کے لیے اتنا بے قرار رہے۔ اب اگر ہم نے اپنے تخیل کی نشوونما کر رکھی ہے اور ہمیں اِس سے کام لینا آتا ہے تو ہم بہت سی خواہشوں، بہت سے کاموں کے انجام سے، بہت پہلے واقف ہو سکتے ہیں۔ شادی کے معاملے میں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جس قسم کی شادی ہم کر رہے ہیں، اس کے نتیجے میں فریقین کی زندگی کیسی ہوتی چلی جائے گی۔ ہماری شخصیتیں مائل بہ ارتقاء ہوں گی یا رُو بہ تنزل۔ جو خوشی فوری طور پر حاصل ہو گی وہ برقرار رہے گی؟ جو سکون ملے گا وہ بڑھتا چلا جائے گا یا کم ہوتے ہوتے پریشانی میں بدل جائے گا؟''

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے خیال میں کس طرح شہزادی سے شادی اُس کی آزادی چھین لیتی اور اُس کی شخصیت کا گلا گھونٹ دیتی۔ میں نے تاریخ میں کئی بادشاہوں اور شہزادوں کے بارے میں پڑھا تھا جنہوں نے کسی مصلحت کے تحت یا کسی عورت کے لیے یا کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے تخت سے دستبردار ہونا بخوشی قبول کیا اور باقی عمر اپنے فیصلے پر پشیمان نہ ہوئے، مگر ایک عام آدمی بادشاہ بن رہا ہو اور نہ بنے، یہ بات آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اترنے والی نہ تھی۔

بہرحال میری اُس اجنبی سے دوستی ہو گئی۔ اُس سے ملاقاتوں کا درمیانی وقفہ کم سے کم ہوتا گیا۔ اور یہ ملاقاتیں تنہائی تک محدود نہ رہیں۔ وہ بھری محفل میں بھی آ جاتا اور ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے۔ مگر اُسے میرے سوا کوئی نہ دیکھ سکتا۔۔۔ ظاہر ہے، وہ صرف میرے لیے آزاد تھا۔ ہم گلیوں میں پھرتے، باغوں کی سیر کرتے، دوسرے شہروں کے سفر میں بھی وہ میرے ہمراہ ہوتا۔ اگرچہ ہم میں کچھ باتیں مشترک تھیں لیکن ہمارے تعلق کی اصل بنیاد اختلافِ رائے تھی۔ ہماری گفتگو بہت جلد بحث کا روپ اختیار کر لیتی۔ زیادہ تر مجھے ہی قائل ہونا پڑتا۔ اُس کا تجربہ بے حد وسیع، مشاہدہ نہایت گہرا اور علم بہت ٹھوس اور اپنے مطالعے سے کہیں زیادہ تھا۔ اُس کے ساتھ بحثوں میں مجھے اتنا لطف آنے لگا کہ اکثر اُس کی بات سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی اُس سے بحث برائے بحث کرتا، پورے جوش و خروش اور اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ۔ مقصد یہ ہوتا کہ زیرِ نظر موضوع کے ہر پہلو کو دیکھا جائے۔ یہ باتیں میں اپنے دوستوں سے بھی کرتا اور اُن کی باتیں اجنبی سے کرتا۔ تب اُسے اپنے دوست اور اُن کی باتیں یاد آ جاتیں اور وہ اُن کے ساتھ کی گئی بحثوں کا احوال سناتا۔ یوں اُس کے دوستوں میں میری دلچسپی پیدا ہو گئی اور یہ دلچسپی بڑھتے بڑھتے اِس حد تک پہنچ گئی کہ میں نے اُس سے فرمائش کرنا شروع کر دی کہ وہ مجھے اُن سے ملوائے۔ پہلے پہل تو وہ ٹالتا رہا لیکن پھر ایک دن میرے بہت اصرار کرنے پر بولا۔ ''تم بھی کیا یاد کرو گے، چلو آج تمہیں اپنے شہر، اپنے زمانے میں لیے چلتا ہوں۔ البتہ وہاں تم صرف دیکھ سکو گے، سُن سکو گے اور اپنے دیگر حواس کا استعمال کر سکو گے مگر نہ تو تم کسی سے بات کر سکو گے نہ اپنی کسی حرکت سے کسی عمل میں خلل ڈال سکو گے۔۔۔ ذرّہ برابر بھی۔۔۔ کیونکہ وہاں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے، اب اُس میں کوئی اضافہ یا ترمیم ممکن نہیں۔ صرف اُس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن تم مجھے وہاں لے کر کیسے جاؤ گے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بہت آسان طریقہ ہے۔ تم آنکھیں بند کرنا اور جب میرے کہنے

پر انہیں کھولو گے تو اپنے آپ کو وہاں پاؤ گے۔''

''اور واپس کیسے آؤں گا؟''

''اسی طرح آنکھیں بند کر کے واپسی کا ارادہ کرنا۔۔۔اور بس۔۔۔''

چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا۔ جیسے اِک خواب خواب میں دیکھا۔

وہ شہر کیسا تھا، یہ بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے کتابوں میں پرانے زمانے کے شہروں اور لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ ظاہر کی دنیا آج کی دنیا سے بے حد مختلف تھی۔۔۔ظاہر ہے۔ البتہ انسان کا باطن وہی تھا جو ہم آج دیکھتے ہیں۔۔۔وہی جذبات، وہی خواہشیں، وہی آرزوئیں، وہی خواب، وہی چیزوں کے حصول کی تمنا، وہی دوسروں کو مغلوب کرنے یا پیچھے چھوڑ جانے کی کوشش۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ میں وہاں کی باتیں یہاں کے لوگوں سے کرنے لگتا اور یہاں کی باتیں وہاں یاد آتیں۔

کچھ عرصے بعد میں اُس شہر میں جانے کے لیے اجنبی کا محتاج نہ رہا اور وہاں پہنچنے پر اُس کی ہمراہی کے بغیر بھی آزادانہ گھوم پھر سکتا تھا۔۔۔غریب کی تنگ و تاریک کٹیا سے لے کر بادشاہ کے وسیع و عریض، جگا جوت روشن محل تک۔ میں جیسے جیسے وہاں کے لوگوں کے بارے میں جانتا گیا ویسے ویسے میرا تجسّس بڑھتا گیا۔۔۔کم ہونے کی بجائے۔ پھر میں اپنے شہر میں کم رہنے لگا اور اُس شہر میں زیادہ، یا شاید دونوں شہروں کی درمیانی حدیں مٹ گئی تھیں۔ میرا شہر وہ شہر بن گیا تھا اور وہ شہر، میرا شہر۔ میرے احباب کو تشویش ہونے لگی کہ میں کہاں رہنے لگا تھا اور پھر یہ شکایت بھی کہ میں بیٹھے بیٹھے، آدابِ مجلس کے خلاف، اچانک بغیر اجازت کہاں غائب ہو جاتا تھا۔

وہاں کے لوگوں کی باتیں یہاں کے لوگوں کی باتوں سے اتنی ملتی جلتی اور اِن کے اِتنی حسبِ حال ہوتیں کہ مجھے من و عن یاد رہ جاتیں۔ اور میں اُنہیں اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کر لیتا۔ میں اُن کی بحثیں اور تقریریں پہروں سنتا۔ کبھی کوئی مجھے اپنا ہم خیال نظر آتا، کبھی کوئی؛ کبھی کوئی مجھے قائل کرتا دکھائی دیتا، کبھی کوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا ساتھ دوں، کسے صحیح قرار دوں۔ اگر میں کسی نتیجے تک پہنچ بھی جاتا، کوئی حتمی رائے قائم بھی کر لیتا تو بھی اُس کا اظہار ممکن نہ تھا۔ وہ نہ تو مجھے دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے۔ اُن کے لیے میرا کوئی وجود نہیں تھا۔ اور تو اور، اجنبی، جو یہاں مجھ سے گھنٹوں مغز کھپائی کرتا تھا، وہاں آنکھ تک نہیں ملاتا تھا، ہم کلام ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

سو میرے پاس گفتگوؤں یا یوں کہہ لیں کہ مکالموں کا ایک ذخیرہ ہو گیا۔ اِس کے علاوہ چند مناظر اور واقعات کا بیان بھی۔ ہاں یہ مکالمے اور واقعات کسی تاریخ وار ترتیب میں نہیں تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میرے سامنے جو گفتگو یا واقعہ ہو رہا ہوتا، اُس کے بعد کی گفتگو یا واقعہ میں پہلے سے دیکھ چکا ہوتا۔ ایک بات اور۔ یہ تمام گفتگوئیں اور واقعات اجنبی کے شہزادی سے شطرنج کھیلنے اور شادی سے معذرت کرنے سے پہلے کے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اِس کے بعد کے زمانے میں جا سکوں مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر تنگ آ کر ایک دن میں نے اُسی سے اِس کا سبب پوچھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم ابھی تک دل سے قائل نہیں ہوئے کہ شہزادی سے شادی نہیں بھی کی جا سکتی۔ جس روز تمہیں سو فیصد یقین آ جائے گا کہ ایسا ہو سکتا ہے، تم آگے چل سکو گے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واقعی کبھی کبھی شک کی ایک لہر سی اِس واقعے پر چھا جاتی ہے اور پھر مجھے اِس سے آگے دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن مجھے ویسا یقین کب آئے گا جیسا تم کہہ رہے ہو؟''

''جب تم انسان اور زندگی کے امکانات کو اُس طرح سمجھنے لگو گے جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں یہ کہہ کر کہ میں نے بادشاہت کو ٹھکرا دیا تھا، بادشاہوں سے اپنی محکومی اور محرومی کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں توہین کرنے کو، انتقام لینے یا سزا دینے کا گھٹیا ترین طریقہ سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بادشاہت کو، خواہ وہ نام کی بادشاہت ہو، اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں سے نہ صرف رعایا کے لیے بلکہ خود بادشاہ اور شاہی خاندان کے لیے بھی سخت مضر سمجھتا ہوں۔ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی خوشحال، ترقی یافتہ، پُرسکون اور شاندار کیوں نہ ہو، اگر وہاں بادشاہت آ جائے تو اُس کی مثال اُس ہرے بھرے تن آور درخت کی سی ہو گی جسے دیمک لگ جائے۔۔۔یا کوئی ایسا خوش باش اور صحت مند شخص جسے معلوم نہ ہو کہ وہ ایک انتہائی مہلک مرض کا شکار ہو چکا ہے۔''

''بادشاہت کے بارے میں تمہارے خیالات یہ ہیں اور کھیل تمہیں وہ پسند ہے جس میں سب کچھ بادشاہ کے گرد گھومتا ہے۔ شاطر کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ کو بچایا جائے، چاہے سارے مہرے قربان کر دینے پڑیں۔ اور جب بادشاہ کے لیے بساط پر کوئی گھر نہیں بچتا تو بازی ختم ہو جاتی ہے، بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔'' میں نے اپنی طرف سے اُسے لاجواب کر دیا تھا مگر وہ ایسے خوش ہو گیا جیسے میں نے اُسی کی بات کی حمایت میں کوئی فیصلہ کن دلیل سُجھا دی تھی۔

''یوں بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ شاطر کی تمام تر کوششیں بادشاہ کو بے گھر کرنے اور بساط سے اٹھا دینے میں صرف ہوتی ہیں___ بڑی سے بڑی قربانیاں دے کر بھی۔ اُس کا اپنا بادشاہ جسے ہر قیمت پر بچانا ہوتا ہے محض ایک علامت، ایک استعارہ ہوتا ہے، اُس کی شخصیت کا، اُس کے اعلیٰ ترین مقاصد کا، اُس پورے نظام کا جس پر اُس کے معاشرے کی زندگی کا دارو مدار ہوتا ہے۔''

اُس نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ میں حسبِ سابق چپ ہو گیا۔

جب کوئی چیز لکھی جاتی ہے تو اُس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ لکھنے والے سے آزاد، اپنا ایک الگ وجود حاصل کرے۔ اور اِس کے لیے اُسے کسی ہیئت کی ضرورت، چنانچہ تلاش ہوتی ہے۔ اب میرے پاس جو تحریری مواد اِکٹھا ہو چکا تھا اُس کے لیے ڈرامے کی ہیئت میں سمانا سہل تھا۔۔۔شاید، سو وہ ڈرامے ہی کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ ممکن ہے کوئی ناول نگار اِس مواد سے ناول لکھتا اور اگر ہیئت کا

تعین میرے اختیار میں ہوتا تو میں ایک شعر گو ہونے کے سبب کوئی طویل نظم یا مثنوی لکھنے کی کوشش کرتا لیکن بزرگوں نے بتا رکھا تھا کہ خیال اپنے لیے ہیئت کا انتخاب خود کرتا ہے اور اگر اُس پر کوئی ہیئت مسلط کر دی جائے تو دونوں بغاوت کرتے ہیں اور مصنف کے لیے نہ صرف خود عذاب بن جاتے ہیں بلکہ قارئین کے ذریعے بھی احتجاج کرواتے رہتے ہیں۔ قارئین اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں کبھی کوئی ڈرامہ بھی لکھوں گا۔ مگر میرا قلم میرے سامنے ایک ڈرامے کی عمارت بناتا چلا جا رہا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ میری مرضی کے خلاف ہو رہا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب کچھ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ میں شعوری طور پر ڈرامہ لکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ البتہ جو ڈرامہ نگار میں نے پڑھ رکھے تھے وہ ضرور اپنا کام کر رہے ہوں گے۔

آخر ایک روز میں نے اجنبی کو ڈرامے کے بارے میں بتایا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تو گویا تم مجھے پھر سے کتاب میں بند کرنا چاہتے ہو۔ شاید مجھ سے تنگ آ گئے ہو۔''

''نہیں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو تمہارے لیے ویسا گھر بنانا چاہتا ہوں جس کا تم نے ایک بار ذکر کیا تھا، جس میں تم اپنی مرضی سے آ جا سکو، جس میں دوسرے بھی تم سے ملنے کے لیے آ سکیں۔''

''اِس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ میرے لیے ایک گھر ہی ثابت ہوگا، قید خانہ نہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ضمانت تو کوئی نہیں، کوشش ہے میری اور اگر وہ قید خانہ بھی ثابت ہوا تو بھی اُس میں تمہارا صرف ایک ہی وجود قید ہوگا۔ تمہارے ہزاروں وجود پھر بھی آزاد رہیں گے اور ممکن ہے کسی دن کوئی تمہیں اِس سے بھی آزاد کرا لے، جیسے میں نے تمہیں اُس شطرنج کی کتاب سے آزاد کرایا تھا۔''

''ہوں۔'' اُس نے مسکرا کر آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔ ''تو میری باتیں تمہاری سمجھ میں آنے لگیں۔''

''ہاں۔ میں تمہیں سمجھنے لگا ہوں۔ تمہاری کہانی بھی صحیح معنوں میں اب کھلی ہے مجھ پر اور مجھے اس کا یقین بھی آ گیا ہے۔ سو فیصد یقین، وہ یقین جس کے لیے میں بے قرار تھا۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہوا؟''

''یہی ڈرامہ لکھنے کے دوران۔ یہ تحریر بھی عجیب چیز ہے، بلکہ گفتگو بھی۔ بعض اوقات ہم جو بات اپنے خیال میں بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں، لکھنے بیٹھیں یا کسی کو بتانے لگیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مبہم اور غیر واضح چیز کوئی نہیں اور بعض دفعہ کوئی موضوع، شخص یا واقعہ جس کا دھندلا سا تصور ہمارے پاس ہوتا ہے، گفتگو کے دوران میں یا لکھتے وقت ہم پر وا ہو جاتا ہے، یک دم روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔''

''آج تو تم میری طرح بات کر رہے ہو۔'' اُس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

''شاید، لیکن اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ دوست ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے، تمہاری بدولت بہت کچھ سمجھ میں آیا ہے اور میں نے بھی تمہیں متاثر کیا ہوگا۔ تم نے بھی میری وجہ سے کچھ سیکھا ہوگا، سمجھا ہوگا۔''

رفتہ رفتہ ڈرامے کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ وہ ایک ایسے مکان کی طرح تھا جس کے مکین اُس کے مکمل ہونے سے بہت پہلے اُس میں آ بسیں اور بیشتر تعمیر اپنی موجودگی میں کرائیں۔ جی ہاں، انہوں نے جو کہا اپنی مرضی سے کہا، جو کیا خود کیا۔ میں نے کسی کے منہ سے اپنے مطلب کی بات کہلوانے کی کوشش نہیں کی، نہ ہی کسی سے کوئی ایسی حرکت سرزد کرائی جو میرے خیال میں اُسے کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہ بھی نہیں کیا کہ کسی عمل پر کوئی ایسا نتیجہ مسلط کر دوں جو اُس عمل کا ہو ہی نہیں سکتا۔ سو اس ڈرامے میں تمام باتیں وہی تھیں جو میں نے سنیں اور تمام واقعات وہی تھے جو میں نے دیکھے۔ البتہ میں نے اُن میں سے انتخاب ضرور کیا تھا اور اُن میں ایک قائل کر دینے والا رشتہ تلاش کر کے انہیں ایک خاص ترتیب بھی میں نے ہی دی۔ بس مصنفوں والا یہی کام تھا جو میں نے کیا۔

یہ ڈرامہ اجنبی اور اُس کے ساتھیوں کے لیے ایک گھر ثابت ہوتا ہے یا قید خانہ میں نہیں کچھ کہہ سکتا۔ پہلے جو شک اُس کی کہانی کے بارے میں تھا اب اُس کے گھر کے بارے میں ہے۔ دراصل مجھے اِس نوع کی تعمیر کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں نے ایسے گھر بنے ہوئے تو کئی دیکھے ہیں، بنایا پہلی بار ہے۔

تخلیق کے تیور

بساط میں تخلیق کے تیور مجھے ایسن اور شا کی یاد دلاتے ہیں۔ وہی کرداروں کے مکالموں میں نفسیاتی تجزیے، گفتگو میں لاشعور سے رجوع رکھ کر نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانا، شعور، لاشعور، قبل شعور اور تحت الشعور کے سمندر کو بلو بلو کر گہرائی سے موتی اور سطح سے دور کی کوڑی لانے والی بات کو تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کی زبان میں بیان کرنا۔ باہر صحیح معنوں میں تخلیق کا آدمی ہے۔ وہ شعر کہے یا نثر لکھے، اپنی شخصیت کے بطون میں اترتا ہے، ڈوبتا ہے، غوطہ لگاتا ہے اور دُرِ شہوار نکال کر لاتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

مِری بستی کے مقابل

ڈاکٹر مختارالدین احمد

(●)

میرا عقیدہ ہے کہ غزل اچھے غزل گو کے ہاتھ میں شاعری کی اعلیٰ ترین صنف بن جاتی ہے۔ اگرچہ باصر کے ساتھ یہ مشکل تھی کہ ان کو اُس اعلیٰ معیار پر پورا اترنا تھا جو پہلے سے طے ہو چکا تھا، میں بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجِ خیال میں وہ اُس بلندی تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے بظاہر سیدھے سادھے مکالماتی انداز کے شعر تغزل سے خالی نہیں ہیں:

اب تجھے کھو کے خیال آتا ہے
تجھ کو پایا تھا بہت کچھ کھو کر

یہ اور بات کہ وہ مہرباں نہیں ہم پر
وگرنہ حُسن میں اُس کے کوئی کلام نہیں

ہر چند میرے حال سے وہ بے خبر نہیں
لیکن وہ بے کلی جو اِدھر ہے اُدھر نہیں

اٹھتی رہیں گی درد کی ٹیسیں تمام عمر
ہیں زخم تیرے ہاتھ کے بھر بھی گئے تو کیا

اعلیٰ ترین شاعری کی تمام خوبیاں ان اشعار میں موجود ہیں۔ نازک خیالی، سادہ بیانی، زبان پر قدرت، کیا ہے جو اِن میں موجود نہیں ہے۔ تغزل اور مضمون آفرینی اس پر مستزاد ہے اور اسلوب کا نیا پن بھی۔ یہ باصر کی شعری جمالیات کی درخشاں مثال ہیں۔ غزل کے چند اور شعر جن میں شگفتگی اور مزاح کی ہلکی سی چاشنی بھی موجود ہے:

ہم بہت خوش تھے کہ جاگ اُٹھی ہے اپنی قسمت
آنے والا کسی ہمسائے کا مہماں نکلا

ہو گیا دل کے مکاں میں اِک حسیں آ کر مکیں
فکر یہ ہے اب کرائیں اس کو خالی کس طرح

ہم ہیں کہ بس سمیٹتے رہتے ہیں چاندنی
کچھ لوگ جا بسے ہیں دلِ ماہتاب میں

اِس شعر پر پچاس کی دہائی کی ایک گم شدہ غزل، جو میں نے روس کے اسپٹنک یعنی خلائی سیارے کی پرواز کے زمانے میں لکھی تھی، یاد آنے لگی۔ اس کا صرف ایک شعر ذہن میں رہ گیا ہے، سن لیجیے:

میں کہ آوارہ مسافر ہوں مہ و انجم کا
ہے کوئی ماہ جبیں دل میں بسا لے مجھ کو

جملہ ءمعترضہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر باصر کی طرف چلتے ہیں۔ ان کا شعر ہے:

یہ کہیں اور کام آئیں گے
آنسوؤں کو سنبھال کر رکھو

سبحان اللہ! آنسوؤں کو دولت بلکہ کرنسی بنا دیا ہے۔ ایک اور شعر ہے:

کوئی پیماں نہیں باندھا تھا لیکن
تری باتوں میں خوشبو تھی وفا کی

کیا اچھا شعر ہے۔ میں جب بھی باصر کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو اپنے ماضی میں گُم ہو جاتا ہوں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

باصر کا شعر ہے:

بجا کہ نظریں ہی ٹھہری ہیں اب زباں لیکن
وہ سامنے ہی نہ آئیں تو کیا کریں آنکھیں

یہ بھی سخن فہموں سے داد کا طالب ہے۔ جوشِ جذبات میں زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ دل کے معاملات بعض اوقات آنکھیں بہتر طریقے میں بیان کر سکتی ہیں لیکن، وہ سامنے ہی نہ آئیں تو کیا کریں آنکھیں، غضب کا مصرع ہے جو اپنے اندر محاکات کی ایک دنیا رکھتا ہے۔

اکثر رہی ہے میرے تخیل کی سیر گاہ
وہ سرزمین جس کے تلے آسمان ہے

اپنے تمام معنوی محاسن اور جمالیات کے ساتھ اس شعر میں ایک طبیعی حقیقت کا اظہار بھی موجود ہے کیونکہ ہماری زمین ایک کرہ کی شکل میں ہے اس لیے جو آسمان ہم کو اوپر نظر آتا ہے وہ نیچے بھی ہوتا ہے۔ یہ چند اشعار میں نے اِس لیے نقل کیے ہیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ صنائع اور بدائع لفظی صورت میں موجود نہ ہونے کے باوجود یہ معنوی صنائع بدائع سے بھرپور ہیں۔ شاعری کا کمال یہ ہے کہ جو لفظ شعر میں آ جائے وہ اپنی جگہ اپنے معنی سے زیادہ معنی دینے لگے نہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ میں کم سے کم بات کہی جائے۔ قصیدے یا نظم میں اکثر یہی صورتِ حال ہوتی ہے لیکن غزل کا مزاج یہ فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتا۔ جو کوئی کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر سکے غزل اُسی سے دوستی کرتی ہے اور مجھ کو تو یہی نظر آتا ہے کہ غزل نے باصر سے پکی دوستی کی ہوئی ہے۔

باصر نے اپنی شاعری کی دوسری کتاب کو، جو خوشبوئے سخن سے دماغوں کو معطّر کرتی ہے، چمن کوئی بھی ہو کا نام دیا ہے۔ پہلا شعر ہے:

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

باصر کا یہ شعر انگریزی ترجمے کے ساتھ سلاؤ کے میکنزی سکوائر میں ایک پتھر پر کندہ کر کے نصب کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ دس اور زبانوں کے اشعار بھی کندہ کیے گئے ہیں۔ یہ نہایت قابلِ فخر اعزاز ہے جو باصر کو ان کی شعر گوئی پر ملا ہے۔ ہم سب کے لیے بھی وجہِ افتخار اور نہایت مسرّت کا باعث ہے۔ باصر کا شعر ایک آفاقی حقیقت ہے جو ہماری نئی نسلوں کے دل کی آواز ہے۔ بقول نظیر اکبر آبادی:

مسکن کا پتہ خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو
جس جا پہ کہ بس گر رہے وہ ہے وطن اپنا

یعنی جو شخص جہاں بس گیا وہی اُس کا وطن شمار کرنا چاہیے۔ اب اگر کوئی ہم سے کہے کہ تم جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے جاؤ تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ ہمارے بچے تو واقعی اِس پر ہنستے ہیں کیونکہ وہ تو پیدا ہی یہیں ہوئے ہیں اور ان کو یہیں پھلنا پھولنا ہے۔ سچ پوچھیے تو پالیسی کی حد تک حکومتِ وقت کا بھی یہی نظریہ ہے لیکن اِس پر عمل پیرا ہونے میں مشکلیں پیش آ رہی ہیں جو یقیناً وقت کے ساتھ آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ اب باصر کا ایک اور شعر سنیے:

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

جانشینی کی سہولت اپنی جگہ صحیح لیکن یہاں ہماری آنے والی نسلوں کو اپنی جگہ بنانے کے لیے بہت محنت اور جدوجہد کرنی پڑے گی۔ بس ایک بات ایسی ہے جس سے ہماری اولادیں محفوظ و مامون ہیں، وہ ہے دردِ ہجر و فراق جس میں سب اولین تارکینِ وطن مبتلا ہیں۔ یہ دردِ ہجرت اُس وقت اور شدت اختیار کر لیتا ہے جب قدم قدم پر ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں کہ:

یہاں نہ جینے کا وہ لُطف ہے نہ مرنے کا
کہا تھا کِس نے کہ آ کر رہو پرائی جگہ

پھر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ ملک صرف سفید فام لوگوں کے لیے ہے، تم جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ، تو خیال آتا ہے:

نہیں کچھ فرق اب رہیے جہاں بھی
یہاں بھی دل جلے گا اور وہاں بھی

اب افسوس کے عالم میں یہ خیال آتا ہے:

کرتے نہ ہم جو اہلِ وطن اپنا گھر خراب
ہوتے نہ یوں ہمارے جواں دربدر خراب

لیکن ہماری بے گھری کی صرف یہی ایک وجہ تو نہیں تھی۔ اس میں ہماری مہم جوئی کا شوق اور پروبازو کی آزمائش کا تقاضا بھی تو شامل تھا۔

اک دن بھی آشیاں میں نہ گزرا سکون سے
کرتے رہے ہیں مجھ کو مرے بال و پر خراب

گویا بال و پر نے خراب کیا تو ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر یہاں اُتر پڑے اور اب عالمِ غربت میں یہ کہتے ہیں:

ہم کہ جو ہر ابر کو ابرِ کرم سمجھا کیے
آ گئے اِس دیس میں اور دھوپ کو ترسا کیے

احساسِ ملامت کبھی کبھی تو اِس قدر بڑھ جاتا ہے کہ خود اپنے آپ کو الزام دینے لگتے ہیں:

اے دل مجھے پتہ ہے کہ لایا ہے تو کہاں
چل خود بھی اب خراب ہو مجھ کو بھی کر خراب

پھر اپنا محاسبہ کیا جائے تو یہ خیال آتا ہے کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ کیا نقصان ہی نقصان ہے یا فائدے کی بھی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ لیکن اِس شش و پنج میں باصر نے ایک ایسا شعر کہہ دیا ہے کہ کاش میں نے کہا ہوتا:

یہ شہر تمہارا مِری بستی کے مقابل
اچھا ہے مگر صِرف عمارات کی حد تک

اِس شعر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ادبِ عالیہ کے کسی بھی شہ پارے میں ہونی چاہئیں۔ ایک اور غزل کا شعر ہے جو اِسی زمرے میں آتا ہے:

کچھ نہیں جن کے پاس اُن کے پاس
خواہشوں کا خزانہ ہوتا ہے

ایک اور شعر ہے:

لگتا ہے تیرے ساتھ ملی زندگی ہمیں
گویا کہ اس سے پہلے جیے ہم جیے بغیر

خیال اور بندش دونوں لاجواب ہیں۔ جیے ہم جیے بغیر کی ترکیب معنی کا سمندر ہے۔ چند شعر اور ملاحظہ کیجیے:

معلوم ہے کہ وہ تو ملے گا نہیں کہیں
کھو جائیں گے تلاش میں اُس کی ہمیں کہیں

مقصود اِس سے اہلِ نظر کا ہے امتحاں
وہ سامنے نہیں ہے مگر ہے یہیں کہیں
شاید فلک ہی ٹوٹ پڑا تھا وگرنہ یوں
جاتا ہے چھوڑ کر کوئی اپنی زمیں کہیں

یہ چند نمونے باصر کی فکر اور ان کے فن کے مشتِ از خروارے ہیں۔ ایک سے ایک عمدہ شعر باصر نے لکھا ہے۔ کتاب میں ایک اچھا اور دلچسپ مضمون باصر کے پرانے دوست ساجد علی صاحب کا شامل ہے جو خود اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔

باصر سلطان کاظمی کے تیسرے مجموعۂ کلام ہوائے طرب کی ابتدا ایک نعتیہ نظم سے ہوتی ہے:

ارادہ حمد کہنے کا تھا
محمدؐ سے زیادہ خوبصورت نام کس کا ہے؟

گویا یہ نظم ہی موجۂ ہوائے طرب ہے۔ حمد، احمد، محمد میں صوری اور صوتی مماثلت شاعر کے ذہن میں یہ اچھوتا خیال پیدا کرتی ہے کہ محمد لکھ دیا ہم نے تو گویا حمد بھی کہہ دی۔ اِس کی تاویل اِس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے دلوں میں خدائے واحد کا جو تصور ہے وہ رسولِ اکرم ہی کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ کوئی اپنی طرف سے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلے گفتۂ رسول پر اضافہ ممکن نہیں ہے، یعنی ثنائے خدا بغیر ثنائے رسول کے نہیں کی جاسکتی۔ پروفیسر خورشید رضوی نے لندن میں ایک خصوصی تقریب میں اس نظم کے ساتھ باصر کی چند اور نظموں، بالخصوص 'پڑھو گے لکھو گے'، 'قلم دوات'، 'ماں' اور 'نوعمری اور پیری' کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے باصر مستقبل میں زیادہ اپنی نظموں کے حوالے سے پہچانے جائیں۔ یہ ذرا بحث طلب بات ہے۔ ہم اِس طرف بعد میں آئیں گے۔

تقسیم سے پہلے چالیس کی دہائی میں، جبکہ سرزمینِ ہند پر قتل وغارت کی عملداری تھی اور ہر جگہ فرقہ وارانہ فسادات ہورہے تھے، جگر جیسے غزل گو شاعر نے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ ''شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل۔'' یہ اعلان ہماری روایتی غزل، روایتی عشق اور روایتی محبوب کے خلاف ایک ردِعمل تھا۔ اُس وقت تک غزل داغ اور امیر کے ایوانوں سے باہر نہیں نکلی تھی، نہ ہی وہ اُس وقت کے سیاسی، مذہبی اور اقتصادی حالات اور جذبات کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ لوگ غزل پر نظم کو ترجیح دینے لگے تھے۔ عشق کی جگہ رومان نے لے لی تھی، محبت کے اصول اور معیار تبدیل ہورہے تھے۔ بہ استثنائے چند اکثر شعرا پر جنسیت (sex) سوار تھی۔ 'جس پہ ڈالی بری نظر ڈالی' والا معاملہ ہورہا تھا، وضع داریاں بدل رہی تھیں، حُسن قابلِ دست اندازیٔ ہر بوالہوس تھا، بے وفائی باعثِ فخر ومباہات تھی۔ 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' یا 'میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے'، لوگ ان نظموں کو غزلوں کی طرح گاتے پھرتے تھے۔ لیکن غزل تھی بڑی سخت جان، اِس ہنگامے سے زندہ سلامت بچ کر نکلی تو تغزل کے لیے تعشق کی شرط ختم ہوچکی تھی۔ اس کی جگہ تفکر اور مشاہدے نے لے لی تھی۔ بازاری اور فرضی عشق بازی کی جگہ نئے نئے مضامین غزل میں داخل ہورہے تھے، گہرا مشاہدہ اور گہری فکر غزل کا مزاج بنتے جارہے تھے۔ یہ وہ رجحانات ہیں جو باصر کی غزل میں پوری آب وتاب سے موجود ہیں اور صرف یہی نہیں، باصر کے ہاں برجستگی، شوخی، شگفتگی اور ہلکا پھلکا مزاح بھی نمایاں طور پر سامنے آتا ہے جو ان کی غزل کو ایک نیا پن دیتا ہے۔ باصر اِس نئی طرزِ فکر کے شاعر ہیں جو محاکات کے مقابلے میں مکالمات اور واردات پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ اِس میں ان کے علم اور زبان پر مکمل گرفت کا بھی ہاتھ ہے اور حالاتِ حاضرہ کا بھی۔

مومن کی مشہور غزل، جس کے ایک شعر پر غالب اپنا دیوان بخشنے کو تیار تھے، میں یہ شعر بھی ہے:

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

یہ سہلِ ممتنع تو ہے ہی، دونوں مصرعوں میں محاورے بھی بندھے ہوئے ہیں۔ جو کچھ کہنا تھا اِس سے بہتر طور پر کہنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ شعر حسرت اور ناکامی کی تصویر ہے۔ معنی سے زیادہ دل پر کیفیت کا اثر ہوتا ہے۔ اب ذرا باصر کا شعر دیکھیے جس کو انہوں نے مومن کے شعر کے شانہ بشانہ کھڑا کردیا ہے:

ایک تجھ سے رہے ہمیشہ دور
ورنہ کیا کچھ نہیں ملا باہر

مومن کا شعر معاملہ بندی کا شاہکار ہے تو باصر کا شعر تجربے اور واردات کی تصویر ہے۔ تاثیر میں دونوں ہم پلہ ہیں اور پھیلاؤ میں بھی یکساں۔

جو لوگ ملک سے باہر رہتے ہیں ان کے ہاں وطنِ عزیز کا درد وغم اور زیادہ نظر آتا ہے۔ نیم جان بلیڈنگ پاکستان کے دردناک حالات کو اِس سے بہتر اور کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

کیا ہوا ہے مرے اندر کہ ہوا ہے جاری
میری آنکھوں سے مرے منہ سے مری ناک سے خون

یہ پیکر تراشی کی اعلیٰ مثال ہے۔ ایک مدقوق، قریب المرگ بیمار کی تصویر تو ہے ہی، زخمی پاکستان کی بھی۔ اب اِس شعر کو ذرا عاشق ومعشوق کے شکوے شکایت سے ہٹ کر دیکھیں، یعنی پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کے پس منظر میں:

درگذر کرنا جفاؤں کو تری میرے لیے
سہل ہوجائے جو تو دوست سے دشمن بن جائے

اِسی موضوع پر یہ شعر بھی ہیں:

کرتے رہے کر سکتے تھے ہم جتنی بھی کوشش
دیوارِ تعصب میں کہاں ہونی تھی جنبش

مزاج اپنا غلامی سے یہ بنا ہے کہ ہم
قفس میں ہوتے ہیں آزاد گلستاں میں اسیر

یہ شعر پڑھیے اور لطف لیجیے:

اپنی شہرت بڑھانے کی خاطر
اُس نے ہم کو بھی کر دیا مشہور

پچھلے دنوں باصر نے کچھ نئے موضوعات پر بڑی دلچسپ غزلیں لکھی ہیں جو مقامی اور عالمی مشاعروں میں بہت کامیاب رہی ہیں، مثلاً:

کر لیا دن میں کام آٹھ سے پانچ
اب چلے دورِ جام آٹھ سے پانچ

پھر آج کام سے تاخیر ہوگئی باصرؔ
کسی نے ہم سے کہا بار بار ایک منٹ

قضا کو سونپ کے بستی کے انتظامی امور
جو منتظم تھے ہوئے انتظام سے فارغ

ہر چند رہ گذر تھی دشوار قافیے کی
سن کر نہ رہ سکے ہم للکار قافیے کی

کرنا ہے گر مجھے شکار لا کوئی جال مختلف
شاطر ہے تو اگر تو اب چل کوئی چال مختلف

بیٹھے رہیں گے وہ تو ہمیشہ دبا کے بات
ہم ہی کریں گے اُن سے کسی روز جا کے بات

ان اشعار کو تشریح وتبصرے کی کوئی ضرورت نہیں چنانچہ صرف نمونے کے طور پر یہاں لکھ دیے گئے ہیں۔

باصر کی نظموں والے حصے پر ناصر کاظمی کے شعر کا دوسرا مصرع صادق آتا ہے: سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے۔ یہ نظمیں اِدھر اُدھر کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ سب مختصر ہیں ورنہ ہمارے کچھ شاعر تو شیطان کی آنت میں الجھ جاتے ہیں۔ باصر کی نظمیں سیدھی سادھی آسان نظمیں ہیں جو امید ہے کہ پڑھنے والوں کو پسند آئیں گی۔ یہاں نمونے دینے سے گریز کر رہا ہوں۔ دو نثری نظموں کے علاوہ کچھ قطعات، چند پابند اور چند آزاد نظمیں ہیں جو حالاتِ حاضرہ کے کسی نہ کسی گوشے کو اجاگر کرتی ہیں اور اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن میرے نزدیک باصر نظم کے مقابلے میں غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی ان کی پہچان ہے اور رہے گی۔

چونسٹھ خانے چونسٹھ نظمیں کے بارے میں باصر نے اپنے قلم سے تمام توجیہات بیان کر دی ہیں، اِس حد تک کہ مجھ جیسا متشکک بھی نثری نظم کا قائل ہوتا جا رہا ہے۔ اردو ادب میں پچھلی صدی کی ابتدا ہی سے نثری نظم کا آغاز ہو چکا تھا جس کو اُس وقت ادبِ لطیف کے نام سے موسوم کیا گیا تھا لیکن یہ دعوی نہیں کیا گیا تھا کہ اس کو نظم کہا جائے۔ جب ٹیگور کی گیتا نجلی کا ترجمہ اردو میں ہوا تو وہ نثری نظم کی صورت میں ہمارے سامنے آیا۔ خلیل جبران کی کتاب اُس نے کہا کا ترجمہ بھی نظم اور نثر کے درمیان کی کوئی چیز معلوم ہوتا تھا بلکہ نثری نظم ہی تھا۔

جب باصر نے بساط لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا یہ باتیں اتنی پرانی نہیں تھیں جتنی کہ آج معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ایک بات جو یاد رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ ڈرامہ کلاسیکی زمانے سے منظوم ہی لکھا جاتا تھا، چاہے یونانی ڈرامہ ہو یا سنسکرت کا۔ اب بھی نثری ڈراموں کی زبان نظم کی زبان کے قریب ہوتی ہے، بلکہ ڈرامے اور sitcom میں یہی ایک فرق باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ جب باصر نے ڈرامے کی بساط بچھائی تو غیر شعوری طور پر نظمیت ان کی تحریر میں داخل ہو گئی اور کیوں نہ ہوتی کہ باصر بنیادی طور پر شاعر ہی ہیں۔

چونسٹھ نظموں میں کئی جگہ بھگوت گیتا اور ارتھ شاستر کی یاد آتی ہے۔ بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ بھی نثری نظم معلوم ہوتا ہے۔ گیتا سے یہ دور دراز کی مماثلت اِس لیے ہے کہ شطرنج کی بساط میدانِ جنگ ہی ہوتی ہے جہاں دو کھلاڑی مہروں سے اپنے بادشاہ کی حفاظت اور دشمن کے بادشاہ کی موت کے لیے جنگ لڑتے ہیں۔ کم و بیش یہی موضوع گیتا کا بھی ہے۔ مثلاً یہ نظم ارجن کے تذبذب کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے ورنہ تاج، ہما اور بادشاہت آج کے موضوع نہیں ہیں، سوائے شطرنج کی بساط پر:

کیا رکھا ہے تاج میں
سر درد کے سوا۔
میں جب بھی کھلے آسمان تلے ہوتا ہوں،
ڈرتا رہتا ہوں،
کہیں مجھ پر سے ہما نہ گزر جائے۔

گیتا کا پیغام یہ ہے کہ ہمیں اجتماعی فائدے کے لیے سماج کے ایک رکن کی طرح کام کرنا چاہیے۔ اِس میں اگر ذاتی مفاد کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو اس سے قطع نظر کر لینا چاہیے۔ گیتا راہِ عمل اور دھیان کی راہ کے درمیان ایک راستہ نکالتی ہے جو خیر الامور کا رستہ ہے۔ گیتا خود غرضی کے بغیر محنت اور استقلال سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتی ہے لیکن اِس کے ساتھ نفس کُشی کی روح کو بھی برقرار رکھتی ہے۔ یہ تعلیم، معلوم ہوتا ہے، شطرنج کے مہروں کے لیے وضع کی گئی ہے جہاں ہر مہرے کو ہر وقت بادشاہ کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ گیتا کے ساتھ ساتھ اِن نظموں سے کہیں کہیں ارتھ شاستر اور چانکیہ کی یاد بھی آتی ہے لیکن صرف شطرنج کے پس منظر کی وجہ سے۔۔۔ دشمن کے ساتھ وہی سلوک کرو جو وہ تم سے کرنا چاہتا ہے۔

ہمسائے کا مہمان

میں باصر کی بصیرت کے علاوہ موضوع پر اُس کی فنی گرفت کی بھی دل سے تحسین کرتا ہوں۔۔۔ اردو ڈرامہ ہمیشہ اردو ادیبوں کی بے حسی کا شکار رہا ہے۔ اِس عالم میں باصر سلطان کاظمی نے ایک باطنی ڈرامہ لکھ کر حیرت انگیز جراتِ رندانہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ شعر و ادب کی جملہ اصناف اِس طرح کی جراتِ رندانہ ہی سے جمود و تعطل سے محفوظ رہتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ باصر کی بساط سے جدید اردو ڈرامہ بھرپور انسپریشن لے گا۔

احمد ندیم قاسمی

کاروبارِ عشق

انتظار حسین

باصر کاظمی کے طور سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ نامور باپ کا بیٹا ہونا کچھ ایسا سہل نہیں ہے۔ اس میں بے شک کچھ سہولتیں بھی ہیں مگر بیٹا اگر سمجھدار ہے تو اسے مشکلات کا بھی ادراک ہونا چاہیے:

اِس کاروبارِ عشق میں ایسی ہے کیا کشش
پہلے پدر خراب ہوا پھر پسر خراب

فخر اِس حد تک تو بجا ہے مگر فخر کے ساتھ یہ بھی پتا ہونا چاہیے:

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

دُور اندیش بیٹے تو یہ کرتے ہیں کہ باپ والے رستے ہی سے کنی کاٹ جاتے ہیں، اپنا راستہ اس سے ہٹ کر نکالتے ہیں۔ باصر نے یہ دُور اندیشی نہیں دکھائی۔ شاعری میں قدم رکھا اور بیچ کھیت غزل کہنی شروع کر دی۔ ہاں ایک عقلمندی کی، باپ کے شہر کو چھوڑ دیا۔ اِس شہر کے بارے میں تو شاعر نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ:

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

دوسرے شاعروں کے ہاں بے شک شہر کی کوئی معنویت نہ ہو، ناصر کی شاعری میں تو ہے اور بہت ہے۔ اِس شہر کو چھوڑنے کا مطلب تھا، ناصر کے ہاں شعری تجربے کا جو رنگ تھا اُس سے ایک آبرومندانہ فاصلہ قائم کرنا۔ اِس نئے مجموعے کو دیکھ کر احساس ہوا کہ باصر کی نقل مکانی کا تجربہ ضائع نہیں گیا۔ اِس سے اُس کے شعری تجربے کا رنگ کچھ بدل گیا ہے۔ ویسے یہ کوئی لازم تو نہیں ہے کہ ایسی تبدیلی شاعری میں اعلانیہ نظر آئے۔ وہ تو شاعری کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ پھر احتیاط سے پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے۔ سو باصر کی یہ شکایت برحق ہے:

میری غزل میں کیسے تغزل ملے اُنہیں
پڑھتے ہیں اب وہ شاعری اخبار کی طرح

جس تبدیلی کا میں ذکر کر رہا تھا اس کے کچھ بدیہی اشارے اِس شاعری میں نظر آ جائیں گے۔ کتنے ایسے شعر ہیں جو چغلی کھاتے ہیں کہ شاعر اپنے دیار سے دور دیارِ غیر میں بیٹھا ایک مختلف آب و ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ نئی نعمتوں کے میسر آنے پر خوش ہے اور گمشدہ نعمتوں کے لیے ترس رہا ہے۔ ان گمشدہ نعمتوں میں سب سے بڑھ کر دھوپ کی نعمت ہے:

ہوتے ہیں عموماً یہ مری دھوپ کے دشمن
بادل مجھے خوش آتے ہیں برسات کی حد تک

ہم کہ جو ہر ابر کو ابرِ کرم سمجھا کیے
آ گئے اِس دیس میں اور دھوپ کو ترسا کیے

اور اب اِس تقابل میں چھوڑے ہوئے اپنے شہر کی قدر سمجھ میں آ رہی ہے:

یہ شہر تمہارا مری بستی کے مقابل
اچھا ہے مگر صرف عمارات کی حد تک

یا یہ کہ:

لاکھ آسائشیں پردیس مہیا کر دے
ہے غریب الوطنی پھر بھی غریب الوطنی

اور یہ جو باصر نے کہا ہے کہ

حالت جگہ بدلنے سے بدلی نہیں مری
ہوتی ہیں ہر جگہ کی کچھ اپنی خرابیاں

اِس سے مجھے خیال آ رہا ہے کہ یہاں سے جو خلقت نقل مکانی کر کے اللہ میاں کے پچھواڑے جا کر آباد ہوئی ہے اس کی حالت بدلی بھی ہے تو کس رنگ سے۔ ارے اپنی شاعری ہی کو لے لو۔ مشاعروں کی روایت دیارِ غیر میں جا کر اور زور پکڑ گئی مگر عجب ہوا کہ یہاں سے جو روایتی غزل دامن میں لے کر گئے تھے وہ وہاں جا کر مزید روایتی بن گئی اور جو یہاں سے دامن میں تھوڑی سی ملائیت گرہ میں باندھ کر لے گئے تھے وہ وہاں جا کر تہذیبی شناخت کے نام پر اور زور پکڑ گئی بلکہ بگڑ کر قیامت بن گئی۔ سو بات صرف اتنی نہیں ہے کہ:

ہوتی ہیں ہر جگہ کی کچھ اپنی خرابیاں

بلکہ یوں ہے کہ:

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

اور کتنے ہمارے یہاں کے انگارے وہاں کی خرابیوں سے شہ پا کر آگ بن گئے۔ اور ہاں ایک بات اور۔ اُس دیار میں بیٹھ کر اپنے دیار کی طرف دیکھیں تو دیکھنے کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ ہماری دھوپ چھاؤں اور دل بادل تو خیر ہوئے مگر ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اِس زمیں کو کیا سے کیا بنا دیا ہے تو یہ زاویہ ءنگاہ بھی اِس بدلے ہوئے شعری تجربے میں جھلکتا نظر آئے گا۔

آخیر میں ایک مختصر نظم:

شجر سے کٹ کے جو بے جان ہو گئی تھی شاخ
قلم بنی تو وہ دوبارہ ہو گئی زندہ
شبِ سیہ سے زیادہ سیہ سیاہی سے
تمام عالمِ تاریک ہو گیا روشن

بات جو دل میں ہے

ڈاکٹر سلیم خان
(ابوظہبی)

باصِر سلطان کاظمی اِس دور کے اُن معدودے چند قلمکاروں میں سے ایک ہیں جو مختلف اصنافِ سخن میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔ کلیاتِ باصِر 'شجر ہونے تک' میں ان کے تین ڈرامے اور ایک افسانہ شامل ہے۔ افسانہ 'مانوس اجنبی' یوں تو 'بساط' کا شانِ نزول ہے لیکن اسے بیان کرنے کے لیے اِس قدر انوکھا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایک افسانہ بن گیا۔ باصِر کاظمی کے موضوعات کا تنوع انہیں ممتاز و منفرد مقام پر فائز کرتا ہے اور اس کے سبب قاری تکرار کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے۔ 'شریکِ درد' کا محور ایک روایتی خاندان اور اس کے مسائل ہیں جبکہ 'نئی زندگی' ازدواجی معاشرت کی جدید الجھنوں سے بحث کرتا ہے۔ یہ دونوں ڈرامے زمانہء حال کے ترجمان ہیں، اس کے برعکس 'بساط' صدیوں پرانی تاریخ کے دریچہ میں بچھائی گئی ہے اور 'روبوٹ 420' اپنے قاری کو سو سال بعد کی میکانکی دنیا میں لے جاتا ہے۔

ان تمام ڈراموں میں متضاد کرداروں کی موجودگی مشترک ہے۔ 'شریکِ درد' میں بھائی راشد اور بہن جمیلہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ایک برسرِ روزگار تو دوسرا بے روزگار ہے۔ بہن انیلہ بہت خوبصورت ہے تو جمیلہ بس قبول صورت۔ ماں وحیدہ بیوہ ہو چکی ہے مگر جمیلہ ابھی کنواری ہے۔ وحیدہ موت کی دہلیز پر کھڑی سکون سے مرنا چاہتی ہے اور جمیلہ نئے انداز میں جینے کیلئے زندگی کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اس ڈرامے کے تانے بانے قنوطیت اور رجائیت کے سیاہ و سپید دھاگوں سے بُنے گئے ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

'نئی زندگی' کی کہانی ایک ایسے خاندان کے اردگرد گھومتی ہے جس میں خاوند شفیق اور زوجہ فہمیدہ کا مزاج ایک دوسرے سے متضاد ہے۔ ڈرامہ شروع سے آخر تک ایک تناؤ کے ماحول میں آگے بڑھتا ہے لیکن فہمیدہ بالآخر اپنی سمجھ بوجھ سے صورتِ حال کو یکسر بدل دیتی ہے۔ ڈرامے کا اختتام اس قدر خوشگوار فضا میں ہوتا ہے کہ قاری یک گونہ سکون و فرحت محسوس کرتا ہے۔ اِس ڈرامے میں عصرِ حاضر کے مرض بے اطمینانی کی تشخیص کرنے کے بعد اس کا موثر حل بھی سمجھایا گیا ہے۔ 'روبوٹ 420' دو ایسے خاندانوں کی کہانی ہے جن میں سے ایک پاکستانی اور دوسرا بنگلہ دیشی ہے۔ ان کی زبان و تہذیب کے علاوہ فکر و نظر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کے مرکزی کردار مرزا صاحب اور ان کی بیگم نادرہ کے مزاج بھی آپس میں میل نہیں کھاتے۔ بے حس روبوٹ میکانکی خادم ہونے کے باوجود ایک زندہ علامت ہے۔ جدید معاشرے میں بغیر سوچے سمجھے زندگی گذارنے والے بے حس انسانوں اور روبوٹ 420 کے طرزِ حیات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور دونوں کی تباہ کاریاں بھی یکساں ہیں۔

چوتھا ڈرامہ 'بساط' ایک حقیقی شاہکار ہے۔ اس کی ضخامت بقیہ تین ڈراموں کے کل صفحات سے تین گنا زیادہ ہے۔ اول الذکر معاشرتی کھیلوں سے مختلف یہ سیاسی نفسیات کی کہانی ہے۔ اس کے مرکزی کرداروں کا تعلق دو مختلف طبقات سے ہے۔ ایک شاہی محل میں پلنے والی شہزادی شذرہ ہے تو دوسرا گلی محلے میں رہنے والا فقیر منش سارب۔ جہاں شذرہ کی سوچ اہلِ دربار سے یکسر مختلف ہے تو وہیں سارب اپنے دوستوں اور اہلِ خانہ سے منفرد فکر و نظر کا حامل ہے۔ یہ کہانی جہاں محلوں اور بستیوں کے نشیب و فراز بیان کرتی ہے وہیں ان دونوں مقامات پر بسنے والے کرداروں کے قلب و ذہن کے خیالات و جذبات سے بھی روشناس کراتی ہے۔ اس کہانی کا سب سے اہم کردار شطرنج ہے جو زندگی کی علامت ہے۔ یہی شطرنج کا کھیل سارب اور شذرہ کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

انسانی معاشرے کے ظاہر و باطن کو اجاگر کرنے والا یہ کھیل کبھی افراد کی نفسیاتی گتھیاں سلجھاتا ہے تو کبھی نظامِ سیاست کے جبر و استبداد کو بے نقاب کرتا ہے۔ علم و حکمت کے گہرے سمندر سے خوب صورت لعل و گہر نکالنا اور انہیں عام فہم مثالوں کی مدد سے تراش کر نہایت خوش اسلوبی سے اپنی بساط پر سجا دینا باصِر کاظمی کا امتیاز ہے۔ باصِر کاظمی کی اس خوبی کا اعتراف تمام ہی مبصرین نے کیا ہے۔ اِس ڈرامے کو بلا مبالغہ منظوم ڈرامہ کہا جا سکتا ہے۔ باصِر نے 'بساط' کے اندر سے 64 اقتباسات کو علیحدہ کر کے نثری نظموں کے طور پر بھی پیش کیا ہے۔ چونکہ شطرنج کی بازی میں 64 خانے ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے 64 پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس ڈرامے کے اندر سے باصِر بھی باآسانی میر کی طرح 72 نشتر برآمد کر سکتے تھے۔ یہی مکالمے اس ڈرامے کا مغز ہیں۔ مطالعہ کے دوران وہ قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں اور خاتمے کے بعد قلب و ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے جبکہ ڈرامہ کھیلنے کی خاطر ضبطِ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ بغیر سٹیج اور زندہ کرداروں کے ڈرامے کا تصور محال ہے۔ آج کل ڈرامہ کے نام پر جو شے ٹیلیویژن یا یوٹیوب پر دیکھی جا سکتی ہے وہ دراصل ڈرامہ کا عکسِ مجازی ہے۔ مردہ تصاویر کبھی بھی زندہ کرداروں کا نعم البدل نہیں بن سکتیں۔ ڈرامے کی تازگی اور برجستگی برقرار رکھنے کے لیے اس کا زندہ ہونا ناگزیر ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈرامے سے مستفید ہونے کے لیے ناظرین کا ایک خاص وقت میں کسی خاص مقام پر موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو لوگ اس موقع سے محروم رہ جاتے ہیں وہ ٹی وی یا کمپیوٹر کے پردے پر اسے دیکھ کر یا پھر صفحہء قرطاس پہ پڑھ کر اپنے آپ کو کسی درجہ مطمئن کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود ڈرامے کو لکھنے کے اپنے فائدے ہیں۔ قرطاس و قلم کے توسط سے ڈرامہ دور دراز علاقوں میں موجود ان لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جو بعد کے زمانوں میں بھی اسے کھیل سکتے ہیں۔ 'بساط' کا شمار یقیناً اُن ڈراموں

میں ہوتا ہے جو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انگریزی ترجمہ تو خیر ہو چکا ہے لیکن دیگر یورپی اور جنوبی امریکہ میں بولی جانے والی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں مثلاً بنگلہ، مراٹھی اور گجراتی میں بھی ڈرامے مقبولِ عام ہیں اور ان میں سے ہر زبان کے قارئین کی تعداد یورپین ممالک کی آبادی سے کم نہیں ہے۔ اس طرح 'بساط' کی رسائی ان شائقین تک ہو جائیگی جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اِس ڈرامے کو اُس وقت تک کھیلیں گے جب تک سٹیج کی دنیا شاد آباد رہے گی۔ باصر کاظمی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے 'بساط' لکھ کر ڈراموں کی دنیا میں آبِ حیات نوش فرمالیا ہے۔

'بساط' بچھانے کی ترغیب دینے والے مانوس اجنبی سے باصر کاظمی کی ملاقات کو 40 برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ 'بساط' کی اولین اشاعت بھی 28 سال پرانی ہو چکی ہے، اس لیے اردو ڈرامہ کے شایقین بجا طور پر ان سے ایک نئی بازی کی توقع اِس شعر کے ساتھ کرتے ہیں کہ:

رہا تو کر انہیں پھر دیکھ معجزے باصرؔ
جو قوتیں ہیں تری خاکِ ناتواں میں اسیر

بے مروّت ہی سہی

بہ حیثیتِ مجموعی ان کی غزل کسی نظریے کی نہیں بلکہ گہری نظر کی پیداوار ہے اور شاعری میں نظر بھی اُس وقت تک کام نہیں کرتی جب تک کہ اس میں نظریے کی طرح کی اصابت موجود نہ ہو کہ شاعری بغیر ایمان، بقول ایف آر لیوس faith ممکن نہیں۔ باصر کی غزل کا بنیادی موضوع انسان ہے اور انسانی رشتے جو اُس کے لیے سب سے اہم بھی ہیں اور محترم بھی۔ اِسی لیے اُس کی غزل ایک خصوصی علاقہ ہمارے عہد سے رکھتی ہے۔ ہمارا عہد جو وجودیاتی خلاء کا ایک کرب ناک منظر پیش کرتا ہے جہاں بقول شخصے رشتے نہیں اِن رشتوں کی نوعیت اہم ہوگئی ہے۔ باصر کی غزل ان رشتوں کی طرف مراجعت ہے۔ وہ اِس منظر نامے پر فلسفیانہ نظر نہیں ڈالتا بلکہ اپنی فکر کو فکرِ محسوس بنانے میں کوشاں ہے۔ اِسی لیے اُس کی شاعری احساس اور جذبے کی شاعری ہے، احساس، جو بقول عبدالماجد دریابادی، وجدان کی منزلِ اوّلیں کا نام ہے اور جو پیچیدہ، مرکّب اور مخلوط صورت اختیار کر لے تو جذبے کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ اُس کے ہاں یہ دونوں صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اُس کا مجموعی انداز صیغہء واحد متکلّم اور صیغہء واحد حاضر و غائب کے درمیان سے پھوٹنے والا کلچر ہے، دو پریمیوں کا مکالمہ جو وسیع ہو کر غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی کہانی بھی بنتا ہے۔ گویا محبت ہی یہاں سب سے توانا قدر ہے جس کا اظہار غزل کے اختصار اور ایجاز کے قطعی تقاضوں کی تکمیل کے لیے رمز و کنائے کی زبان میں ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں احساس اور جذبے کا ٹھہراؤ اور اُن کے اظہار کا سنبھلا ہوا انداز دیدنی ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری شدّتِ احساس اور شدّتِ جذبات کا تاثر نہیں دیتی۔ اِس توازن اور احتیاط نے اُن کے ہاں ایک لہجہ بھی پیدا کیا ہے جو اُن کے تہذیب اور تربیت یافتہ ذہن کا پتہ دیتا ہے، جس سے وہ خود بھی آگاہ ہیں۔ اِسی لیے اُنہوں نے کہا ہے کہ: اِتنے کڑوے دور میں شیریں مقالی کس طرح / پوچھ مت اپنی زباں ہم نے سنبھالی کس طرح۔ اُن کے یہاں حسّیت کی تازہ کاری اور تازہ کاری کی حسّیت کا راز بھی اِسی میں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ باصر اگر مصوّری کے ذوق کی تکمیل میں برابر لگے رہتے تو نہ جانے مصوّری کے کس دبستان کی نمائندگی کرتے لیکن اپنی غزل میں یقیناً وہ تاثریت Impressionism کے نمائندہ ہیں۔ اپنی ہر موجِ خیال کی نقش گری میں جیسے اُنہوں نے آبی رنگوں کا انتخاب کیا ہے بلکہ آب ہی سے کام لیتے ہوئے اُنہوں نے اپنی غزل کو رنگِ تاب دیا ہے:

کہانی آنسوؤں نے کچھ کہی تو
یہ ندی بعد مدّت کچھ بہی تو
کہا ہم نے کہ ہو تم بے مروّت
کہا ہم بے مروّت ہی سہی تو
تمہاری بات سے میں متفق ہوں
ابھی میں کہہ رہا تھا کچھ یہی تو
جہالت ہی سے بچ جاؤ تو جانیں
بہت مشکل ہے باصرؔ آگہی تو

غلام قادر آزاد

نجم شماری

صباحت عاصم واسطی
(یوکے)

قرار پاتے ہیں آخر ہم اپنی اپنی جگہ
زیادہ رہ نہیں سکتا کوئی کسی کی جگہ
بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

الحمداللہ باصر سلطان کاظمی نے اردو ادب کے منظرنامے پر اپنی جگہ بنا لی ہے۔ باصر اور میں تقریباً پندرہ برس سے ادب کے سفر میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے اس کو یہ جگہ حاصل کرنے کے لیے کن مراحل اور کیسے کیسے رستوں سے گزرنا پڑا ہے۔ زمین سخت، تقابل غلط اور بے سبب اور اُس پر یہ کہ قریبی نام نہاد رفقاء رستے کی دیوار بننے کے لیے تیار۔ ان تمام مشکلات میں سے اہم ترین معاملہ ادبی موروثیت کا تھا۔ باصر کو اپنے دیو قامت والد ناصر کاظمی کی شہرت اور عظمت کا پوری طرح پاس رکھنا تھا۔ اس نے اِس فرض کی ادائیگی میں اِس حد تک اپنے آپ کو صرف کیا کہ کچھ عرصے تک اپنی شخصیت کو قدرے پس منظر میں رکھا۔ اِس کا ایک اثر اُس کے اپنے سفر پر یہ پڑا کہ اُس کو اپنی ذاتی حیثیت میں سامنے آنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ باصر نے یہ تاخیر بصد شکر اور بے حد خوشی سے قبول کی۔ لیکن مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اُسے اِس بات کا پورا احساس رہا ہے کہ بالآخر اُس کو اپنی جگہ اپنے کام اور صلاحیت کی بنیاد پر حاصل کرنی ہے۔

باصر کی شخصیت کا حوالہ صرف شاعری ہی نہیں ہے۔ اُس کا ادبی سفر اِس لحاظ سے زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے کہ اُس نے اپنے لیے کئی رستوں کا انتخاب کیا ہے اور کم وبیش سبھی میں اپنی حیثیت کو ممتاز منوایا ہے۔ میرے نزدیک باصر کی ادبی شخصیت کے کم از کم چار رخ ہیں:

۱۔ شاعر
۲۔ فنّار
۳۔ اردو ادبی سفارت کار
۴۔ محقق اور تجزیہ نگار

میں چاہوں گا کہ اِن تمام پہلوؤں پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

شاعر باصر

اردو شاعری کی موجودہ صورتِ حال عجیب ہے۔ ایک سی اور ملی جلی آوازوں نے شاعری کی فضا کو قدرے Stale کر رکھا ہے۔ لہجے زیادہ تر ایک سے ہیں اور خیالات کا برتاؤ بھی۔ اُس پر ایک المیہ اردو شاعری کے ساتھ یہ بھی پیش آیا ہے کہ جو بھی ذرا سی Rhyming کرنا شروع کر دے اُسے شاعر کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ ٹی وی یا فلمی گیت کاروں سے لے کر اخبارات میں قطعات لکھنے والوں کو بھی شاعر مانا جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں شاعر کا درجہ بہت بلند ہے اور مشکل سے کسی کو Poet تسلیم کیا جاتا ہے۔ Incidental Rhymers کو مختلف القاب دے دیئے جاتے ہیں جیسا کہ limirick writers, Singer song writers یا lyricist۔ وقت آ گیا ہے کہ اردو میں بھی اس طرح کی تخصیص قائم کی جائے۔ ایک اور معاملہ جدید اردو شاعری میں خیال کی تازہ کاری کی کمی کا ہے۔ تمام تر جدت کا زور زبان و بیان کی تبدیلی کی طرف رہا ہے۔ اِن تمام عوامل کے پس منظر میں جب باصر سلطان کاظمی جیسا طباع شاعر جدت کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ بڑی ذہانت سے ایک نئے لہجے کی بنیاد ڈالتا ہے۔ زبان و بیان میں روایت کی پاسداری کرتے ہوئے وہ خیالات کو نہایت جدید حد پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اِس نہج کا نیا لہجہ تشکیل دینا آسان نہیں ہے اور وہ بھی ستائش اور قبولیت کی ایسی فضا میں جس میں ذرا سی بھی ندرتِ مزاج شاعر اور قاری کے درمیان خلیج پیدا کر دیتی ہے۔ ممکن ہے ایک سبب یہ ہو باصر کو تاخیر سے قبولِ عام ملنے کا۔ ویسے اس بابت اور تاویلات بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ باصر اور میں اپنے شاعرانہ سفر میں اِس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی فن کار کا تعلق بڑے ادبی خانوادے سے ہو تو اُس کو ایک آسانی اور دو مشکلات پیش آتی ہیں۔ آسانی یہ ہوتی ہے کہ ماحول بنا بنایا ملتا ہے، تعلقات اور تعلق داری پہلے سے موجود ہوتی ہے اور عہد کی قد آور شخصیات کے ساتھ محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے اور بزرگوں کی گفتگو اور خیالات سے فیض اٹھانے کا موقع گھر بیٹھے مل جاتا ہے۔ مزید یہ کہ فنی امور سیکھنے کے لیے جوتیاں نہیں چٹخانی پڑتیں اور زانوئے تلمذ گھر بیٹھے میسر آ جاتا ہے۔ مشکلات میں ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ حجاب اور رعب آڑے آتا ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ادبی حلقوں میں شروع شروع میں شناخت اپنی صلاحیت نہیں بلکہ آباء کی تعلق داری کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ بڑی مدت تک ایک بڑے فن کار کے صاحبزادے کی حیثیت میں پہچانا جاتا ہے۔ مقابلہ بلا جواز کیا جاتا ہے۔ الزام اِس مد میں لگتا ہے کہ آباء کی مسند اور قد و قامت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نام پیدا کیا جا رہا ہے۔ باصر کو اِن تمام معاملات سے گزرنا پڑا ہے اور اپنا آپ منوانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اُس نے بڑی ہوشیاری اور قدرے دلیری سے اپنا ایک جداگانہ طرزِ بیان وضع کیا اور مروجہ لہجوں سے اپنے آپ کو دور رکھا ہے۔ اُس کا لہجہ بالکل الگ ہے اور خیالات کا برتاؤ انوکھا ہے۔ قدیم روایت اور قدرے متروک لہجے کو جدید ترین خیال اور فکر سے نواز کر اُس نے ایک نئی بنا ڈالی ہے جس کی نظیر اردو غزل میں کم ہی ملتی ہے۔ باصر نے جن مضامین کو اشعار میں ڈھالا ہے کئی جدید ترین شاعر بھی غزل میں اُن پر قلم اٹھانے سے قاصر رہے ہیں۔ اُس پر طرہ یہ کہ جو زبان باصر نے اِن جدید تر مضامین کو دی ہے وہ روایت سے قریب ہے اور یوں بڑی مہارت سے اُس نے

قدرے غیر شاعرانہ خیالات کو اِس ملائمت سے غزل میں سمویا ہے کہ غزل کے قاری پر گراں نہیں گزرتے۔ غزل، 'کرلیا دن میں کام آٹھ سے پانچ' کے اشعار میں عہدِ حاضر کی مشینی زندگی کے حوالے سے اُن تمام پہلوؤں پر شعر کہے ہیں جو ہم سب کا آج کل کے کام کاج کا تجربہ ہے مگر دورِ جام، بالائے بام اور صحبتِ اہلِ ذوق جیسی روایت سے بندھی ہوئی ترکیبوں اور ایسے ہی شستہ لہجے کے دوسرے الفاظ نے غزل کے لطیف حسن کو مجروح ہونے سے صاف بچالیا ہے اور قدرے غیر شاعرانہ خیالات کو بڑی مشاقی سے شعری لبادے میں سمو دیا ہے۔ ایسی کئی مثالیں باصر کی غزل میں جگہ جگہ ملتی ہیں؛ مثلاً ایک اور غزل، 'ہزار کہتا رہا میں کہ یار ایک منٹ'، کے موضوعات جدید تر ہیں اور ردیف بھی مگر دیگر لفظیات اور بندشوں نے اِس کا اجتماعی تاثر غزل ہی کا مرتب کیا ہے۔ باصرؔ الفاظ کے چناؤ اور برتاؤ میں گرچہ عمومی طور پر محتاط ہے مگر خیالات کو نبھانے کی رو میں الفاظ کو برتنے میں مہم جوئی بھی کرنے سے ہچکچاتا نہیں ہے۔ مزید برآں اُس نے غزل میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اُن مضامین کو شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے شعر بند کیا ہو اور وہ ایسا کرنے کی غرض سے شعری تواضع میں اجنبی زبان بھی استعمال کرتے نہیں جھجکا۔ مثلاً:

کام سے بڑھ کر جن کو تھا جاہ و اکرام سے کام
اُن کے کام اگر دیکھیں تو ہیں بس عام سے کام
زاہد اِس سے قبل کہ جانا ہو داتا کے پاس
ہو توفیق تو کچھ کر لو سرگنگا رام سے کام
تھوڑی دیر کے ہیں باصرؔ ٹھنڈی چھاؤں میں ہم
پیڑ گنے وہ باغ ہے جس کا ہمیں تو آم سے کام

اک بار جو اتر گیا پٹڑی سے دوستو
دیکھا یہی کہ پھر وہ ہوا عمر بھر خراب

ہو کوئی بھی کاروبار دھندا
کہتے ہیں کہ آج کل ہے مندا
اب ہم ہی کریں گے صاف یہ شہر
ہم نے ہی اِسے کیا ہے گندا

ثابت کرو اپنے دعوے باصرؔ
شیخی تو جناب نے بھگاری

اپنی خوشی تمہاری خوشی میں ہے اِس لیے
کردی خوشی خوشی سے تمہاری خوشی کی نذر

محاورے کی زبان یعنی جاہ و اکرام اور عام سے کام کے ساتھ ساتھ سرگنگا رام اور آم کے قوافی کا استعمال شعری نزاکت مانگتا ہے اور مندرجہ بالا اشعار باصر کی شاعرانہ مہارت پر سند کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہیں ذہن و دل مرے تیار کچھ بھی سننے کو
اگر مرض ہے مرا لاعلاج مجھ کو بتا

حیران کن تھی چپ بھی تمہاری مرے لیے
بولے ہو اب تو بات بھی تم نے عجیب کی

سامانِ عیش دیکھ کے بزمِ نشاط میں
رہتی ہے یاد کس کو نصیحت طبیب کی

باصر کی ردیفیں بھی جداگانہ ہیں، مثلاً 'خراب'، 'خرابیاں'، 'بات'، 'نذر'، مصروف'، 'آٹھ سے پانچ'، 'ایک منٹ'، اور 'مختلف'۔ میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں کہ جو شاعر 'خراب' یا 'خرابیاں' کی ردیف میں اچھی غزل کہہ سکتا ہے اُس کو اچھا شاعر ماننے بنا نہیں بنتی۔ باصر غزل میں جب روایت کی پوری پاسداری کرتا ہے تو وہ اپنے تمام تر شاعرانہ قد کے ساتھ ایک بلند مقام پر کھڑا نظر آتا ہے اور اِس ضمن میں دلیل کے طور پر میں باصرؔ کے دو ایسے اشعار کا حوالہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اُس کی پہچان بن چکے ہیں:

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

اس قدر ہجر میں کی نجم شماری ہم نے
جان لیتے ہیں کہاں کوئی ستارا کم ہے

دوسرا شعر تو میرے نزدیک باصر کی شاعرانہ وجاہت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حال ہی میں لندن میں باصر کی پذیرائی میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں ایک بزرگ تجزیہ نگار نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے آگے چل کر باصر کی نظم اُس کی غزل سے زیادہ قبولیت کی سند حاصل کرے۔ گو کہ بنیادی طور پر مجھے اِس تجزیے سے اختلاف ہے مگر یہ بیان اِس بات کی طرف ضرور توجہ مبذول کراتا ہے کہ باصر کی نظم کو نظر انداز نہیں جاسکتا۔ بے شک باصر کی نظم بھی اپنا ایک رجحان وضع کیے ہوئے ہے۔ باصر کی نظموں کے مضامین موجودہ حالات اور عصری زندگی سے مخترع ہیں۔ اُس کی نظمیں، 'خواندگی'، 'قلم دوات'، 'پڑھو گے لکھو گے'، 'بادشاہت جہنم میں'، 'حفظِ ما تقدم'، 'ایک ڈیم فول کو نصیحت'، 'وادی الملوک کے ایک کارکن کی عرض داشت' اور 'شاہی محل کے ایک ملازم کی نجی گفتگو' خاص طور پر غور طلب ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک نظم میں اپنی پسند کی یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا:

دوسری ہجرت
بابا، تم نے
اپنی آنے والی نسلوں کی خاطر
اپنے آبا کی قبروں کو چھوڑا تھا۔
ہم نے بھی ہجرت کی ہے
اپنی اولاد کے 'روشن' مستقبل کے لیے۔

باصر کی نثر

میں باصر کے نہایت اچھوتے اور باکمال نثری شاہکار بساط کی جانب توجہ مبذول کرانا لازم سمجھتا ہوں۔ بساط ایک ڈرامہ ہے جو پہلی بار 1987ء میں منظرِ عام پر آیا۔ باصر نے اِس ڈرامے میں اپنی نثر نگاری اور ڈرامہ کے تکنیکی عوامل سے بہرہ مند ہونے کا لوہا منوایا اور اِس ڈرامہ کے ذریعے یہ باور کروایا کہ ڈرامہ دیکھنے سے ہی نہیں بلکہ پڑھنے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہ ڈرامہ ہمارے معاشرے میں موجود اور تاریخ میں در آئی کمزوریوں کے گرد گھومتا ہے۔ کردار نگاری اِس میں بڑی مشاقی سے کی گئی ہے، اسلوب خوب ہے، زبان آسان اور تمام کرداروں کی ضرورتوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ مکالمہ رواں ہے اور مکالمے کی پیچیدگی اور داخلی تناؤ کی روش جو اردو ڈرامے میں عام ہے اور بیشتر کمزوری کا باعث بنتی ہے بساط میں نہیں ملتی۔ بساط کو ادبی اکابرین اور بالخصوص اردو نثر کی جید اور گرانقدر ہستیوں نے بڑی تحسین سے نوازا ہے۔ اُن کی آراء بساط کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کی گئیں ہیں اور میں قارئین کو اِن آراء اور بساط کی طرف رجوع کی ترغیب دیتا ہوں۔

باصر بحیثیت ادبی سفارتکار:

باصر کو ملکہء برطانیہ کی جانب سے MBE کے اعزاز، برائے ادبی خدمات بحیثیت شاعر (Poet: Services to Literature)، سے نوازا گیا ہے۔ باصر اردو کا پہلا شاعر اور ادیب ہے جسے ادبی خدمات پر حکومتِ برطانیہ کی جانب سے کوئی اعزاز دیا گیا ہے۔ یہ نوازش نہیں باصر کا حق اسے دیا گیا ہے۔ مجھے اِس بات پر پورا یقین رہا ہے کہ باصر نے جو کام ایک اردو ادبی سفارتکار کی حیثیت سے کیا ہے وہ کسی بھی طور رائیگاں جانے والا نہیں۔ میں نے باصر کو یہ اعزاز ملنے سے بہت پہلے ایک اعزاز کی پیش گوئی بارسلونا میں منعقد 'جشنِ باصر' میں کر دی تھی۔ باصر نے انگریزی شعراء کے ساتھ مل کر اردو شاعری، بالخصوص اردو غزل کو، برطانیہ اور بعد ازاں یورپ میں نہ صرف متعارف کروایا بلکہ اردو غزل کے نامی گرامی شعراء کی تشہیر کی، غزلیات کے عمدہ تراجم کیے اور جگہ جگہ غزل پر ورکشاپس منعقد کیں۔ باصر نے شہر شہر لائبریریوں اور درسگاہوں میں غزلیں پڑھ کر سنائیں، اِن کی ہیئت اور معنی سے قارئین کو روشناس کرایا اور یوں اردو غزل کو نیا آڈینس مہیا کیا۔ اب کئی انگریزی شعراء نے بھی غزل کے میدان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

باصر کی غزلوں اور نظموں کے تراجم برطانیہ کے متعدد معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔ اس کی ایک غزل، 'زخم تمہارے بھر جائیں گے تھوڑی دیر لگے گی'، انگریزی ترجمے کے ساتھ برطانیہ کے ہسپتالوں اور انتظار گاہوں میں آویزاں کی گئی اور ایک شعر، 'دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو / پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو'، مع انگریزی ترجمہ، پتھر پہ کندہ کر کے لندن سے ملحق شہر سلاؤ کے میکنزی چوک میں نصب کیا گیا۔

باصر کی اردو ادبی سفارت کا سفر جاری ہے اور اللہ کرے کہ وہ تندہی سے اِس اہم کام کو سرانجام دیتا رہے۔ اُن سب شعراء اور ادیبوں کو جن کا ثانوی تعلق برطانیہ سے ہے (اِس گروہ میں میں بھی شامل ہوں) باصر کا بے حد ممنون ہونا چاہیے بلکہ ہم سب کو اپنے آپ کو اُس کا مقروض سمجھنا چاہیے۔ بے شک اُس کا MBE کا اعزاز ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے۔

باصر محقق اور تجزیہ نگار

باصر نے اپنے والد کی وفات کے بعد بڑی لگن اور ہنرمندی سے اُن کے کام کو بڑے کینوس پر سامنے لانے کا مشن اپنے ذمہ لے لیا۔ دیوان کی اشاعت سے لے کر اکادمی ادبیات کی شائع کردہ ناصر کاظمی: فن اور شخصیت تک باصر نے ایک تسلسل سے اِس سلسلے میں کام کیا ہے۔ میں موجود تھا جب محترم افتخار عارف نے، جو کہ اُس وقت اکادمی ادبیات پاکستان کے سربراہ تھے، باصر سے ناصر کے فن اور شخصیت پر کتاب مرتب کرنے کو کہا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی جب کچھ ہی عرصہ بعد یہ کاوش منظرِ عام پر آ گئی۔ یہ باصر کی محنت طلب طبیعت، عزم اور حوصلہ ہی تھا جس نے اِس کتاب کا اس قدر جلد شائع ہونا ممکن بنایا۔

باصر کا مطالعہ وسیع اور تنقیدی نظر گہری ہے۔ جب میری اور باصر کی ادبی معاملات پر گفتگو ہوتی ہے تو مجھے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ باصر کو ادب کے مروجہ اور متروک رویوں کا اچھی طرح علم ہے اور نیز یہ کہ وہ اپنے عہد کے تمام رجحانات سے پوری طرح باخبر ہے۔ چونکہ باصر عالمی ادب کا قاری ہے اُس کی نظر اردو ادب سے آگے نکل کر وسیع تر عصری رجحانات کا بغور جائزہ لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ باصر آگے چل کر تحقیق اور تجزیاتی کام کی طرف اور توجہ دے گا کہ اس کا علم اور بلیغ النظری اُسے باقاعدہ محقق اور تجزیہ نگار کے منصب پر مامور ہونے پر مجبور کر دیں گے۔

خلاصہ

باصر سلطان کاظمی ہمارے عہد کی اہم علمی اور ادبی شخصیت ہے۔ وہ ایک بے مثال شاعر، عمدہ نثر نگار، مستعد ادبی سفارتکار اور ذہین محقق اور ادب کا تجزیہ کار ہے۔ اُس کا ادبی سفر متنوع رہا ہے۔ اُسے ناصر کاظمی کا فرزند ہونے پر ناز ہے مگر میرے نزدیک اِسی نسبت کے باعث اُس کا اپنا ادبی قد کاٹھ اُس سرعت سے نہیں بڑھا جیسا کہ اُس کی صلاحیتوں کے باعث ممکن تھا۔ بہرطور کہتے ہیں، دیر آید درست آید، باصر اب اُس مقام پر کھڑا ہے جو اس کا اپنا ہے۔

آرزوئے کمالِ ہنر

ساجد علی
(لاہور)

1971 کا سال تھا جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کا طالب علم تھا۔ باصر سے دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک دن باصر نے پہلی بار مجھے اپنی وہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

دمِ صبح آندھیوں نے جنہیں رکھ دیا مسل کے
وہی ننھے ننھے پودے تھے گھنے درخت کل کے

غزل مجھے بہت ہی پسند آئی اور اس کا مطلع تو حواس پر اس قدر چھا گیا کہ کئی دنوں تک ہر وقت دماغ میں گردش کرتا رہتا تھا۔

اس وقت سے اب تک تقریباً چار دہائیوں پر محیط دوستی کا یہ سفر جاری ہے۔ شیخ صلاح الدین نے ناصر کاظمی: ایک دھیان میں لکھا ہے کہ ناصر سے ان کی دوستی کے ابتدائی زمانے میں بہت خوں ریز بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ میری اور باصر کی دوستی کا آغاز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ رات گئے تک کرشن نگر کی گلیوں میں ہمارا بحث مباحثہ جاری رہتا تھا۔ ان بحثوں کا ایک خاموش سامع وحید رضا بھٹی ہوتا تھا۔ وحید میرا کلاس فیلو تھا اور اسی نے باصر سے تعارف کروایا تھا۔ میرا تعلیمی، مذہبی، ادبی اور سیاسی پس منظر چونکہ باصر سے بہت مختلف تھا اس لیے ہمارے درمیان اختلافی نکات بھی بہت ہوتے تھے۔ دو بڑے اختلافی موضوعات اسلامی تاریخ اور اقبال کی شاعری تھے۔ بعض اوقات تو بحث میں تلخی کا رنگ بھی نمایاں ہو جاتا تھا جس پر وحید کو بڑی پریشانی ہوتی تھی اور وہ شاید اس اندیشے میں گرفتار گھر جاتا تھا کہ معلوم نہیں صبح یہ آپس میں ملیں گے یا نہیں۔ مگر صبح ہمیں کالج میں اسی خلوص اور گرم جوشی سے ملتے دیکھتا تو ابتداً تو وہ حیران ہوتا مگر پھر وہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔

ان مباحثوں میں تو کوئی بھی دوسرے کے نقطۂ نظر کا کبھی قائل نہ ہوا مگر دھیرے دھیرے ہمارے بھیتر میں تبدیلی آتی چلی گئی جس کے نتیجے میں غیر محسوس طور پر ہمارے خیالات اور افکار تبدیل ہوتے گئے۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم دنوں نے ہی اپنے ماضی کے بہت سے ترکے کو خیر باد کہہ دیا۔ باصر نے اقبال کو بطور شاعر از سرِ نو دریافت کیا اور اس کے اثرات اس کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں اور اب اس نے اقبال کی اسرارِ خودی کے ایک حصے کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

کالج کے زمانے میں ہم چند دوستوں کا جو گروپ تھا اس میں سبھی لکھنے لکھانے کا شوق رکھتے تھے مگر ہم سب میں یہ بات مشترک تھی کہ ایک دوسرے کی تحریر کو سخت سے سخت تنقیدی معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس میں غلطیوں کی نشان دہی کرتے تھے، اس پر بحث کرتے تھے۔ اس طرزِ عمل نے ہمیں بہت فائدہ دیا اور ہم نے واقعتاً ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا۔

ستر کی دہائی ہماری آوارہ گردیوں اور رتجگوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں شاعری کے علاوہ باصر کو شطرنج سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ یا تو ہر وقت شطرنج کی بساط سامنے رکھے اکیلا ہی کسی گرینڈ ماسٹر کی گیم کو سمجھنے میں دماغ سوزی میں مصروف ہوتا یا پھر شطرنج کے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑیوں کے بارے میں کتب کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اسی زمانے کو یاد کرتے ہوئے اس نے یہ شعر کہے ہیں:

کھلاڑی مجھ سے بہتر بیسیوں پیدا ہوئے ہیں
مگر شطرنج سے جو عشق مجھ کو تھا کسے تھا

یہی بچائے گا تم دیکھنا مری بازی
بساط پر جو یہ ناچیز سا پیادہ ہے

مگر ستر کی دہائی کے آخری برسوں میں باصر نظامِ ہضم کی خرابی کا شکار ہو گیا جس کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں اس نے اپنے طرزِ زیست کو بہت تبدیل کیا اور اپنی خوراک میں از حد احتیاط اور اعتدال کی راہ اختیار کی مگر اس نے شطرنج کھیلنے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تاہم کسی نہ کسی سطح پر اس کھیل میں اس کی دلچسپی برقرار رہی۔

شاعری اور شطرنج کے علاوہ باصر کو پتنگ بازی کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے بسنت منانے کی تیاری کرتا، ڈور کو مانجھا بھی خود لگاتا تھا۔ بسنت کے دن سب دوست اس کے گھر کی چھت پر جمع ہوتے اور خوب ہلہ گلہ ہوتا۔ میں اور بعض دوسرے دوست تو محض باصر کی خوشی کے لیے شریک ہوتے تھے کیونکہ ہمیں پتنگ بازی کے بارے میں سرے سے کچھ معلوم نہ تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ ایک رات حسبِ معمول باصر کے گھر پر دوستوں کی منڈلی جمع تھی۔ نصف شب گزر چکی تھی جب اس نے یہ اعلان کر کے سب کو چونکا دیا کہ وہ ایک ڈرامہ لکھ رہا ہے۔ اور اس نے زیرِ تصنیف ڈرامے کے کچھ مکالمات اور سین پڑھ کر سنائے۔ ان مکالموں میں حکمت و دانش کی بہت گہری باتیں تھیں اور نثر اتنی زوردار تھی کہ سب دوست حیران رہ گئے۔ اب اگلے کئی برس باصر ڈرامے کے مطالعے میں ہمہ تن غرق رہا۔ اس نے اردو کے سارے ہی طبع شدہ ڈرامے پڑھ ڈالے اور انگریزی زبان میں بھی بہت سے ڈرامہ نگاروں کا مطالعہ کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں وہ شاعری کو ہی خیر باد نہ کہہ دے کیونکہ کچھ بیماری کے سبب اور کچھ ڈرامے میں انہماک کے باعث باصر نے 1976 سے 1979 تک چار برسوں میں صرف نو غزلیں کہی تھیں۔

باصر کی یہ عادت ہے کہ تخلیقی کام میں وہ کبھی بھی جلدی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ بڑے صبر اور بڑی استقامت کے ساتھ کھیتی کے پھلنے پھولنے کا انتظار کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا ڈرامہ بساط تقریباً دس برس کے عرصے میں مکمل کیا جو ایک شاہ کار تصنیف ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں فلسفہ

بہت زیادہ ہوگیا ہے اور وہ ڈرامے کی بجائے مکالمات افلاطون کی قبیل کی کوئی چیز لگتا ہے۔ جب یہ ڈرامہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔

نوے کی دہائی میں باصر نے مزید تعلیم کے لیے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں اسے علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع میدان میسر آ گیا اور اس نے نئے علاقے فتح کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ تعلیمی ڈگریوں کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی سرگرمیاں زیادہ بھرپور طریقے سے جاری رہیں۔ اس نے ڈرامے بھی تصنیف کیے جو وہاں کے بہت اعلیٰ تھیٹروں میں اسٹیج ہوئے۔ اس کے دوسری قوموں اور زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں سے روابط استوار ہوئے۔

ان روابط کا ایک ثمر یہ ہے کہ اس نے بھارتی نژاد برطانوی شہری اور انگریزی زبان کی شاعرہ دیبجانی چیٹر جی (Debjani Chatterjee) اور انگریز شاعر سائمن فلیچر کے ساتھ مل کر مِنی مشاعرہ کی بنیاد رکھی۔ دیبجانی ہندو ہیں اور ان کی مادری زبان بنگالی ہے۔ وہ ہندی سے بھی بخوبی واقف ہیں اور انگریزی کی انعام یافتہ اور مشہور شاعرہ ہیں۔ سائمن بھی انگریزی کے مستند شاعر ہیں جن کی کتاب کے بارے میں Poet Laureate ٹیڈ ہیوز (Ted Hughes) نے تعریفی جملے لکھے۔ یہ تینوں شاعر برطانیہ کے متعدد شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں جا کے اپنی شاعری سناتے ہیں اور ورکشاپیں منعقد کرتے ہیں۔ ان کا مقصد فن کے ذریعے مختلف قومیّتوں، مذاہب اور نسلوں کے لوگوں میں بھائی چارے کو فروغ دینا ہے۔ اِن دوستوں کی رفاقت نے باصر کو نظم لکھنے کی طرف راغب کیا اور اس سے غزلیں سن کر وہ غزل میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے انگریزی میں غزل کی طرز پہ نظمیں بھی کہیں اور باصر کے ساتھ مِل کے اردو غزلوں کے تراجم بھی کیے جو مختلف ادبی جرائد اور anthologies میں شائع ہو چکے ہیں۔ باصر نے بھی اُن کی نظموں کو اردو میں منتقل کیا ہے جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ آرٹس کونسل انگلستان کی سپانسر شپ پر سائمن نے اپریل 1997 میں لاہور کا دورہ کیا اور ناصر کاظمی کی پچیسویں برسی کے موقع پر الحمرا میں جو تقریب منعقد ہوئی تھی اس میں اپنی نظم پیش کی۔ دیبجانی نے اپریل 2006 میں باصر کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کیا۔ لاہور میں مختلف ادبی تنظیموں، ثقافتی اداروں اور تعلیمی درسگاہوں نے اِن مہمانوں کی بہت پذیرائی کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں بھی دیبجانی اور باصر کے ساتھ ایک محفل منعقد ہوئی جس میں دونوں نے اپنا کلام سنایا۔

دیبجانی نے باصر کے اشتراک سے ناصر کاظمی کی 25 اور باصر کی 24 غزلوں کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا ہے جو Generations of Ghazal کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان تینوں شاعروں کے کلام کا ایک مجموعہ A Little Bridge کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب ناصر اور باصر کے حوالے سے انگریزی خواں لوگ اردو شاعری اور بالخصوص غزل کے ذائقے سے آشنا ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ غریب الوطنی کے اپنے مسائل ہوتے ہیں مگر باصر نے رونے دھونے کی بجائے اس صورت حال کو قبول کرتے ہوئے ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس مجموعے کی افتتاحی غزل میں اس صورت حال کو بہت ہی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

باصر نے اپنے پہلے مجموعہ کلام موجِ خیال کے دیباچے میں لکھا تھا کہ انگلستان آنے کے بعد ''جب مجھے یہ خیال آنے لگا کہ اب میں صرف ڈرامے لکھا کروں گا اور شعر کبھی کبھار ہی ہوا کریں گے، میری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوا جو شاید اب صرف غزل تک محدود نہ رہے۔ اگرچہ غزل اپنی جگہ ایک لامحدود صنفِ سخن ہے۔''

باصر کے اس نئے مجموعہ کلام سے اس کی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے۔ اس نے غزل کے ساتھ نظم نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے بلکہ نثری شاعری تک جا پہنچا ہے۔ نثری نظم کے بارے میں اگرچہ میرے تحفظات ہیں مگر منیر نیازی کی ایک پنجابی نثری نظم ''گان والے پنچھی دی ہجرت'' پڑھنے کے بعد میں اس امکان کو تسلیم کر چکا ہوں کہ ایک حقیقی شاعر نثری نظم میں بھی اعلیٰ درجے کی تخلیق پیش کر سکتا ہے۔

باصر کا شعری سفر اب چار دہائیوں پر محیط ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب گورنمنٹ کالج کے بعض اساتذہ اور شاعری سے شغف رکھنے والے طلبہ میں سے بہتوں کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے والد سے لکھوا کر لاتا ہے۔ والد کی وفات کے بعد جب باصر کہیں شعر سناتا تھا تو لوگوں کو اس میں ناصر کاظمی کا رنگِ سخن خود بخود بولتا نظر آ جاتا تھا۔ ایک بڑے اور نامور باپ کا فرزند ہونے کے جہاں بہت سے فوائد ہوتے ہیں وہاں کچھ مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل سے عہدہ برا ہونے اور اپنی حیثیت منوانے کی خاطر بعض لوگ پدر کشی کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور بعض اس راہ سے ہی کنارہ کش ہو جاتے ہیں جو ان کے پدر کی راہ ہوتی ہے۔ باصر نے ایسا کوئی رویہ اختیار نہیں کیا۔ اسے جہاں ناصر کاظمی کا فرزند ہونے پر فخر ہے وہاں اس نے شعوری یا شاید لاشعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نے شاعری میں ناصر کا رنگِ سخن اختیار نہیں کرنا۔ اس نے یہ شعر تو بہت بعد میں کہا ہے مگر اس کا عمل شروع سے یہی تھا:

بنانی پڑتی ہے ہر شخص کو جگہ اپنی
ملے اگرچہ بظاہر بنی بنائی جگہ

میں وہ شخص ہوں جس کا تعارف باصر کی شاعری سے پہلے اور ناصر کاظمی کی شاعری سے بعد میں ہوا۔ اس لیے مجھے کبھی بھی باصر کی شاعری میں ناصر کا رنگ نظر نہیں آیا۔

باصر نے اپنے والد سے شعر گوئی کی تربیت حاصل کرنے کے ساتھ

ساتھ لفظ کے استعمال کا سلیقہ بھی سیکھا ہے۔ ناصر کاظمی کے سب ملنے والے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اس جیسا لفظ شناس شاید ہی کوئی اور ہو۔ ایک بار ہم ناصر کاظمی سے دوستی کے دعویدار ایک صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ہمیں کوئی بات بتاتے ہوئے کسی قدر فخریہ انداز میں کہا کہ آخر ہم بھی ناصر کی صحبت میں بیٹھتے رہے تھے اور اس سے لفظوں کے استعمال کا ہنر سیکھا تھا۔ ہم نے یہی بات جب شیخ صلاح الدین صاحب سے بیان کی تو ان کا بے ساختہ جواب تھا کہ موصوف بالکل غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ جب ان سے اس بات کی وضاحت مانگی تو شیخ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، ''بھائی اگر انہوں نے ناصر کاظمی سے کچھ سیکھا ہوتا تو اتنی گھٹیا شاعری کبھی نہ کرتے۔'' شیخ صاحب کے اس معیار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناصر کاظمی سے فیض یاب ہونے کا دعویدار خواہ بہت اعلیٰ شاعری نہ بھی کر سکے، مگر وہ گھٹیا شاعری کبھی نہیں کر سکتا۔ باصر اپنے اس دعوے میں سچا ہے کہ اس نے ناصر کاظمی سے تربیت حاصل کی ہے اور اس کا شعری سرمایہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں بے ڈھب اور بھرتی کا لفظ نہیں ملے گا۔ وہ لفظوں کی اداؤں کی مکمل جانکاری رکھتا ہے۔ خامہ بگوش نے ایک بہت مشہور شاعر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ لفظ کو نگینے کی طرح جڑتے تھے مگر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ نگینہ انگوٹھی میں جڑا جا رہا ہے یا انگوٹھے میں۔ باصر کے کلام کا قاری یہ جاننے میں غلطی نہیں کر سکتا کہ وہ انگوٹھی اور انگوٹھے کا فرق بخوبی سمجھتا ہے۔

اعلیٰ ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہر بڑا مصنف اور فن کار اپنی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں خود انتقادی کا رویہ رکھتا ہے۔ قدرت کی طرف سے یہ صلاحیت بہت کم تخلیق کاروں کو عطا ہوتی ہے کہ ان کی اولین کاوش ہر اعتبار سے کامل ہو۔ شیخ صلاح الدین کے بقول ناصر کاظمی کا تخلیقی رویہ یہ تھا کہ وہ ''اپنے ہر شعر کو حق کے کڑے سے کڑے امتحان سے گزارتا اور جب کوئی شعر اس کے امتحان پر پورا اترتا تو وہ اس کو سناتا اور کئی کئی بار سنا کر اس کو پرکھ لیتا تو پھر اس کو شائع کرواتا۔ مگر وہ اس پر بھی مطمئن نہ ہوتا تھا۔'' کیونکہ اصلاح و ترمیم کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہتا تھا۔

اس کے برعکس ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے قلم سے جو کچھ کاغذ پر رقم ہوتا ہے وہ ان پر نازل ہوتا ہے۔ اور جو چیز اوپر سے نازل ہو اس میں کسی قسم کا تغیر کرنا یا اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا گناہِ کبیرہ کے مترادف ہے۔ اس لیے جو وہ ایک بار لکھ لیتے ہیں نہ دوبارہ خود اسے پڑھتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کی بات پر دھیان دینا گوارا کرتے ہیں۔ شاید اقبال نے انہی لوگوں کے لیے یہ شعر کہا تھا:

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

انیسویں صدی کے مشہور ولندیزی مصور وان گوخ (Van Gogh) کی تصویروں پر بعض ناقدین نے جب یہ اعتراض کیا کہ وہ بہت جلدی میں بنائی گئی ہیں، تو اس کا جواب یہ تھا کہ انہوں نے تصویروں کو بہت جلدی میں دیکھا ہے۔ تصویر بنانے کا عمل بے شک بہت جلدی میں ہوا ہے مگر ناقدین نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ تصویر نے کتنے طویل عرصے تک مصور کے بطن میں پرورش پائی ہے۔

خاموش آتش فشاں سے لاوا دفعتہً پھوٹ بہتا ہے مگر اسے بننے میں شاید صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس موقع پر ضمیر جعفری نے ملائی زبان کے پشتونوں کا جو اردو ترجمہ کیا تھا اس کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے جس میں اس خیال کو بڑے خوبصورت انداز میں ادا کیا گیا ہے:

جب سب ٹیلا جل چکتا ہے تب جا کر لاوا بہتا ہے

یہ ناصر کاظمی کی تربیت کا فیضان ہے کہ باصر بھی لکھ کر کاٹنے کی اہمیت سے آگاہ ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ ہیرا بھی ایک پتھر ہی ہے جب تک اس کو تراشا نہ جائے اور ہیرا تراشنا ایک بہت صبر آزما اور پر مشقت کام ہے۔ وہ اپنے لکھے کا خود بھی تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور دوسروں کی بات کو بھی دھیان سے سنتا ہے۔ اگر کسی سقم کی طرف توجہ دلائی جائے تو اس پر غور کرتا ہے۔ اس کا عمومی رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے جب ایک حد تک مطمئن ہو جائے تو اسے قریبی دوستوں کو سناتا ہے اور اس پر رائے طلب کرتا ہے۔ دوستی کے اس طویل سفر میں اس کے تازہ کلام کے اولین سامعین میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہ اس کا حوصلہ ہے کہ مجھ جیسے غیر شاعر کی بات کو بھی لائق توجہ گردانتا ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے اس نے مجھے ویٹو کا حق دے رکھا ہے۔ مجھے اپنی پسند ناپسند کا اظہار کرنے میں کبھی باک نہیں رہا۔ چنانچہ اگر کوئی شعر مجھے پسند نہ آئے تو میں بلا جھجک اپنی رائے کا اظہار کر دیتا ہوں۔ متعدد دفعہ ایسا ہوا ہے کہ اگر وہ قائل ہو گیا تو اس نے شعر کو یا تو بدل دیا یا حذف ہی کر دیا۔

ناصر کاظمی سے اس نے ایک اور بات سیکھی ہے اور وہ ہے رائج الوقت فیشن کی پیروی سے حذر کرنا۔ ناصر کاظمی کے زمانے میں ایک طرف تو وہ لوگ تھے جنھوں نے آئیڈیالوجی اور کمٹمنٹ کا پرچم اٹھا رکھا تھا اور ہر ادیب اور شاعر سے یہ تقاضا کیا جاتا تھا کہ اسے وہ لکھنا چاہیے جو پارٹی کی آئیڈیالوجی کا مقتضا ہے نہ کہ جو وہ خود لکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو پیرس کے تازہ ترین فیشنوں کی پیروی کرنے کو ہی تخلیق کی معراج جانتے تھے۔ ان میں پہلے گروہ نے جو ادب تخلیق کیا اس کا حسب خراب تھا تو جدید ادب کا نسب مشکوک تھا۔ ان کے برعکس ناصر نے کسی آئیڈیالوجی کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اس نے وہی کچھ لکھا جو وہ خود لکھنا چاہتا تھا۔

باصر نے بھی شعر گوئی میں نہ تو ان روایتی حربوں سے کام لیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا برائے شعر گفتن خوب است اور نہ کسی آئیڈیالوجی سے فکر مستعار لی ہے، نہ کسی نام نہاد روحِ عصر کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور نہ کبھی کسی فیشن کی نقالی میں شعر کہے ہیں۔ اسی کا ایک شعر ہے:

کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے
جیسا لکھنا چاہا ویسا لکھا ہے

اس نے صرف اپنے محسوسات، مشاہدات، تخیلات اور تجربات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔اس کی شاعری کا منبع اس کی اپنی ذات اور باطن کی پکار ہے مگر وہ خارجی دنیا کے احوال و وقائع سے بے خبر بھی نہیں۔آس یاس، یافت نایافت، مسرت الم یہ سب زندگی کے رنگ ہیں اور باصر نے کسی رنگ سے منہ نہیں موڑا۔زندگی کے بارے میں اس کا رویہ رومانی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے۔وہ ایک صورت حال کو قبول کر لیتا ہے مگر اس میں بہتری کی آرزو سے دست بردار نہیں ہوتا۔

یہاں نہ جینے کا وہ لطف ہے نہ مرنے کا
کہا تھا کس نے کہ آ کر رہو پرائی جگہ

گلہ بھی تجھ سے بہت ہے مگر محبت بھی
وہ بات اپنی جگہ ہے یہ بات اپنی جگہ

وان گوخ کا کہنا ہے کہ مصور کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے چھ بنیادی رنگوں میں توازن قائم کرنا۔شاعر کا میڈیم رنگ نہیں الفاظ ہیں۔اس کے لیے چیلنج ہے کسی قلبی واردات، روحانی کیفیت، ذہنی خیال، نفسیاتی حال کو مناسب اور دلربا جامۂ حرف میں ملبوس کرنا۔شاعر لسانی وجود خلق کرتا ہے۔اس لیے شاعری میں زبان کی حیثیت بنیادی ہے جبکہ موضوعات کی حیثیت ثانوی ہے۔شاعر اظہار کے جو سانچے استعمال کرتا ہے ان کی ہیئت کی ایک روایت موجود ہوتی ہے۔یہ سانچے اگرچہ بے لچک نہیں ہوتے مگر کوئی بھی سانچہ لامحدود حد تک لچک دار نہیں ہو سکتا۔اب شاعر ان سانچوں کی لچک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے لسانی وجود خلق کرتا ہے جنہیں ناصر کاظمی کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے مانوس اجنبی قرار دیا جا سکتا ہے۔بطور خالق ایک شاعر کا مقام و مرتبہ اسی سے طے ہوگا کہ اس نے کتنے ایسے وجود تخلیق کیے ہیں جو بیک وقت مانوس بھی ہوں اور اجنبی بھی۔باصر کی شاعری کا مقام طے کرنا تو اس کے قارئین یا پھر ناقدین کا کام ہے مگر میری رائے میں اس کی شاعری میں مانوس اجنبی قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔اس کی غزل اگرچہ روایت سے جدا نہیں مگر اس کے ایک ایک شعر پر باصر کی مہر موجود ہے کہ یہ صرف اسی کا شعر ہو سکتا ہے کسی اور کا نہیں۔اس مجموعے میں دو ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جنہیں میں تجرباتی غزلوں کا نام دوں گا۔ایک غزل میں اس نے دو مختلف قسم کے قافیے استعمال کیے ہیں جبکہ دوسری غزل میں محض بصری قوافی استعمال کیے گئے ہیں۔

باصر کے اولین مجموعہ کلام موجِ خیال میں اگرچہ اس کی انفرادیت پوری طرح جلوہ گر تھی مگر اس میں روایتی تغزل کے آثار بھی نمایاں تھے۔اردو غزل کے ساتھ المیہ یہ ہوا تھا کہ میر صاحب جیسے بحرِ پرشور کی موجودگی کے باوصف غزل کو معاملہ بندی اور مخصوص لفظیات کی تنگنائے میں قید کر دیا گیا تھا۔لہٰذا اقبال کی غزل کو غزل ماننے سے ہی انکار کر دیا گیا۔ایک مخصوص انداز اور لہجہ تغزل کا نشان بن گئے۔ہم نے سنا بھی اور پڑھا بھی ہے کہ محمد حسن عسکری صاحب اردو کے بہت بڑے نقاد تھے۔قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں وہ ناصر کاظمی کی غزل کے بہت مداح تھے۔مگر جب ناصر نے اپنی غزل میں گھاس کا لفظ استعمال کیا تو عسکری صاحب بدک گئے کیونکہ ان کا شعری ذوق غزل جیسی نازک صنف میں اتنے کریہہ الصوت لفظ کا استعمال برداشت نہ کر سکا۔انہیں لگا کہ شاعر نے تغزل کا اپمان کیا ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ عسکری صاحب اگر آج زندہ ہوتے اور ناصر کاظمی کے فرزند کا یہ شعر سنتے تو ان پر کیا بیتتی:

مشکل ہوا پتنگ کو اپنی سنبھالنا
الجھی ہوئی ہے ڈور سے کوئی دُگاڑسی

مشکور حسین یاد صاحب نے باصر کو اکڑفوں شاعر قرار دیا ہے۔مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے۔اسے اپنی ذات پر اعتماد ہے اس لیے نہ وہ شعر گوئی میں اور نہ مقبولیت کے لیے مروجہ بیساکھیوں کا سہارا تلاش کرتا ہے۔وہ روایت اور تجربے کی اہمیت اور ان کے سمبندھ کا مکمل ادراک رکھتا ہے۔اس کی تازہ کتاب چمن کوئی بھی ہو میں اس حقیقت کے کتنے ہی شواہد موجود ہیں کہ اس نے نہ صرف نئی زمینیں دریافت کی ہیں بلکہ ان میں نئی فصلیں بھی کاشت کی ہیں۔

انگلستان آمد کے بعد اس کی غزلوں کا نیا لہجہ اور منفرد ذائقہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے اور اس نے خود کو دہرانا شروع نہیں کیا۔البتہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ شاعری ہو یا کوئی اور فن، اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے بہت کچھ قربان بھی کرنا پڑتا ہے۔اسی بات کو اس نے یوں ادا کیا ہے:

رہ رہ کے یاد آتی ہے استاد کی یہ بات
کرتی ہے آرزوئے کمالِ ہنر خراب

دو مزید اشعار درج کرنے کے بعد اجازت چاہوں گا کہ پریشاں خیالی کا یہ سلسلہ بہت طویل ہو گیا ہے۔مگر غور کرنے کی بات ہے کہ اس غزل کی ردیف نے (اس مجموعے میں ایسی کتنی ہی غزلیں اور بھی ہیں) معانی کے کتنے در وا کیے ہیں:

حالت جگہ بدلنے سے بدلی نہیں مری
ہوتی ہیں ہر جگہ کی کچھ اپنی خرابیاں

باصر کی شخصیت بھی عجب ہے کہ اس میں ہیں
کچھ خوبیاں خراب کچھ اچھی خرابیاں

متاثر کُن ڈرامہ

مکالموں سے کرداروں کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذہانت جھلکتی ہے۔بحیثیتِ مجموعی ''بساط'' متاثر کرنے والا ڈرامہ ہے۔

شفیق الرحمٰن

صدا کی بازگشت

یشبؔ تمنا
(لندن)

اردو زبان اور شاعری تو اتنی پرانی نہیں لیکن پھر بھی اس میں کی جانے والی شاعری میں اتنی یکسانیت ہے اور موضوعات اتنے محدود کر لیے گئے ہیں کہ اب کسی بھی شاعر کا صرف اس روایتی قسم کی شاعری کی بنیاد پر تادیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ نئے راستے تلاش کیے جائیں اور زبان کو پوری طرح استعمال کر کے زبان کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کیا جائے۔ غزل بلاشبہ اب بھی اردو شاعری کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے اور ضروری ہے کہ دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی زیادہ سے زیادہ امکانات تلاش کیے جائیں۔

باصرؔ سلطان کاظمی کو اپنے حوالے سے دو مسئلے درپیش تھے۔ ایک تو اپنے والد ناصرؔ کاظمی کے اثر سے نکلنے کا اور دوسرا اپنی الگ شناخت کا۔ اپنی ذاتی مشکل کے ساتھ ساتھ انھوں نے بعض لوگوں کی 'سازش کی بُو' بھی سونگھ لی اور اپنی پہلی کتاب 'موجِ خیال' کے دیباچے ہی میں لکھ دیا کہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ میری بدقسمتی ہے کہ میرا موازنہ ناصرؔ کاظمی سے کیا جائے گا، اپنے ہم عصروں سے نہیں۔

لیکن باصرؔ نے یہاں کمال سمجھ داری کا ثبوت دیا اور ناصرؔ کے لوحِ مزار پر ع رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد! والا انداز اپنایا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ان کی صلاحیت اور قوت، غیر ضروری طور پر ضائع ہونے سے بچ گئی۔ یوں بھی یہ معاملہ ع 'صلح کر لو یگانہ غالبؔ سے' والا نہیں، صدق دل سے تھا اور اس بات کا عملی ثبوت انھوں نے ناصرؔ شناسی کے فروغ میں اپنی گوناگوں کوششوں سے دیا۔

اگر کسی دوسرے شاعر میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ یا اور کسی بھی شاعر کا اثر آ جائے تو قابلِ معافی ہے لیکن ناصرؔ کے بیٹے میں ناصرؔ کا اثر بالکل نہ آئے، یہ ضروری ٹھہرا۔ باصرؔ کی بالکل ابتدائی شاعری، جو ناصِر کی وفات تک ہے، بلاشبہ ناصرؔ کے رنگ میں ہے لیکن اس کا دورانیہ بہت مختصر ہے، شاید چار پانچ سال۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ دور باصرؔ کے سیکھنے کا دور ہے اور دوسرا اس کلام میں ناصرؔ کی اصلاح بھی شامل ہے۔ باصرؔ کا اصل کام اپنے والد کی وفات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ناصرؔ کی وفات کے بعد بقول خود باصرؔ ان کی جدائی تخلیقی قوت میں تبدیل ہوتی گئی۔

جب ناصرؔ کاظمی کا انتقال ہوا تو باصرؔ اٹھارہ سال کے تھے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ باصرؔ نے اتنے کم وقت میں ناصرؔ کاظمی سے نظم اور نثر کے درمیان موجود ایک بہت ہی باریک سی لکیر کو دیکھ لینے کا ہنر سیکھ لیا۔ لیکن باصرؔ نے ساتھ ہی اپنے والد کا یہ قول بھی بتایا کہ ''پاپا بھی میرؔ اور لورکا کو اپنے ہم عصر کہتے تھے اور مجھے بھی نصیحت کرتے تھے کہ اگر میرؔ اور غالبؔ کے سامنے اپنی غزل سنانے کی ہمت کر سکو تو شعر کہنا ورنہ کوئی اور کام کرنا''۔

گویا ناصرؔ نے باصرؔ کا راستہ اور مشکل بنا دیا۔ میں سمجھتا ہوں بعض لوگ ناصرؔ کے میرؔ کی ہم عصری کے اس دعویٰ کو انسانی عمر کا وہ یکساں دورانیہ سمجھ لیتے ہیں جو دو مختلف انسانوں کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ میرے خیال میں اس ہم عصری سے مراد دراصل ایک ایسی بے مثال اور لازوال شعری ریاست کی شہریت ہے جہاں تمام شہری برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور ان میں اگر کوئی تفریق ہے تو وہ ان کی شعری صلاحیت اور محنت کی بنیاد پر ہے اور ہاں، لازم نہیں کہ اس شعری ریاست کے تمام شہری میرؔ اور غالبؔ جیسے شعر کہہ سکیں۔ قانونِ قدرت کے مطابق وقت نے بھی گزرنا ہے اور دنیا نے تبدیل بھی ہونا ہے اس لیے وقت کے ساتھ شاعروں کے موضوعات، ان کی زبان، بیان اور شعری اسلوب بھی تبدیل ہوتے رہیں گے لیکن اس شعری ریاست کے تمام شہری گزشتہ اور آئندہ آنے والے زمانوں میں اس کے باوقار شہری رہیں گے۔ اس لیے اٹھارویں صدی کے میر تقی میرؔ انیسویں، بیسویں، اکیسویں اور اس کے بعد کی صدیوں کے شاعروں کے بھی ہم عصر ہوں گے۔ اس شعری ریاست میں میرؔ کا ہم عصر وہ گمنام شاعر ہے جس نے کہا تھا:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اور بالکل اسی طرح باصرؔ سلطان کاظمی بھی، کہ جو اگر اکیسویں صدی میں میرؔ کے سامنے غزل سرا ہوں گے تو وہ بہ رنگِ میرؔ یہ نہیں کہیں گے:

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا مونہہ
کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

بلکہ اُن کا انداز یہ ہوگا:

ساری صدائیں میری صدا کی ہیں بازگشت
اہلِ چمن میں کون مرا ہم نوا نہیں

میرا خیال ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر باصرؔ کے ہاں ایک نیا شعری اسلوب ناصرؔ کی وفات کے بعد در آیا اور اس کا پہلا اظہار سن 1972ء، سن 1973ء اور بعد کی غزلوں میں ہوا۔

باصرؔ کہاں تم اور کہاں اس کی جستجو
بیٹھے بٹھائے پڑ گئے یہ کس عذاب میں

لیکن دوسرے سال کی ایک اور غزل میں چار شعر ایسے ہیں جن سے باصرؔ کے آئندہ کے شعری اسلوب کی بنیاد پڑی

مجھ سے ہر بات کی توقع رکھ
آدمی ہوں کوئی فرشتہ نہیں
کھائے ہیں اس قدر فریب کہ اب
اعتبارِ حواسِ خمسہ نہیں

دائمی روگ ہے جسے لگ جائے
عشق دو چار دن کا قصّہ نہیں
اپنے دل میں پناہ لے باصؔر
اِس سے مضبوط کوئی قلعہ نہیں

ایسا نہیں کہ آنے والے برسوں میں باصؔر نے میرؔ اور ناصؔر کے رنگ میں غزلیں نہیں کہیں، ضرور کہیں اور بہت سی کہیں لیکن اپنی شناخت کو مستحکم کرنے کا کام بھی جاری رکھا۔ چھوٹی بحروں میں، معروف بحروں میں، غیر مردّف غزلیں، چھوٹے اور لمبے قافیوں کے ساتھ غزلیں کہیں لیکن باصؔر کی اپنی پہلی کتاب موجِ خیال میں، جو سن 1997ء میں شائع ہوئی، اُن کی کوئی نظم شامل نہیں حالانکہ اس دوران نثر پر کام جاری رہا اور انھوں نے نثر میں کافی کام کیا، مثلاً اُن کا خوبصورت ڈرامہ بساط۔ اس کا سبب۔۔۔؟ میرا خیال ہے باصؔر شاید پہلے غزل میں اپنی ایک الگ شناخت بنانے کے متمنّی تھے!

جب میں یہ کہتا ہوں کہ باصؔر نے اپنا ایک الگ اور نیا شعری اسلوب بنایا ہے تو لامحالہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر باصؔر کا یہ نیا شعری اسلوب ہے کیا جو اِن کی شاعری کو دوسروں کی شاعری سے الگ اور منفرد کرتا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی شعری تربیت، بے پناہ ریاضت اور گہرے مشاہدے کی بنیاد پر سادہ اور معروف الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال کے ایسے طریقے کو اپنایا ہے جو بات سمجھانے کے لیے شعر میں ہلکے سے طنز کے ساتھ شگفتگی کا عنصر تو لے آتا ہے لیکن شعر میں پھکڑ پن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اُن کے اشعار میں ہلکا سا مزاح تو ہے لیکن میں اُن کی شاعری کو مزاحیہ شاعری اس لیے نہیں کہوں گا کیونکہ اُن کے اشعار سن کر آپ بے ساختہ قہقہہ نہیں لگاتے بلکہ مسکراتے ہیں اور پھر کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کے اشعار آپ کے لیے شگفتگی کے ساتھ ساتھ سوچ بچار کا سامان بھی لے آتے ہیں۔ معاملہ چاہے محبت کا ہو یا عملی زندگی کا، باصؔر ہمیشہ ایک حقیقت پسندانہ رویہ اپناتے ہیں۔ اور یہی باصؔر کا شعری اسلوب ہے جو انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا اس انداز میں اور اس رنگ میں اس سے پہلے شعر نہیں کہے گئے؟ اس کا جواب تو ہاں میں ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے شاعروں نے اکّا دکّا شعر ضرور کہے لیکن بہت کم شاعروں نے اسے اپنا اسلوب بنایا ہے۔ میرؔ نے اپنے چھ دیوانوں میں اس رنگ میں اشعار کہے لیکن اس رنگ میں ایک مکمل غزل کا تجربہ شاید میرؔ کے ہاں نہیں۔

باصؔر نے ایک نئے شعری اسلوب کی تلاش کے جس سفر کا آغاز آج سے چالیس سال پہلے شروع کیا تھا وہ اب اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اس دوران اُن کی شاعری کی دو کتابیں موجِ خیال سن 1997ء اور چمن کوئی بھی ہو سن 2008ء میں شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اپنی پہلی کتاب میں باصر نے جس شعری اسلوب کی بنیاد رکھی تھی دوسری کتاب میں وہی اسلوب مستحکم ہوا اور دوسری کتاب کی بیشتر غزلیں ایک سا اسلوب لیے ہیں۔ اس وقت باصؔر کی تیسری کتاب ہوائے طرب، پیشِ نظر ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ شاعر نے اس میں بھی اپنے مخصوص اسلوب کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے اور زیادہ مستحکم کیا اور اس میں اس اسلوب کو اپنی شاعری میں تنوع کے ساتھ اپنایا۔ تیسری کتاب کی بیشتر غزلیں میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں کہ باصؔر ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔

غریب الوطنی

ناصِر صاحب کی شاعری میں ہجرت کا تجربہ بہت ہی مختلف حوالوں اور پیرایوں سے سامنے آتا ہے اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ شاید اب emotional سطح پر زمین کے حوالے سے، جنم بھومی کے حوالے سے جو کشمکش انسانی زندگی میں ہوتی ہے اس سے بہتر اس کا استعمال شاید ممکن نہ ہو لیکن جو ہجرت باصِر نے کی ہے اس کی بنیاد معاش پر ہے اور یہ ایک کم و بیش ایسا سوچا سمجھا فیصلہ ہے جس کے پیچھے motives تو معاشی ہیں لیکن اس کی جو feeling کی سطح ہے اس میں ان کا اور ناصِر صاحب کا مسئلہ کم و بیش آپس میں مل جاتا ہے۔ لیکن اِن مماثلتوں کے باوجود جتنی خوبصورتی سے باصِر کے یہاں ہمیں ہجرت کا تجربہ نظر آتا ہے اس کی صرف چار مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ دیکھیئے کہ اِس کے پیچھے پاکستان میں رہنے والی نئی نسل کا المیہ بھی ہے آشوب بھی:

کرتے نہ ہم جو اہلِ وطن اپنا گھر خراب — ہوتے نہ یوں ہمارے جواں دربدر خراب

باغ اِک ہم کو ملا تھا مگر اس کو افسوس — ہم نے جی بھر کے بگاڑا ہے سنوارا کم ہے

شاید فلک ہی ٹوٹ پڑا تھا وگرنہ یوں — جاتا ہے چھوڑ کر کوئی اپنی زمیں کہیں

اور آخری اور چوتھا شعر۔ غریب الوطنی کے حوالے سے حفیظ جونپوری کا شعر آپ کو یاد آئے گا:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

تو اس غریب الوطنی کا استعمال دیکھیے باصِر نے کیسے کیا ہے:

لاکھ آسائشیں پردیس مہیا کر دے — ہے غریب الوطنی پھر بھی غریب الوطنی

امجد اسلام امجد

کٹ چکی عمرِ جنوں

ڈاکٹر قیصر عباس زیدی
(یو کے)

باصر کاظمی سے میرا پہلا تعارف اُس وقت ہوا جب کوئی بیس سال پہلے مانچسٹر میں ایک مشاعرے میں باصر نے ایک غزل پڑھی اور سامعین نے خاص طور سے اس شعر پر خوب داد دی:

وہ اپنے شہر سے جانے کی رہ دکھا تو گیا
اُسے پتا نہیں شاید کہ میں گیا تو گیا

میرے ذہن میں یہ شعر آج تک محفوظ ہے، اس لیے کہ اپنے وطن سے ہجرت کے وقت کی منظر کشی اس طرح سے، پہلے کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ پچھلے پانچ سال میں باصر کی شخصیت اور شاعری کو جس تواتر اور قربت سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا، اُس نے نہ صرف اُن کی شاعری کے فنی اسرار و رموز کے بہت سے نئے دروا کیے بلکہ رفتہ رفتہ اُن کے طرزِ احساس کی نُدرت اور اُس سے وابستہ نئے پہلوؤں سے بھی آشنائی ہوئی۔

باصر کی شاعری میں Thesis بھی ہے، Anti thesis بھی اور پھر اُن کی Synthesis بھی، کچھ اس طرح سے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ باصر نہ صرف حقیقتوں کے سنگم تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ وہاں پہنچ کر حیران بھی نہیں ہوتے۔ حقیقتوں کے اختلاط کے عمل میں ایک حقیقت پسند کی طرح شامل بھی ہوتے ہیں اور اُن کا غیر جانبدار مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ (اسی لیے شاید ان کا نام باصر ہے) اُس عمل کے بارے میں مثبت رائے بھی رکھتے ہیں۔ اُس پر مستزاد یہ کہ منقلب ہوتی ہوئی حقیقتوں کے تکلیف دہ عمل کو اپنی قدرتِ فکر سے خوشگوار حیرت میں بدل دیتے ہیں۔ ہجرت کے تجربے کو باصر نے مندرجہ ذیل شعر میں جس طرح بیان کیا ہے وہ باصر کی شخصیت کے انہی چار پہلوؤں کی روشن مثال ہے: حقیقت پسندی (Realism)، غیر جانبدار قوتِ مشاہدہ، مثبت طرزِ فکر (Optimism) اور شگفتگیِ بیان۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

اس سے پہلے کہ باصر کی شاعری کے سب سے خوبصورت پہلو یعنی شگفتگیِ بیان کا ذرا تفصیلی جائزہ لیا جائے، مندرجہ بالا شعر میں موجود ندرتِ بیان کے ایک پہلو کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ حسنِ بیان کا تقاضا ہوتا ہے اور مدلّل گفتگو کی ضرورت بھی کہ دلیل پہلے دی جائے اور جس بات کی دلیل دی جائے وہ دلیل کے بعد کہی جائے، مگر باصر کے اس شعر میں نتیجہء کلام پہلے یعنی (دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل، وطن کوئی بھی ہو) اور دلیلِ کلام کو (یعنی پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو) بعد میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حسنِ کلام ماند نہیں پڑا بلکہ دوبالا ہو گیا ہے۔

اُردو شاعری میں ظریفانہ شاعری کی روایت کو علیحدہ رکھتے ہوئے اگر صرف سنجیدہ شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوداؔ کے شکوہِ بیان، آتشؔ کی رجائیت اور غالبؔ کی شوخی کے علاوہ زیادہ تر شاعری مخصوص تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے بموجب یا تو عاشق کی حالتِ زار کا نوحہ ہے یا ستمگر زمانے کے ہاتھوں برباد افراد کا ماتم ۔ چند مستثنیات کے علاوہ، جیسے نظیر اکبر آبادی، حالی اور اقبال، برِّصغیر کے مسلم معاشرے کے طبقہء شرفاء کی مخصوص متانت خود سپردگی اور اس سے وابستہ تپِ غم کو ایک ارفع عمل گردانتے ہوئے اُسی سے جڑی رہی (دبستانِ لکھنوء کی ریختی اور مرثیہ نگاری کے علاوہ)۔

یہی روایت بعد ازاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے ہوتی ہوئی غمِ ہجرت تک پہنچی، حتیٰ کہ ترقی پسند تحریک میں بھی مظلوم و مجبور عوام کی آہ و فغاں کے بیان سے آگے نہ بڑھ سکی۔ غالبؔ کی شخصیت ندرتِ احساس کے اُس بلند ترین مقام پر ہے جہاں اُس کی اُفتادگیِ طبع نے ذاتی زندگی کے مصائب اور 1857ء کے انقلاب کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کی دم توڑتی ہوئی تہذیب کے دُکھ کی آمیزش سے تخلیق پاتے ہوئے فلسفیانہ اسلوب کو شوخیء بیان سے ہمیشہ کے لیے تر و تازہ بنا دیا۔ ایسا اُسلوب قاری یا سامع کے لیے بہت مشکل ہونے کے باوجود بہت سہل بھی ہے اور بہت بوجھل ہونے کے باوجود پُرکشش بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دردانگیز ہونے کے باوجود لبوں پر ایک خفیف مگر بے ساختہ مسکراہٹ کا باعث بھی بنتا ہے۔ باصر نے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے اسلوب کی اس منفرد خصوصیت کو نہ صرف بہت شوق سے اپنایا ہے بلکہ اسے بہت کامیابی سے برتا بھی ہے۔ غالبؔ نے کہا:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اس شعر میں فلسفہ ہے، شوخی ہے اور انسانی نبض پر ہاتھ بھی۔ مگر غالب کے نزدیک تقاضائے فطرتِ بشریت کا مرکزی ملزم بہرحال انسان ہے۔ اس کے برعکس باصر کہتے ہیں:

اگر خدا نے نکالا بتوں کے چکر سے
طوافِ کعبہ کا اب کے برس ارادہ ہے
(چمن کوئی بھی ہو)

ذرا غور کیجیے تضادات پر۔ اگر ایک طرف بتوں کے چکر ہیں تو دوسری طرف طوافِ کعبہ ہے۔ بتوں کے چکر سے نکالنے کی ذمہ داری خدا کی ہے۔ طوافِ کعبہ میں فعل ارادی ہے، معروف ہے اور اب کے برس کی توانائی بھی اس میں موجود ہے جبکہ بتوں کا چکر غیر ارادی ہے، مجہول اور استمراری ہے یعنی کہ

جاری ہے، گویا اس سارے عمل میں حضرتِ انسان کی تمام تر کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود باصر انسان کو صاف بچا کر لے گئے اور الزام سارا مشیتِ خداوندی کے سر رہا۔

باصر کے ہاں آپ کو دورِ حاضر کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور اس سے وابستہ مجبوریوں کا بھرپور شعور نہ صرف موضوعات کے تنوع میں ملتا ہے بلکہ اسلوب کی بے ساختگی اور خالصتاً آج سے جڑے ہوئے الفاظ کے چناؤ میں بھی ملتا ہے۔ موضوع کوئی بھی ہو باصر شگفتگی بیان کا دامن بہر حال ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

رات کو کہتے ہیں کل بات کریں گے دن میں
دن گزر جائے تو سمجھو کہ گئی رات پہ بات

جب بھی ملے ہم اُن سے انہوں نے یہی کہا
بس آج آنے والے تھے ہم آپ کی طرف

اے دل یہ دھڑکنیں تری معمول کی نہیں
لگتا ہے آرہا ہے وہ فتنہ اِسی طرف

ہر بار تم کو اُس کا کہا ماننا پڑے باصرؔ
یہ دوستی تو نہیں نوکری ہوئی

حُسن وخوبی اک طرف اُس پر وفا بھی ختم ہے
دل کو بہلاتا ہے محبوبِ خیالی کس طرح

اگرچہ عشق نے اندھا کیا ہے
نظر میں ہیں تمہاری حرکتیں سب

ذرا سی بات پہ تیرا یہ حال ہے باصرؔ
ابھی تو میں نے بتایا نہیں تجھے کچھ بھی

مجنوں سے کہو کٹ چکی اِک عمر جنوں میں
باقی کسی معقول طریقے سے گذارے
(موجِ خیال)

تیسرے مجموعے، ہوائے طرب کی یہ غزلیں:

کر لیا دن میں کام آٹھ سے پانچ
اب چلے دورِ جام آٹھ سے پانچ

ہزار کہتا رہا میں کہ یار ایک منٹ
کیا نہ اس نے مرا انتظار ایک منٹ

بیٹھے رہیں گے وہ تو ہمیشہ دبا کے بات
ہم ہی کریں گے اُن سے کسی روز جا کے بات

اِسی مجموعے سے چند اور اشعار:

تین میں ہیں نہ اب وہ تیرہ میں
جو کبھی پہلے تین چار میں تھے

شاید یہی بہتر ہے ہو جائیں ہمیں سیدھے
قبل اِس کے کہ ماتھے پر اُس شوخ کے بل آئے

جانا کہ یہی ہوں گے مری جان کے درپے
کہتے نہیں تھکتے جو مری جان مری جان

باصرؔ بلا مقابلہ وہ منتخب ہوا
میری شکستہ پائی ہے محسن رقیب کی

بنا علاج بھی جیتے تھے اچھے خاصے ہم
مرض تو کچھ بھی نہ تھا مر گئے دوا سے ہم

اور چمن کوئی بھی ہو سے:

دوستی میں تو کوئی شک نہیں اُس کی پر وہ
دوست دشمن کا زیادہ ہے ہمارا کم ہے
صاف اظہار ہو اور وہ بھی کم از کم دوبار
ہم وہ عاقل ہیں جنہیں ایک اشارا کم ہے

عشق روتا ہے آٹھ آٹھ آنسو
حُسن سولہ سنگھار میں مصروف
ایک دشمن کی کمی تھی باصرؔ
وہ بھی اِک دوست نے پوری کردی

پھر یہ غزل:

کتنی ہی بے ضرر سہی تیری خرابیاں
باصرؔ خرابیاں تو ہیں پھر بھی خرابیاں
باصرؔ کی شخصیت بھی عجب ہے کہ اس میں ہیں
کچھ خوبیاں خراب کچھ اچھی خرابیاں

یہاں سادگی ہے، اختصار ہے، پُرکاری ہے، پھر خصوصی طور پر آخری شعر میں انسانی فطرت میں بیک وقت کارفرما متضاد خصوصیات کا صاف اور برملا اظہار ہے۔ جب بھی وہ یہ مقطع مشاعروں میں پڑھتے ہیں (اور یہ شعر اُن سے بار بار فرمائش کر کے سنا جاتا ہے) سامعین کے ذہن یک بیک پھول کی طرح کِھل جاتے ہیں، مطلعِ فکر پر تبسم کی کرنیں نمودار ہو جاتی ہیں اور شگفتگی کا ایک ایسا احساس Cathartic اور آسودگی بخش بندوبست، اس سے بہتر ممکن ہی نہیں۔

طبیعت میں جاگزیں ہو جاتا ہے جو دیر تک قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باصر کی شاعری آپ چاہے باصر کی زبانی سنیں یا کسی اور کی زبانی، آپ کا دل چاہے گا کہ سنتے ہی رہیں اور آپ کے لبوں سے بے ساختہ اور۔ اور۔ اور کچھ اور کی صدا بلند ہوتی رہے گی کہ بھاگتے دوڑتے زمانے میں فرصت کے چند لمحات کا اس قدر

بساط

میں اسے پڑھنے بیٹھا تو آخری لفظ تک پڑھے بغیر اس نے اٹھنے نہ دیا۔ معنی و خیال سے لبریز بلکہ چھلکتے ہوئے فقرے اس پوری کتاب کو (کہ ڈرامہ اس کا محض ایک حصہ ہے) سیر حاصل بناتے ہیں۔ یہ کتاب میرے لیے ایک تجربہ تھی کہ اس نے مجھے جھنجوڑا، چونکایا اور میرے پورے وجود کو نئے سرے سے سیراب کیا۔

سجاد باقر رضوی

بغاوت کا اعلان

باصر نے ایک کردار تخلیق کیا ہے جسے احساس ہے کہ میں اس نظام کو نہیں توڑ سکتا کیونکہ میں اکیلا ہوں، لیکن میں کم از کم اس نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان ضرور کر سکتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں باوجود اس کے کہ انفرادی سطح پر تم میں سے ہر ایک سے زیادہ باصلاحیت ہوں لیکن میں تم میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ اور جب تک کسی معاشرے میں ایک بھی ایسا فرد موجود ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں، اس کی نجات ممکن ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو بساط جو ایک دھیمی کتاب ہے، دراصل ایک انقلابی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایک معاشرتی اور سیاسی پیغام بھی ہے۔

محمد حنیف رامے

باطنی تجربہ

باصر کاظمی نے نثری ڈرامے کی کیفیتوں سے جس دنیا کو برآمد کیا ہے اسے خواب اور خیال کے باہمی تعلق سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بساط ایک ایسا تجربہ ہے جو انسان کے باطنی ڈرامے کو افراد کی شکل میں پہچاننے کی سعی کرتا ہے۔

جیلانی کامران

خوش قسمت باپ

یہ ڈرامہ ایک اعلیٰ درجے کا ادب پارہ ہے۔ خوش قسمت ہے وہ باپ جس کا کام تسلسل کے ساتھ اس کے بیٹے کے ذریعے جاری رہتا ہے اور سعادت مند ہے وہ بیٹا جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر باپ کے فکری اثاثے کے لیے اظہار کی نئی راہیں متعین کرتا ہے۔ باصر سلطان کاظمی نے اپنی اس پہلی تخلیق کی وساطت سے اپنی گہری سوچ اور نئی فکری جہتوں کی تلاش کے لیے ایک جذبہء بے باک کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

میرزا ادیب

عصری آگہی

بساط ایسے معدودے چند ڈراموں میں سے ہے جن کا فنی مرتبہ اور ادبی شکوہ دونوں متاثر کرتے ہیں۔۔۔ خیال کی ایک رو ہماری آنکھوں کے سامنے کہانی کا جزرومد آشکار کرتی ہے لیکن دوسری رو زیرِ سطح رہتی ہے اور نہ صرف ہمارے داخل میں کہرام برپا کرتی ہے بلکہ یہ حقیقت بھی آشکار کرتی ہے کہ اصل ڈرامہ تو کرداروں کی داخلی سطح پر ہی رونما ہوتا ہے۔ باصر سلطان کاظمی نے عصری آگہی کو زندگی کے سراب سے تلاش کیا ہے اور معاشرتی انسانوں کو اُن مہروں کے مماثل تصور کیا ہے جو زندگی کے جبر میں گرفتار طے شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

مہ و مہر کا نظام

انجم جاوید
(کراچی)

اُن کی شاعری میں کوئی پیچیدگی یا ابہام نہیں ہے۔ چونکہ یہ شاعری انسانی جذبات و محسوسات کی سطح تک پہنچ کر تخلیق کی گئی ہے سو اس میں گاہے گاہے ہلکے طنز کی رمق بھی ملتی ہے:

ایسی بھی کیا وحشت گھر سے
پھرا کرو گے گلی گلی پھر

بات بات پر یوں مت اُلجھو
سنو گے مجھ سے بری بھلی پھر

ہم بہت خوش تھے کہ جاگ اُٹھی ہے اپنی قسمت
آنے والا کسی ہمسائے کا مہماں نکلا

خاک میں کچھ کشش تو تھی ورنہ
پھول کیوں شاخ سے جدا ہوتا

باصِر کی شاعری میں سچائی ہے، آپ بیتی ہے، جگ بیتی ہے۔ ان تمام مشاہدات کا عکس اس کی شاعری میں سمویا ہوا ہے۔ کہتے ہیں سچا شخص اندر باہر سے آئینہ صفت ہوتا ہے۔ وہ منہ پر بات کرتا ہے اور اس میں اندر کے خلوص کی وجہ سے ضرورتاً تلخی بھی آجاتی ہے۔ باصِر کی شاعری میں یہ تلخی بڑے عجیب انداز میں ملتی ہے:

نہیں ہے وقت مِرے پاس ہر کسی کے لیے
مِری بلا سے وہ ہوتے ہوں آپ کے کچھ بھی

تیور بہت خراب تھے سنتے ہیں کل ترے
اچھا ہوا کہ ہم نے نہ دیکھا تِری طرف

اک تو ویسے ہی بد مزاج ہے وہ
اور اُس روز کچھ خفا بھی تھا

تیر تو بعد میں چلا باصِرؔ
تم نے پہلے ہی جان دے ڈالی

آیتیں تو ٹھیک ہی پڑھتی تھیں واعظ نے مگر
مدّعا اپنا بھی شامل کر دیا تفسیر میں

اچھا ہوا کہ بات بہت سرسری ہوئی
تھی ورنہ جانے کب سے طبیعت بھری ہوئی

رومان، عشق، محبت، انسانی حیات کا جزوِ لازم ہیں، سو باصِر کے ہاں بھی رومانی شاعری ملتی ہے مگر خاصے منفرد انداز میں، جس میں چاند کی ٹھنڈک بھی ملتی ہے اور چاندنی کا سرور بھی:

چاند بھی آ گیا شاخوں کے قریب
یہ نیا پھول کِھلا پھولوں میں

جس سے ملنے کو میں ترستا تھا
اُس نے خود مجھ سے بات کی ہے آج

خودسری اُس تندخو کی جاتے جاتے جائے گی
ایک ہی دن میں کبھی آتا نہیں ہے انقلاب

مجھ سے زیادہ خود پہ وہ کرنے لگا ستم
جانا ہے جب سے اُس نے مِری اُس میں جان ہے

باصِر اپنے تجربات کو جو کسی بھی انداز، کسی بھی رنگ کی صورت میں ملیں انہیں شاعری کے روپ میں کینوس پر سجا دیتا ہے۔ وہ مصوّر نہیں بن سکا لیکن اُسے شاعرانہ رنگوں کو کینوس پر بکھیرنے کا سلیقہ و ملکہ حاصل ہے۔ اُس کی شاعری کے کئی رنگ کئی روپ ہیں۔ طنزیہ رومانی شاعری کے رنگوں کے ساتھ ساتھ یہ آفاقی رنگ بھی اُس کی شاعری کا حصّہ ہے:

کہاں کی آہ و فغاں لب ہلا نہیں سکتا
وہ رات ہے کہ دیا بھی جلا نہیں سکتا

کچھ دکھائی نہیں دیتا ترے سودائی کو
دل کے بجھتے ہی یہ کیا ہو گیا بینائی کو

چشمِ کم سے دیکھتا ہے کیوں مِری چشمِ پُر آب
تیرے دل کی برف نے دیکھا نہیں ہے آفتاب

کہہ رہا تھا کتنی حسرت سے کوئی کیا فائدہ
اب کہ آنکھیں بند ہوتی ہیں کھلی ہے زندگی

یا تو اک لمحے میں ہو جائے طبیعت بیزار
اور لگ جائے تو بھرتا نہیں جی دنیا سے

تم بہت دیر سے بیکار ہوائے قلب وجگر
آؤ ملواؤں تمہیں ایک غمِ تازہ سے

دیارِ دل میں مہ و مہر کا نظام نہیں
یہ وہ جہاں ہے جہاں قیدِ صبح وشام نہیں

بزرگوں کی کہاوت ہے کہ کسی کو برتنا ہو تو اُس کے ساتھ طویل سفر اختیار کر و یا پھر اشد ضرورت کے تحت اُس سے مدد چاہو۔ اُس کا رویّہ بتا دے گا کہ وہ آپ کے ساتھ کتنا مخلص ہے یا کتنا چل سکتا ہے۔ اِس فلسفے کو، اِس سچ کو، اِس تجربے کو باصِر نے بڑے سلیقے سے بہ اندازِ طنز رقم کیا ہے:

چھوٹا سا ایک کام ہمارا نہیں کیا
باصِر تمہارے یار نے اچھا نہیں کیا

ویسے تو وہ دوست ہیں سبھی کے
کام آتے ہیں پر کسی کسی کے

پڑا ہے آج ہمیں ایک مطلبی سے کام
خدا کرے کہ اُسے ہم سے کام پڑ جائے

مجھے کرنی تو ہے کچھ بات مگر ایسے نہیں
آج لگتا ہے کسی بات کی جلدی ہے تجھے

مِل رہا ہے آج وہ جس طور سے
آپ نے دیکھا نہیں ہے غور سے

پھر اُس کے در پہ نظر آ رہے ہو باصِرؔ آج
تمہارا کام ابھی تک ہوا نہیں افسوس

ہر بار تم کو اُس کا کہا ماننا پڑے
باصِر یہ دوستی تو نہیں نوکری ہوئی

باصِر کاظمی کی شاعری پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ اُس نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اُس کی شاعری پر کسی بھی شاعر سے متاثر ہونے کی چھاپ نہ لگے اور اس میں باصِر کامیاب بھی رہا ہے۔ اُس نے اِسی دنیا، اِسی زمین کی بات کی ہے۔ اُس نے انتہائی نرمی، سادگی، لطافت اور سیدھے سیدھے لفظوں میں شاعری کی ہے، اپنا مطمع نظر پیش کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ:

کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے
جیسا لکھنا چاہا ویسا لکھا ہے

حقیقت بھی یہی ہے کہ باصِر نے جو لکھا، جو سوچا آزادی کے ساتھ اپنے پیرایۂ فکر و اندازِ نگارش میں رقم کر دیا۔ اس میں برجستگی بھی ہے، طنز بھی، خلوص بھی ہے اور اعتماد بھی:

جتنے بھی تیر تھے ترے ترکش میں چل چکے
مدّت سے تیرے ہاتھ میں خالی کمان ہے

دور رہتا ہے وہ دانستہ مِری محفل سے
ہے کوئی بات کہ جاتی نہیں اُس کے دل سے

باصِر کی ایک نعت میری نظر سے گزری ہے۔ عقیدت کی کیفیت کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں:

جنہوں نے روشنی پائی ترے پیمبر سے
سدا چمکتے رہے مہر و ماہ و اختر سے
وگرنہ مجھ کو تہی دامنی ہی زیبا ہے
کہ چاہیے مجھے خیرات ایک ہی در سے

دیارِ دل

بساط اردو ادب کے دو تین عظیم ڈراموں میں سے ایک ہے جس میں آپ کو پندو موجز کا فن اپنے کمال پر ملے گا۔۔۔ 'مانوس اجنبی' کی واردات سے متعارف ہونے کے بعد میرے دل نے کہا کہ ایسا ماورائی اور مافوق ڈرامہ تو مجھے لکھنا چاہیے تھا لیکن مانوس اجنبی نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی کہ تیرے پاس باصِر کا قلم نہیں ہے اور نہ ہی یہ تیری برات ہے۔۔۔ بساط اپنی طرز کا ایک انوکھا اور منفرد ڈرامہ ہے۔۔۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا ڈرامہ ہے جس سے تماثیل کی دنیا میں ایک نئے جادے کی دریافت ہوئی ہے۔

اشفاق احمد

بہشتِ ارض

جستجو: عطیہ سکندر علی (سکھر)

نِدائے آدم

جہانِ تازہ مرے دم قدم سے پیدا ہو
بہشتِ ارض پہ اُس کے کرم سے پیدا ہو
خوشی کی صبح شبِ تارِ غم سے پیدا ہو
سکون وسوسہء بیش و کم سے پیدا ہو
زبانِ تیشہ سے ایسے ہو کچھ بیانِ حُسن
اَذانِ عشق دہانِ صنم سے پیدا ہو
نظامِ کہنہ اگر چاہیے حیاتِ نَو
یہ وقت ہے کہ تُو میرے قلم سے پیدا ہو

(مئی 2006ء)

دفاع

گو صُلح اور امن سے بڑھ کر نہیں ہے کچھ
موزوں نہیں پیام یہ ہر ایک کے لیے
دشمن کو ڈھیل دی تو ہُوا سَر پہ وہ سوار
کلہاڑی اپنے پاؤں پہ ہرگز نہ ماریے
بادل کی طرح سایہ بھی دیں غیر کو ضرور
لیکن کبھی گرجنا برسنا بھی چاہیے

(اکتوبر 2006ء)

مشرق و مغرب

پھُول کسی گلشن میں کھِلے
یا کسی کے آنگن کی کیاری میں،
سڑک کے بیچ میں، یا
فٹ پاتھ پہ لگے ہوئے پودے میں،
اس کے رنگ وہی ہیں
اس کی مہک وہی۔

سُورج سُورج ہے
چاہے مشرق سے نکلے
چاہے مغرب سے۔

(اکتوبر 2006ء)

غزل کہتے ہیں

اُس کے آنے پہ غزل کہتے ہیں
اُس کے جانے پہ غزل کہتے ہیں
دھُوپ نکلے تو غزل ہوتی ہے
اَبر چھانے پہ غزل کہتے ہیں
ناشتے پر ہے غزل کا سامان
رات کھانے پہ غزل کہتے ہیں
مُہر ہم اپنے تخلّص کی لیے
دانے دانے پہ غزل کہتے ہیں
دل اُجڑنے پہ بہت شعر ہوئے
گھر بَسانے پہ غزل کہتے ہیں
منہ دکھائی میں غزل کا تحفہ
رُخ چھُپانے پہ غزل کہتے ہیں
نہیں لازم کہ کوئی زخم لگے
سَر کھُجانے پہ غزل کہتے ہیں
ہے کچہری کبھی موضوعِ سخن
کبھی تھانے پہ غزل کہتے ہیں
انقلابی ہوئے جب سے شاعر
کارخانے پہ غزل کہتے ہیں
اِس قدر سہل غزل کہنا ہے
سانس آنے پہ غزل کہتے ہیں
بیٹھ کر کُنجِ قفس میں باصر
آشیانے پہ غزل کہتے ہیں

(دسمبر 2003ء)

دوسری ہجرت

بابا، تم نے
اپنی آنے والی نسلوں کی خاطر
اپنے آبا کی قبروں کو چھوڑا تھا۔
ہم نے بھی ہجرت کی ہے
اپنی اولاد کے روشن مستقبل کے لیے۔

(اپریل 2007ء)

حفظ ماتقدم

کہااک بھیڑنے کچھ میمنوں سے
مرے پیارو، ہمیشہ ساتھ ریوڑ کے رہو۔
تمہارے دائیں بائیں آگے پیچھے کوئی ہو
جوڈھال کی صورت محافظ ہو۔

چراگاہوں سے باہر
جگمگاتے راستے تم کو بلائیں گے،
چمکتی لہلہاتی خستہ ہریالی لُبھائے گی،
تمہارے دل کو کھینچے گی۔
تم اپنے پاؤں اپنے ہاتھ میں رکھنا۔

نہ ہونے کو نہ ہو کچھ بھی
مگر ہونے کو ہوسکتا ہے کچھ بھی۔

سنو، ایسے کسی انجان رستے پر،
کسی بے دھیان لمحے میں،
اچانک بھیڑئے کردیں اگر حملہ،
دلِ دہشت زدہ میں ایک دہلاتی ہوئی خواہش
بصد حسرت اٹھتی ہے،
رگوں میں سنسناتی ہے،
یہ کہتی ہے کہ ہائے!
کاش اُن کتوں کی سُن لیتے
جو دن بھر بھونکتے تھے۔

(مئی2013ء)

اہلِ سیاست

ڈھونڈتے ہیں خلوص ہم کِن میں
ہے غرض اپنی ہی بھری جِن میں
آ گیا کُھل کے سامنے آخر
تھا جو پوشیدہ ان کے باطِن میں
کچھ تو تھے غیر کچھ ہمارے نہیں
فرق اتنا ہے اُن میں اور اِن میں

(8ستمبر2009ء)

عرض داشت

(وادی الملوک کے ایک کارکن کی)

مالک اگرچہ تُو ہے
رازق بھی تُو مِرا ہے
لیکن ترا یہ بندہ
اکثر یہ سوچتا ہے
یہ کیا کہ رزق میرا
فرعون سے جڑا ہے
یا مقبرے بنا کے
یا مقبرے دکھا کے

28دسمبر 2010۔ مصر کی وادی الملوک میں(انقلاب سے تین ہفتے قبل)

کشتیوں کے سوار (نثری نظم)

تم نے کہا:
''تم دوہری شہریت والے
دو کشتیوں کے سوار ہو،
ایک پاؤں ایک میں
دوسرا دوسری میں
گروگے۔''

سنو، تم بھی دو کشتیوں کے سوار ہو
فرق؟
تم خود تو اپنی کشتی میں سوار ہو
لیکن تمہارے اثاثے، کاروبار، اولاد
ہماری کشتی میں،
کیونکہ تم سمجھتے ہو
یہ زیادہ محفوظ ہے۔
اِدھر ہمارے جسم ہماری کشتی میں ہیں
لیکن ہمارا دل تمہاری کشتی میں۔
اس کی حفاظت کرنا۔

(2 جنوری2013)

مرو کے ایک نوجوان کی حکایت

(جس نے حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ کے حضور آ کر دشمنوں کے ستم کی فریاد کی)

(از "اسرار و رموز"، علاّمہ محمد اقبال)

سیّدِ ہجویرؒ مخدومِ اُمم
جس کا مرقد پیرِ سنجر کو حرم
چھوڑ کر کہسار آیا ہند میں
بیج بویا بندگی کا ہند میں
اُس سے تازہ ہو گیا عہدِ عمرؓ
حرف سے اُس کے ہُوا حق معتبر
پاسبانِ عزّتِ اُمّ الکتاب
خانۂ باطِل کیا جس نے خراب
خاکِ پنجاب اُس کے دم سے جی اُٹھی
صبح اُس کے مہر سے روشن ہوئی
تھا وہ عاشق قاصِدِ طیّارِ عشق
جس کے ماتھے سے عیاں اسرارِ عشق
اُس کی عظمت کی ہے یہ اِک داستاں
باغ کو غنچے میں کرتا ہوں نہاں
اِک جواں جس کی تھی قامت مثلِ سرو
وارِدِ لاہور شد از شہرِ مرو
سیّدِ والا کی خدمت میں گیا
تا کہ تاریکی ہو سورج سے فنا
اور ہُوا گویا کہ ہوں در دشمناں
جیسے مِینا پتھروں کے درمیاں
تُو سِکھا مجھ کو شہِ گردوں مکاں
زندہ رہنا دشمنوں کے درمیاں
پیرِ دانا ذات میں جس کی جمال
کر گیا عہدِ محبت با جلال
بولے اے ناواقفِ رازِ حیات
غافِل از انجام و آغازِ حیات
اور مت اندیشۂ اغیار کر
قوّتِ خوابیدہ کو بیدار کر
سنگ نے خود کو جونہی شیشہ کہا
بن گیا شیشہ ہی اور ٹکڑے ہُوا
راہرو گر خود کو سمجھا ناتواں
راہزن کو اُس نے دے دی اپنی جاں
آب و گِل سمجھے گا خود کو تا کُجا
شعلۂ طُور اپنی مٹی سے اُٹھا
تُو عزیزوں سے خفا رہتا ہے کیوں
دشمنوں کا تُو گِلہ کرتا ہے کیوں
سچ کہوں دشمن بھی تیرا دوست ہے
ہے ترے بازار کی رونق یہ شے
جانتا ہو جو مقاماتِ خودی
فضلِ حق جانے جو ہو دشمن قوی
کِشتِ انساں کے لیے بادل عدو
اُس کے اِمکانات کو بخشے نمو
سنگِ رَہ پانی ہے گر ہے حوصلہ
سیل کو پست و بلندِ جادہ کیا
مِثلِ حیواں کھانا پینا کس لیے
گر نہ ہو محکم تو جینا کس لیے
گر خودی سے خود کو تُو محکم کرے
چاہے تو دنیا کو پھر برہم کرے
خود سے ہو آزاد گر چاہے فنا
خود میں ہو آباد گر چاہے بقا
موت غفلت ہے خودی سے مہرباں
تُو سمجھتا ہے فراقِ جسم و جاں
صورتِ یوسف خودی میں کر قیام
قید سے تختِ شہی تک کر خرام
گم خودی میں ہو کے مردِ کار بن
مردِ حق بن حاملِ اسرار بن
داستانیں کہہ کے راز افشا کروں
غنچے کو زورِ نفس سے وا کروں
"ہے یہی بہتر کہ رازِ دِلبراں
دوسروں کے قصّے میں کیجیے بیاں"

(پیرِ سنجر: خواجہ معین الدّین چشتیؒ جو حضرت ہجویریؒ کے مزار پر تشریف لائے تھے۔)

- ڈرامہ -

نئی زندگی

باصر سلطان کاظمی

(یہ ڈرامہ اپریل 2008 میں اولڈہم لائبریری میں مصنف نے پڑھ کے سنایا۔انگریزی ترجمہ حاضرین میں تقسیم کیا گیا۔)

کردار:

شفیق احمد (عمر 62 سال) ایک متوسط گھرانے کا سربراہ
فہمیدہ احمد ((عمر 58 سال) شفیق کی بیوی
رفیق احمد (عمر 23 سال) ان کا بیٹا
مجید علی: رفیق کا ہم عمر دوست
مقام: مانچسٹر

☆

(نومبر 2007 کی ایک رات۔شفیق اور فہمیدہ اپنے گھر کے بیرونی کمرے میں صوفوں پر بیٹھے ہیں۔)

شفیق: بہت تنگ کیا ہے اس نے۔۔نالائق، نافرماں بردار۔۔۔

فہمیدہ: کیا ہو گیا ہے آپ کو؟

شفیق: غضب خدا کا۔آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور تمہارا برخوردار ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔نہ خود فون اٹھا رہا ہے نہ اُس کا کوئی دوست۔

فہمیدہ: میرا مطلب تھا اِس طرح ہلکان ہونے سے کیا فائدہ؟ کیا خبر کیوں دیر ہو گئی۔(ٹاؤن ہال کا گھنٹہ بارہ بجنے کا اعلان کرتا ہے۔) میں خود اتنی پریشان ہوں۔ایک ایک پل کانٹا سا چبھتا ہے۔کہتی ہوں بتا کے جایا کرو، کہاں جا رہے ہو، کب لوٹو گے۔

شفیق: پھر ایک دن کی بات ہو تو کوئی بات نہیں۔اس کا تو روز کا یہی قصہ ہے۔ہزار دفعہ سمجھایا ہے، پیار سے، ڈانٹ کر۔لیکن وہ چکنا گھڑا، کتے کی دُم؛ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ایک کان سے سنتا ہے، دوسرے سے نکال دیتا ہے۔

فہمیدہ: ابھی بچہ ہے، ناسمجھ ہے۔پھر بیکار ہے۔ملازمت مل جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔

شفیق: یہ نہیں کہتیں کہ تمہارے لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے۔لچے لفنگے دوست مل گئے ہیں۔سنیما بازی، ہوٹل گردی۔اور کچھ نہیں تو سڑکوں پہ بے مقصد گھوم رہے ہیں۔نہ حال کی خبر نہ مستقبل کی فکر۔ہونہہ۔ناسمجھ ہے! بیٹا چاہے بوڑھا ہو جائے، ماں کو اس کے منہ میں دودھ کی بوتل ہی نظر آتی ہے۔

(طویل وقفہ)

فہمیدہ: اور تمہارے وہ بیٹے تمہیں کیا دیتے ہیں جنہیں تم بڑا لائق فائق اور فرماں بردار بتاتے پھرتے ہو؟ کوئی کسی شہر میں کوئی کسی ملک میں۔کبھی ہوا فون کر دیا، کارڈ بھیج دیا۔یا کبھی ایک چیک، جیسے جوانی میں لیا ہوا قرض چکا رہے ہوں۔(وقفہ) سال دو سال بعد آ کے شکل دکھا دی اور بڑا احسان کیا۔ہونہہ۔

شفیق: میں اُن کے پیسوں کا بھوکا ہوں؟ میں اِس لیے تعریفیں کرتا ہوں اُن کی؟ میں محتاج ہوں اُن کا؟ (وقفہ) میرا اپنا گھر ہے، معقول پنشن ہے۔میں تو صرف اِسی میں خوش ہوں کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں، خوشحال ہیں۔زندگی میں باعمل اور فعال ہیں۔معاشرے میں کوئی مقام ہے اُن کا۔(وقفہ) اور مجھے رفیق سے بھی کیا چاہیے؟ کیا چاہیے مجھے اُس سے؟ یہ جو میں اُس کے لیے اتنا کڑھتا رہتا ہوں تو اُسی کی بھلائی کے لیے۔(وقفہ) بھئی ملازمت نہیں مل رہی تو کیا ہوا، مل جائے گی۔گریجویٹ ہے، اچھا طالب علم رہا ہے۔آگے پڑھ لے۔کوئی اچھا سا کورس کر لے، کوئی ٹریننگ لے لے۔اس کی بھی عزت ہو، مقام ہو۔مجھے کیا لینا ہے اُس سے؟

فہمیدہ: میں بتاتی ہوں کیا چاہیے تمہیں اپنے بیٹوں سے۔(وقفہ) تمہیں حکومت کرنے کا شوق ہے۔تم نے ساری عمر حکم چلایا ہے۔دفتر میں ماتحت اور گھر میں اور میرے بیٹے۔پھر بیٹے بڑے ہو گئے۔آزاد اور خود مختار۔لیکن تمہیں خراج بھیجتے ہیں۔اور تم اِس پر خوش ہو، اُن کی طرف سے مطمئن۔جو تم سے دور ہیں وہ زیادہ قریب ہیں کیونکہ تم ہر کسی سے جا بے جا اُن کا ذکر کرتے رہتے ہو، اُن کی اچھائی اور ترقی کے بارے میں مبالغے سے بھی کام لے سکتے ہو، کون تصدیق کرے گا؟ اور یہ بیچارہ، جو تمہارے پاس رہ گیا ہے، تمہارے غیظ و غضب کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔

شفیق: (کچھ بہتر موڈ میں) چلو تم نے شاکرہ کو تو میری رعایا میں شامل نہیں کیا۔اُس کے ساتھ تو میرا سلوک اچھا ہے نا؟

فہمیدہ: اُس کے ساتھ تو تمہارا سلوک سب سے برا ہے۔اُسے تو تم نے کبھی اپنی بیٹی سمجھا ہی نہیں، ہمیشہ پرایا دھن ہی سمجھا۔جیسے کسی نے اپنی بیٹی تمہیں پالنے کے لیے دے دی ہو۔وہ اپنے باپ کے سائے میں یتیموں کی طرح پلی ہے۔

شفیق: یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا کہہ رہی ہو تم؟

فہمیدہ: میں کبھی نہیں بھول سکتی تمہارا وہ جملہ جو تم نے شاکرہ کی پیدائش پہ کہا تھا۔(وقفہ) تمہیں تو یاد نہیں ہو گا۔(وقفہ) تم نے کہا تھا: اچھا ہے، اچھا ہے۔ It's good, it's good! بیٹی بھی ہونی چاہیے تھی، تاکہ میرے بیٹوں کو نظر نہ لگے۔(وقفہ) اور تمہارا وہ خبیث دوست۔۔۔میں نے کوشش کر کے اُس کا نام بھلایا۔(وقفہ) میں نے تمہیں تو احساس نہیں ہونے دیا لیکن اُس دن کے بعد میں کبھی اُس کے سامنے نہیں گئی۔(وقفہ) اُس نے تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تھا: ہاں بھئی، بے شک آدمی کی کمائی تو بیٹے ہی ہوتے ہیں، لیکن مال پہ زکوٰۃ بھی تو دینی چاہیے۔

(طویل وقفہ)

شفیق: (دھیمی آواز میں) وہ۔۔۔فہمیدہ۔۔۔میں۔۔۔مجھے۔۔۔(ایک کار کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دیتی ہے، قریب آتی ہے لیکن بند ہونے کی بجائے آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے۔) یہ اُس کے کسی دوست کی کار نہیں تھی۔ (وقفہ) کچھ کھانے کو ہے؟

فہمیدہ: اِس وقت؟

شفیق: شام کچھ ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔اب نقاہت محسوس ہو رہی ہے۔ (فہمیدہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتی ہے اور کچھ دیر بعد ایک ٹرے میں کھانے کی چیزیں لا کر میز پہ رکھتی ہے۔)

فہمیدہ: اِس وقت جیم ٹوسٹ ہی کافی ہوں گے۔کچھ پھل بھی ہیں لیکن رات کو نہ ہی کھاؤ تو اچھا ہے۔(کھانے کے دوران شفیق کا ہاتھ لگنے سے ایک پلیٹ فرش پہ گر جاتی ہے۔

شفیق: لاحول ولاقوۃ۔دماغ خراب کر دیا ہے اِس لڑکے نے میرا۔مر جاتا تو اچھا تھا۔میں رو پیٹ کے صبر کر لیتا۔یوں پارے کی طرح بے چین تو نہ ہوتا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کے) کاش یہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

فہمیدہ: کیا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو؟

شفیق: میرے کچھ کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔دیکھ لینا اس کا انجام بہت خراب ہوگا۔

فہمیدہ: (روہانسی ہو کر) میں کہتی ہوں ایک لفظ بھی اور منہ سے نکالا تو۔۔۔ اللہ نہ کرے اس کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا تو آگ لگا دوں گی اس گھر کو۔(وقفہ) ویسے اِس گھر میں اب ہے کیا۔(وقفہ) تمہارے جیسا بے رحم باپ بھی نہیں دیکھا۔ (وقفہ) دنیا کہتی ہے کہ لڑکا ہو تو رفیق جیسا۔۔۔اور تم۔۔۔ناشکرے۔۔۔

شفیق: چراغ کچھ فاصلے پہ ہو تو روشنی ہے، قریب ہو تو شعلہ، جو جلا کے خاک کر دیتا ہے۔(وقفہ) دریا ساری دنیا کے لیے آبِ حیات ہے لیکن اپنے کناروں کے لیے۔۔۔دودھاری تلوار۔

فہمیدہ: لیکن کنارے ہی تو دریا کو دریا بناتے ہیں۔اُس کی روانی، اُس کی قوت کناروں ہی کی دین تو ہیں۔

شفیق: تو جان لو کہ پانی کناروں سے چھلک چکا ہے۔کچھ دیر اپنا جوش دکھانے کے بعد خاک کا رزق ہو جائے گا۔

فہمیدہ: تمہارے منہ میں خاک۔واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے۔جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔مجھے تنہا چھوڑ دو۔چلے جاؤ یہاں سے۔(شفیق کوئی جواب نہیں دیتا۔کچھ دیر بعد اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے۔کھڑکی کھولتا ہے۔ایک کتے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ٹھنڈی ہوا اندر آتی ہے۔کھڑکی بند کر دیتا ہے۔)

شفیق: کتا۔

فہمیدہ: یا اللہ خیر۔مجھے تو طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں۔کتنی بار تم سے کہا ہے اتنا چڑچڑا پن اچھا نہیں۔تمہاری طبیعت پہلے ہی اچھی نہیں رہتی۔کیوں خون جلاتے رہتے ہو؟ (شفیق آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کے اوپر سونے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔طویل وقفہ۔دروازے پر آہستگی سے دستک ہوتی ہے۔فہمیدہ فوراً اٹھ کر دروازے کے پاس جاتی ہے۔) کون؟ (باہر سے مجید نیچی آواز میں اپنا نام بتاتا ہے۔فہمیدہ جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیتی ہے۔مجید اندر آتا ہے۔فہمیدہ خوف اور حیرت سے اسے دیکھتی ہے۔طویل وقفہ)

مجید: وہ۔۔۔آنٹی۔۔۔رفیق

فہمیدہ: (تقریباً چیخ کر) کیا ہوا رفیق کو؟

مجید: (ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے) کچھ نہیں ہوا رفیق کو۔باہر کھڑا ہے۔

فہمیدہ: باہر کھڑا ہے؟ اندر کیوں نہیں آتا؟ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) رفیق! (رفیق آہستگی سے اندر آ جاتا ہے)

مجید: یہ ڈر رہا تھا۔آج کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔دراصل ہم فلم دیکھنے چلے گئے تھے۔(وقفہ) دیکھنا تو شام کا شو تھا، لیکن بس۔۔۔کچھ دوستوں نے گڑبڑ کر دی۔۔۔ہم بہت شرمندہ ہیں آنٹی۔آیندہ خیال رکھیں گے۔

فہمیدہ: بیٹا، ایک چھوٹا سا فون تو کر دیتے۔

رفیق: آئی ایم سوری۔۔۔امی۔۔۔ویری سوری۔

مجید: میں چلتا ہوں۔

فہمیدہ: (اپنے آپ میں آتے ہوئے) بیٹھو بیٹا۔تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے؟

رفیق: امی، آج تو بڑا زبردست ڈنر کھایا ہے ہم نے۔ایک دوست نے پارٹی دی تھی۔ملازمت ملنے کی خوشی میں۔۔۔اور اُس کی منگنی بھی ہو گئی ہے۔۔۔ آج اُسے پہلی تنخواہ ملی تھی۔

مجید: اچھا جی، مجھے اجازت۔خدا حافظ۔

فہمیدہ: خدا حافظ بیٹا! (مجید چلا جاتا ہے۔)

رفیق: امی۔۔۔وہ۔۔۔ابو سو گئے؟

فہمیدہ: یہ تو صبح کو پتہ چلے گا۔

رفیق: (آواز نیچی کر کے) کیوں امی، کیا ہوا؟

فہمیدہ: بہت پریشان تھے۔بہت ناراض۔

رفیق: اوہ!

فہمیدہ: جاؤ، کپڑے بدلو اور سو جاؤ۔

رفیق: آپ بھی سو جائیں اب۔

فہمیدہ: ہاں۔(رفیق اوپر چلا جاتا ہے۔وقفہ۔شفیق سیڑھیوں پہ نمودار ہوتا ہے، نیچے آ جاتا ہے) تم جاگ رہے ہو ابھی تک؟

شفیق: (آواز میں غصے کے ساتھ اطمینان بھی ہے) آ گیا نامعقول؟

فہمیدہ: بس کرو۔اب جانے دو۔آ گیا ہے۔بہت شرمندہ ہے۔اُس نے وعدہ کیا ہے کہ آیندہ ایسا نہیں کرے گا۔ایک دوست کو بھی لایا تھا سفارش کے

لیے۔وہ بھی شرمسار تھا۔

شفیق: یہ ڈرامہ وہ پہلے بھی کئی بار کر چکا ہے۔(وقفہ) خیر۔

فہمیدہ: تم سوجاؤ۔دیکھو کتنی رات ہوگئی ہے۔

شفیق: میں سو ہی گیا تھا۔لیکن پھر آنکھ کھُل گئی۔اب نیند نہیں آرہی۔تم سو جاؤ جاکے۔

فہمیدہ: دیکھو پریشان نہ ہوا کرو۔تمہارے لیے اچھا نہیں۔رفیق کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔تعلیم ہم جتنی دلا سکتے تھے دلا دی۔آگے پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔ اب اُسے اپنے فیصلے خود کرنے دو۔تمہاری رہنمائی کی ضرورت اُسے ہے،صرف مشوروں کی حد تک۔اپنے تجربے اور مشاہدے اُسے بتاتے رہو۔زندگی کی اونچ نیچ سمجھاؤ لیکن اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔

(طویل وقفہ)

شفیق: میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم تو وہیں آگئے جہاں سے چلے تھے، جب ہم صرف ایک بچے کے ماں باپ تھے۔جسے ہم دیکھ دیکھ کے جیتے تھے لیکن جو ہمیں دن رات بے آرام بھی رکھتا۔ہم راتوں کو انتظار کرتے کہ وہ سو جائے تو ہم سوئیں۔(وقفہ) تو کیا ہم اِس لیے اولاد پیدا کرتے ہیں اور انہیں پالنے پوسنے میں لگے رہتے ہیں کہ ہمیں اور کوئی کام نہیں ہوتا؟

شفیق: ہاں۔سوچنے کی بات ہے۔ان کی غیر موجودگی میں ہماری زندگی کے خلا کو کیا چیز پورا کرے؟ ہم کیا کرتے فہمیدہ؟ یہ چھتیس برس کیسے گزرتے؟

فہمیدہ: اِس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جو دس بیس برس باقی ہیں۔۔۔اگر باقی ہیں۔۔۔وہ کیسے گزریں؟ شفیق، ہم نے اپنا سارا وقت، ساری توانائیاں اولاد پہ صرف کر دیں۔انہیں ان کی ضرورت سے زیادہ دیتے رہے۔اپنا حق خود مارتے رہے۔اپنے لیے کچھ بھی نہیں کیا، کچھ بھی نہیں چھوڑا۔(وقفہ) جب ان کے کپڑے تنگ ہوجاتے، قد بڑھتے، جب وہ ایک جماعت سے دوسری میں چڑھتے تو ہم سمجھتے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔لیکن ہم تو وہیں کے وہیں رہتے، اور آج بھی وہیں ہیں۔

شفیق: لیکن بہت مختلف۔تب کتنی ترنگ تھی، کیا کیا امیدیں تھیں، کیسا جوش وخروش تھا۔ساری زندگی سامنے پڑی تھی۔اُس لذیذ کیک کی طرح جس کا زیادہ حصہ ابھی باقی ہو۔(ٹھنڈی سانس بھر کے) اب تو آخری لقمے ہیں۔

فہمیدہ: اگر کھانا لذیذ ہو تو آخری لقمے زیادہ شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ انگلیاں تک چاٹی جاتی ہیں۔(وقفہ) آؤ اِس آخری حصے کو اِیسے گذاریں کہ ہمارے ماضی کو ہمارے حال پہ رشک آئے۔تمہیں یاد ہے جب ہماری شادی ہوئی تھی تو سب نے کہا تھا ''نئی زندگی مبارک۔!نیا سفر مبارک!'' اور اگر ہم آج اپنے آپ کو اُسی مقام پر پاتے ہیں۔۔۔تو چلو، ایک نئی زندگی شروع کریں۔ایک نئے سفر کا آغاز کریں۔اپنے پرانے دوستوں کو ڈھونڈیں۔ پرانی محفلیں تازہ کریں۔کیا ہوا جوانی نہیں رہی تو؟ جوانی کے مسائل بھی تو نہیں رہے۔اب ہم زیادہ فارغ البال اور آزاد ہیں۔(وقفہ) چلو صبح بات کریں گے۔اب سوجاؤ۔

شفیق: میں نے کہا نا مجھے نیند نہیں آرہی۔

فہمیدہ: آئے گی۔تمہیں یاد ہے جب تمہیں نیند نہیں آیا کرتی تھی تم کہا کرتے تھے: ''میرے بالوں میں کنگھی کرو، اپنی انگلیوں سے۔'' اور تمہیں فوراً نیند آجایا کرتی تھی۔آج بھی آئے گی۔(مسکراتی ہے۔شفیق بھی مسکراتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں، مسکراتے رہتے۔)

(پردہ)

بنت کے ماہر

باصر سلطان کاظمی اپنے اس پہلے ڈرامے میں ہی ڈرامے کی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ بات کہنے میں ہنرمندی، کرداروں پر مضبوط گرفت اور لفظوں کی پہچان اور بنت کے ماہر باصر سلطان کاظمی کے اس ڈرامے میں مجھے دوہری پرت دکھائی دی ہے اور جو کچھ وہ بین السطور کہنا چاہتے تھے قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہیں۔

یونس جاوید

خوبصورت مکالمے

ڈرامے کے میدان میں باصر کاظمی ایک مانوس اجنبی کی طرح داخل ہوا ہے۔راتوں کو جاگنے والے آدمی کی صفات رکھنے والا یہ نوجوان درویشی اور فقیری کے سفر پر تنہا نکلا ہوا ہے۔۔۔باصر نے اس لیے یہ بساط نہیں بچھائی کہ وہ ہارے یا جیتے۔وہ کچھ اور چاہتا ہے۔رامبو نے کہا تھا زندگی کو بدلو اور زندگی ذات کو بدلے بغیر نہیں بدل سکتی۔۔۔ جتنے خوبصورت مکالمے باصر کے ڈرامے میں پڑھنے کو ملے ہیں وہ ہماری زندگی میں کہیں سنائی نہیں دیتے۔ ایسی باتیں کرنے والا کسی اور دنیا کا باسی سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

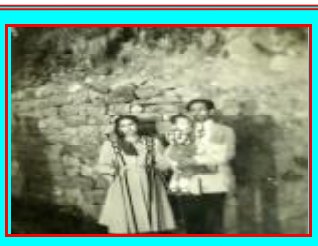

مری ہلز میں والدین کے ہمراہ (۱۹۵۵)

جشن برٹش شاعری کے موقع پر ملکہ برطانیہ کے ساتھ (۲۰۱۳ء)

والدین اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ مری ہلز (۱۹۶۵ء)

محمد حنیف رامے اور شیخ صلاح الدین کے ہمراہ (۱۹۸۶ء)

عبدالحفیظ پیرزادہ سے سیکرٹری اسٹوڈنٹ یونین کا حلف (۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر دیبجانی، سمن فلیچر اور پیٹ کالو کے ہمراہ (۲۰۱۴ء)

اوسلو۔ جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر ساجد علی کے ہمراہ (۲۰۱۴ء)

شہزادہ چارلس سے ایم بی ای ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے (۲۰۱۴ء)

احمد مشتاق، راجیش ریڈی و دیگر دوستوں کے ہمراہ ہوسٹن مشاعرہ (۲۰۱۷ء)

کراچی آرٹ کونسل مشاعرہ (۲۰۱۸ء)

ڈاکٹر فرزانہ باصر واسطی (اہلیہ) کے ہمراہ (۲۰۱۸ء)

حلقہ اربابِ ذوق کراچی انور شعور کے ساتھ (۲۰۱۵ء)

بریڈفورڈ۔ ''شجر ہونے تک'' کی تقریب رونمائی (۲۰۱۵ء)

جشن بہار مشاعرہ دہلی۔ انور مسعود، زہرہ نگاہ، وسیم بریلوی (۲۰۱۲ء)

فیض فیسٹیول لاہور میں ساحرہ ہاشمی اور دیگر شعراء (۲۰۱۹ء)

مکتبِ عرفان

نعت رسولِ مقبولؐ

ناز قسمت پہ اپنی نہ کیونکر کروں ، مَیں مدینے میں ہوں
کیوں نہ کہتا رہوں، مَیں مدینے میں ہوں، مَیں مدینے میں ہوں

دِل پریشاں نہیں، کوئی دُنیا کی اب فِکر لاحق نہیں
کیا کہوں، کِس قدر مِل رہا ہے سکوں، مَیں مدینے میں ہوں

اُن کی خدمت میں حاضر ہؤا ہوں تو اب اَور کرنا ہے کیا؟
نعت اُن کی لکھوں، نعت اُن کی پڑھوں، مَیں مدینے میں ہوں!

مِدحتوں کا ہے سیلِ رواں اور مَیں ، اور پھر یہ بیاں !
مَیں مدینے میں ہوں، مَیں مدینے میں ہوں، مَیں مدینے میں ہوں

جی یہی چاہتا ہے کہ واپس نہ جاؤں یہاں سے کبھی
آخری سانس تک مَیں یہیں پر رہوں، مَیں مدینے میں ہوں!

ٹھیرنا قافلے والو ، چلتا ہوں مَیں ، اِک ذرا ٹھیرنا
اُن کے روضے کو پھر اِک نظر دیکھ لوں، مَیں مدینے میں ہوں!

لوٹ کر بھی مدینے سے طاری ہیں اب جیسی سرشاریاں
فرق پڑتا ہے کیا، مَیں کہیں بھی رہوں مَیں مدینے میں ہوں!

پہلی فرصت میں جاؤں گا مَیں پھر مدینے نسیمِ سحَر
تا کہ مَیں پھر مسلسل یہی کہہ سکوں، مَیں مدینے میں ہوں!

نسیم سحر (راولپنڈی)

نعتِ رسول مقبولؐ

سلیقہ زندگی کرنے کا بھی وہیں سے ملا
جو فیضِ دیں مجھے محبوبِ عالمیں سے ملا
بفیضِ گنبدِ خضریٰ ہیں ایک ارض و سما
یہ آسمان ہے اور آسماں، زمیں سے ملا
مری نگاہ رسولِ امیں کے در پر ہے
سُراغِ صبح زمانے کو بھی وہیں سے ملا
بفیضِ شاہِ اُمم ذوقِ نعتِ سرورِ دیں
ملا تو مکتبِ عرفان و علمِ دیں سے ملا
نگاہِ سرورِ دیں سے بدل گئی قسمت
کہ بختِ مطلعِ انوار اُس جبیں سے ملا
مرے خیال، مرے فکر و فن کا سوز مجھے
نَفَس نَفَس اُسی ریحانِ عنبریں سے ملا
مثالِ شعلہ دہکتے تھے میرے روح و بدن
سکونِ دل مجھے آقائے شبنمیں سے ملا
دُھواں دُھواں تھی فضا اور تیرگی تھی بہت
جہاں کو حُسن مگر حُسنِ عنبریں سے ملا
رواں ہے نبضِ دوعالم میں مرسَل سے
نشاطِ روح کا ساماں اِسی یقیں سے ملا
دل و نظر کو وہی روشنی دکھاتا ہے
خیالِ صدق جسے صادق و امیں سے ملا
مرے شعور کو بخشیں لطافتیں کیا کیا!
بیاں کا سارا قرینہ اُسی جبیں سے ملا
مرے حضور کی رحمت کے ہی سبب سے ہے
سکوں جو مجھ کو ہمیشہ دلِ حزیں سے ملا
یہ عجز و فقر کی دولت، سکونِ قلبِ ملول
زہے نصیب کہ اُس بوریا نشیں سے ملا
خُدا کا آخری پیغام بھی نبیل ہمیں
دیارِ طیبہ کے پیغام آفریں سے ملا

نبیل احمد نبیل (لاہور)

''وقت یہ ٹل جائے تو۔۔۔''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

''مِس آپ ابھی تک گھر نہیں گئیں۔۔۔؟ بہت دیر ہوگئی ہے سارا اسکول خالی ہوگیا ہے۔''

چوکیدار اکرم خان نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اوہ! کام میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔'' میں نے جلدی جلدی سارے پیپر سمیٹے اور لاکر میں رکھ کر گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ جاتے ہوئے میں نے دیکھا واقعی پورا اسکول خالی تھا صرف چند بچے لان میں گاڑی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اسکول کے باہر گلی میں بالکل سناٹا تھا میں تیز تیز چلتی ہوئی روڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کوئی گاڑی میرے نزدیک آ کر رکی ہے، میں نے اپنی رفتار مزید تیز کردی۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا۔

''مس سحر'' میری سماعت میں یہ آواز آئی اور میں نے محسوس کیا کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے۔

''یہ آواز تو سر ہاشم کی ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا سر ہاشم میرے پیچھے کھڑے تھے۔

آپ کہاں جا رہی ہیں، اور آپ کی گاڑی کہاں ہے۔'' سر ہاشم نے پوچھا۔

''میر گاڑی میکینک کے پاس ہے اور میں روڈ کی طرف جا رہی ہوں وہاں کوئی نہ کوئی رکشہ مل جائے گا۔''

''آیئے! میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔''

''نہیں آپ تکلیف نہ کریں مجھے رکشہ مل جائے گا۔ صبح بھی میں رکشے پر ہی آئی تھی۔''

''شہر میں زبردست ہنگامہ ہے۔ اس لیے پورا شہر بند ہوگیا ہے۔ آپ کو رکشہ بس کچھ نہیں ملے گا۔ سامنے روڈ کی طرف دیکھیے آپ کو کوئی ٹریفک نظر آ رہا ہے۔''

ہنگامے کا سن کر میں پریشان ہوگئی روڈ کی طرف دیکھا تو واقعی کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ یا اللہ یہ کیسی مشکل آ گئی۔ اگر رکشہ یا بس کچھ نہ ملا تو میں گھر کیسے پہنچوں گی۔ ایک لمحے میں یہ تمام خیالات میرے ذہن میں آئے اور خوف کی وجہ سے میرے جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔ آیئے! آپ سوچ کیا رہی ہیں۔ ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہیے۔ سر ہاشم نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اسکول میں کچھ بچے ہیں، ان کا کیا ہوگا'' میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بات کر لی ہے۔ ان کی گاڑی آنے والی ہے۔ ویسے بھی وہ ڈیفنس کے بچے ہیں۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔''

''سر ہاشم نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

اپنے آپ کو ہاشم کے اتنے نزدیک محسوس کر کے بار بار میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو نارمل کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ہنگاموں کی وجہ سے خوفزدہ بھی تھی۔

''یہ ہنگامے کیوں ہو رہے ہیں۔ کوئی وجہ معلوم ہوئی۔'' میں نے اپنی توجہ دوسری طرف کرنے کی کوشش کی۔

''وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ برسرِ اقتدار پارٹی والوں نے دوسری پارٹی کے کسی بندے کو مار دیا ہوگا یا گرفتار کرلیا ہوگا کسی ان کے اہم بندے کو۔ یا برسرِ اقتدار پارٹی کا کوئی اہم شخص اغوا کرلیا گیا ہوگا۔ بس یہی سب چلتا رہتا ہے۔ ملک کا اور ملک کے لوگوں کا کوئی سوچتا ہی نہیں۔'' سر ہاشم نے میری طرف دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''آج آپ کے ساتھ مِس سُمن نہیں تھیں۔ وہ اور آپ تو ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ آتے جاتے بھی ساتھ ہی ہیں۔''

''سُمن میری اچھی دوست ہے۔ اس کا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے اس لیے میں اسے لے لیتی ہوں۔ آج اس کے گھر کوئی پوجا تھی اس لیے وہ نہیں آئی۔''

''یہ تو بتایئے جانا کہاں ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''آپ صحیح جا رہے ہیں، اب آپ کریم آباد کی طرف موڑ لیجیے اور وہاں سے سپر ہائی وے پر آ جایئے۔ پھر عائشہ منزل پر الٹے ہاتھ پر موڑ لیجیے، اسی روڈ پر ہمارا گھر ہے۔'' میں نے پورا راستہ بتا دیا۔

''لیجیے! آپ کی منزل آ گئی۔'' گھر کے سامنے گاڑی کھڑے کرتے ہوئے ہاشم نے کہا۔

''آپ کہاں جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''گلشن''

گھر پہنچ کر فون کر دیجیے گا، میں نے ایک چھوٹا سا پرچہ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''اسمارٹ'' انہوں نے پرچے کو دیکھنے کے بعد مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پرچہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر بولے:

''آپ نے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔''

''آیئے اندر آیئے۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''چلیے ادھار رہی۔'' یہ کہہ کر ہنستے ہوئے گاڑی موڑی اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ امّی برآمدے میں پریشانی میں ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

''شکر ہے تم خیریت سے پہنچ گئیں۔ میں اتنا فون کر رہی تھی تم فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں۔ اور آئی کیسے ہو۔ گاڑی صبح لے کر نہیں گئی تھیں، ٹریفک تو بالکل بند ہے۔'' امّی نے جلدی جلدی اتنے سارے سوالات کر ڈالے۔

امّی! مجھے سر ہاشم اپنی گاڑی میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ اور فون چارج نہیں تھا اس لیے آپ کی کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔''

میں نے پیار سے امّی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں تسلی دی۔

امّی! نور کالج سے آ گئی۔'' میں نے فکرمندی کے لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو آج گئی ہی نہیں۔'' امّی نے کہا۔

میں نے کہا شکر ہے اور اطمینان کا سانس لیا۔

اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی، آج کے واقعے کے متعلق سوچنے لگی۔

''آج ہاشم نے مجھے کتنی بڑی پریشانی سے بچا لیا۔''

سر ہاشم سے پہلی مرتبہ Staff Meeting میں ہمارا تعارف ہوا تھا وہ کمپیوٹر ٹیچر کے طور پر چند ماہ پہلے اپائنٹ کیے گئے تھے۔ میں نے جب پہلی مرتبہ ان پر نظر ڈالی وہ مجھے بہت اچھے لگے، ان کا بات کرنا، مسکراتے ہوئے ہر بات کا جواب دینا، سب بہت اچھا لگا۔ ''ایسا لگا جیسے میں ان کو بہت پہلے سے جانتی ہوں، وہ مجھے بہت اپنے اپنے سے لگے۔''

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ مجھے تو آج تک کوئی مرد بھی پسند نہیں آیا۔ امّی رشتوں کے سلسلے میں تصویریں دکھاتیں، مگر مجھے کوئی بھاتا ہی نہیں تھا۔۔۔ میں امّی سے کہتی ''امّی آپ خود ہی دیکھ لیں۔ آپ جس سے کہیں گی میں شادی کر لوں گی۔''

اور پھر میں سر ہاشم کے بارے میں جانتی ہی کیا ہوں؟ یہ سب سوچ کر مجھے خود پر ہنسی آ گئی۔ اپنے خیالات کو جھٹک کر میٹنگ کی بات چیت میں شامل ہو گئی۔

اسکول میں سر ہاشم سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، اسکول کے پروگرامز کے سلسلے، کبھی میگزین کے سلسلے میں، کبھی میٹنگز وغیرہ میں۔۔۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ مگر میں نے کبھی خود سے آگے بڑھ کر ان سے بات نہیں کی۔ ہمارا تعلق کام کی حد تک رہتا تھا۔

دو دن کے بعد شہر کھل گیا۔ زندگی کے حالات بھی نارمل ہونے لگے۔ کتنے بے گناہ زندگی کی بازی ہار گئے۔۔۔ کتنے لوگ زخمی ہوئے۔۔۔ کتنے غریبوں کی روزی ختم ہو گئی۔۔۔ کتنے گھروں کا سکون برباد ہو گیا۔۔۔ اور ہمارا پیارا ملک، وہ تو اور پیچھے چلا گیا۔۔۔ مگر کسے پروا۔۔۔؟

میں چھٹی کے بعد پارکنگ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی ہاشم اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے مجھے کھڑا دیکھ کر میری طرف آئے۔

''آپ کیسے کھڑی ہیں؟'' پوچھنے لگے۔

''سمن کا انتظار کر رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

ہاشم خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھے پر فوراً ہی پلٹے اور بولے:

''آپ پر چائے ادھار ہے۔''

''جی بالکل! مجھے یاد ہے۔ آپ آیئے نا کسی دن گھر''

''پرسوں سنڈے ہے۔ شام ۶ بجے ٹھیک رہے گا۔''

''ہم آپ کا انتظار کریں گے۔'' میں نے کہا۔

سر ہاشم وقت کے پابند نکلے، صحیح وقت پر پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا، امّی بھی آ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد نور بھی آ گئی۔ ابتدائی تعارف کے بعد باتیں شروع ہو گئیں۔ شہر کے حالات، ملک کے حالات پر بھی بات ہوئی۔ امّی نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ''ہنگامے والے دن انہوں نے مجھے خیریت سے گھر پہنچا دیا۔'' بیچ بیچ میں امّی نے ان کے اور ان کے گھر والوں کے متعلق پوچھا۔ نور بھی خوب بول رہی تھی۔ میں چائے لے کر آئی، ٹرالی دیکھ کر کہنے لگے ''میں نے تو آپ سے چائے کے لیے کہا تھا اور آپ اتنی ساری چیزیں لے آئیں۔ شاہی ٹکڑے، کباب، بروسٹ، لزانیہ، دہی بڑے، پھل، بسکٹ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟ ہنس کر بولے آپ نے تو ڈنر کا انتظام کیا ہے۔

''سحر بہت اچھی Cooking کرتی ہے۔ آپ کو ہر چیز پسند آئے گی۔'' امّی نے کہا۔

سر ہاشم نے ہر چیز چکھی اور بہت تعریف کی۔ پھر سب نے چائے پی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ سر ہاشم سے پہلی ملاقات ہے۔ میں بہت کم بول رہی تھی۔ کسی کسی بات میں حصّہ لے لیتی تھی۔

سر ہاشم کہنے لگے ''میں تو سمجھتا تھا آپ صرف اسکول میں کم بولتی ہیں۔''

''آپی ہر کام بہت احتیاط سے کرتی ہیں۔ بولتی بھی بہت احتیاط سے ہیں'' نور ہنستے ہوئے بولی۔

ہاشم نے گھڑی دیکھی۔ ارے اتنا وقت ہو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر امّی سے اجازت چاہی۔۔۔ اور جاتے جاتے کہنے لگے ''آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں کوئی بات ہو، کوئی کام ہو بلا تکلف مجھے بلوائیں۔'' امّی نے انہیں بتایا کہ بھائی دوبئ میں ہیں۔ یہاں ہم تینوں ہی ہیں۔''

''امّی نے دعائیں دیں اور کہا۔۔۔ آپ آتے رہیے گا۔۔۔''

میں بہت خوش تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔۔۔ سر ہاشم امّی کو بتا رہے تھے ''ایک سال پہلے ان کی ڈگری مکمل ہوئی ہے۔ انہوں نے امریکہ اور کینیڈا میں جاب کے لیے Apply کیا ہے۔ یہاں بھی اپنے فیلڈ کی جاب کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔''

سر ہاشم میں کافی تبدیلی آئی تھی اب وہ اسکول میں جب بھی میں اور سُمن نظر آتے رک کر خیریت پوچھتے، کچھ اسکول کی یا اِدھر اُدھر کی بات کرتے،

کبھی کبھی اسٹاف روم میں آ کر ہمارے ساتھ چائے پیتے، کبھی دیکھتے کہ باغ کے ''کنج'' میں سمن اور بیٹھے ہیں تو خود بھی اگر فری ہوتے تو آ جاتے اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے۔

ٹیچرز نے جملے بھی کسے ۔۔۔ اس دن بھی ہم تینوں اسٹاف روم میں چائے پی رہے تھے۔ فری پریڈ تھا ہم لوگوں کا۔

مِس ہیلن (Helen) سر ہاشم سے کہنے لگیں۔

''آپ تو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ نیچے تو کبھی نظر ہی نہیں آتے تھے۔ آج کل ہمارے اسٹاف روم کو کیسے رونق بخش رہے ہیں۔''

سر ہاشم نے ہنس کر ٹال دیا۔ پرنسپل تک بھی یہ خبر پہنچائی گئی کہ پہلے ''دو کا گروپ'' تھا اب اس میں ہاشم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ پرنسپل نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

وقت گزر رہا تھا۔ کہتے ہیں ''اچھا وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے'' ایک دن میں اور سمن باغ میں اپنے مخصوص کنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ کنج باغ کے ایک کونے میں چھوٹا سا ایسا ٹکڑا تھا جو تین طرف سے درختوں اور پھولوں کے پودوں سے گھرا ہوا تھا۔ درختوں کے سائے کی وجہ سے اس میں دھوپ بھی نہیں آتی تھی اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پورے ''کنج'' کو مہکاتی رہتی تھی۔ یہاں پر ایک بنچ بھی پڑی ہوئی تھی فری اوقات میں سمن اور میں یہاں آ کر بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اکثر لنچ بھی ہم دونوں اسی ''کنج'' میں کرتے تھے۔ پورا اسکول اس سے واقف تھا اگر کبھی ہمیں تلاش کرنا ہوتا تھا ہم دونوں اسٹاف روم کے علاوہ یہیں پائے جاتے تھے۔

''سحر! مجھے ایسا لگتا ہے سر ہاشم تمہیں پسند کرنے لگے ہیں''

''وہ کیسے ۔۔۔؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ان کی آنکھوں میں تمہارے لیے ایک اپنائیت دیکھی ہے۔'' سمن نے کہا۔۔۔ سمن ہر چیز سے واقف تھی، ہنگامے والے دن کے واقعہ سے بھی اور جب پہلی بار وہ ہمارے گھر آئے اس سے بھی۔ اور یہ بھی کہ وہ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے ہیں۔ ہم دونوں اپنی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے البتہ میں نے اس کو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں لیکن اسے اندازہ تھا اگرچہ وہ بولتی نہیں تھی۔

ہمارے گھر سر ہاشم ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ ضرور چکر لگاتے۔

''امّی سے پوچھتے کوئی کام وغیرہ ہو تو بتائیں ۔۔۔؟'' امّی کبھی پورا وقت بیٹھتیں، کبھی تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاتیں۔ نور بھی کبھی آتی، کبھی نہیں آتی ۔۔۔ وہ بھی کبھی جلدی چلے جاتے کبھی بڑی دیر تک بیٹھتے، چائے پیتے، باتیں کرتے رہتے۔

اس دن ''کنج'' میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سر ہاشم آ گئے۔ بولے:

''آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔ آپ کی دوست سمن کہاں ہے؟''

''کبھی کبھی اکیلے بیٹھ کر خود سے ملنا اچھا لگتا ہے۔ سمن کلاس لے رہی ہے۔'' میں نے ان کے دونوں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں بیٹھ سکتا ہوں ۔۔۔ آپ کی تنہائی میں مخل ہو رہا ہوں۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں آپ بیٹھیں پلیز'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، اسکول کے ہی کچھ مسائل تھے پھر تھوڑی دیر خاموشی رہے پھر اچانک بولے:

''سحر! آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کیا آپ میرے ساتھ زندگی گزارنا پسند کریں گی۔'' میں اچانک ایسی بات سن کر بہت نروس ہو گئی تھی۔

پھر خود ہی بولے ''کیا آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں۔'' ایک دم میرے منہ سے نکلا۔

''نہیں۔'' بولے ''اور میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں ابھی تک اپنے آپ کو سنبھال نہیں پائی تھی۔ میں نے ہاشم کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آئی پھر میں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

وہ اٹھے انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور بولے:

''شکریہ'' اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

ہاشم جا چکے تھے۔ ''میرا ذہن نہ جانے کن راستوں پر سفر کرنے لگتا ہے میرے ذہن کے ساتھ میرا دل بھی شامل ہے اور شاید میری روح بھی ۔۔۔ میرے چاروں طرف پھول ہی پھول ہیں، تتلیاں ہی تتلیاں ہیں، چمکتے ستارے ہیں ۔۔۔'' بیل کی آواز سن کر مجھے ہوش آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ میں سوچ رہی تھی میں کتنی خوش قسمت ہوں میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو پسند کیا اور وہ مجھے مِل گیا۔

سمن مجھے دیکھ کر بولی ''کیا بات ہے تم کس بات پر اس قدر خوش ہو رہی ہو۔''

میں نے سمن کو لپٹا لیا اور بھرا سے سب بتایا۔

''دیکھا تم نے میرا اندازہ صحیح نکلا۔ اب مجھے ایک اچھی سی ٹریٹ چاہیے۔''

''ٹھیک ہے میں دے دوں گی لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو یہ بات بالکل ظاہر نہیں ہونے دو گی کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔''

''اوکے بابا ۔۔۔ پکا پرامس ۔۔۔ میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔'' سمن نے میرے گلے لگتے ہوئے کہا۔

وقت بہتے پانی کی طرح گزرتا جا رہا تھا۔ خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ زندگی بامقصد لگنے لگی تھی۔ اب میں بھی ہاشم سے باتیں کرنے لگی تھی۔ ہماری فون پر بھی باتیں ہوتی تھیں لیکن فون زیادہ تر ہاشم ہی کرتے تھے۔

اس دن میں گھر آئی تو دیکھا ہاشم بیٹھے ہوئے ہیں۔

''آپ! اس وقت'' میں نے حیرت سے کہا۔''آپ آج کالج بھی نہیں آئے۔''میں نے مزید پوچھا۔

''آج مجھے کچھ ضروری کام تھا اس لیے چھٹی کی تھی۔ پھر نور کا فون آ گیا کہ اس کو کچھ ہیلپ چاہیے اسٹڈیز میں۔۔۔تو میں کام سے نمٹ کر سیدھا یہاں آ گیا، جانے والا تھا۔آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

پھر کہنے لگے''اسکول میں سب ٹھیک تھا''

''جی!''میں نے کہا۔کھڑے ہو گئے بولے''چلتا ہوں۔''

یہ لنچ کا ٹائم ہے، آپ لنچ کر کے جائیں۔

نہیں! پھر کبھی اور خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

کھانے کی میز پر لنچ کے دوران میں نے نور سے کہا:

''میں تمہاری ہیلپ کرتی تو تھی، سر ہاشم کو بلا کر ان سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔'' پھر میں نے امّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''امّی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔۔۔''

''ہاں بالکل صحیح ہے، میں نے بھی اسے یہی کہا ہے'' امّی نے میری تائید کی۔

''آپی آپ بہت مصروف رہتی ہیں۔ سر ہاشم تو آتے ہی رہتے ہیں، میں ساری پرابلم اکٹھا کر کے پوچھ لیا کروں گی۔''

شروع شروع میں ایسا ہی رہا بلکہ زیادہ تر میں بھی بیٹھی رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ہاشم کو اپنی مرضی سے فون کر کے بلانے لگی۔۔۔ مجھے بھی زیادہ بیٹھنے نہیں دیتی۔ کہتی''آپ جائیں تو میں اسٹڈی شروع کروں۔'' البتہ چائے بنانا ضرور میری ڈیوٹی تھی۔ اکثر یہی ہوتا کہ میں چائے بنا کر لے جاتی کبھی پیتی وہیں بیٹھ کر کبھی چائے کی ٹرے رکھ کر کھڑے کھڑے دو چار باتیں کرتی اور چلی جاتی۔

شب و روز گزر رہے تھے۔ اسکول میں بہت مصروفیات بڑھ گئیں۔ انسپکشن ، سالانہ فکشن، میگزین کی تیاری، امتحانات۔۔۔ سب کے بعد دیگرے۔۔۔ اسی میں تقریباً تین چار مہینے گزر گئے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔ آخری پیپر تھا بچوں کا۔۔۔ میں اور سمن کاپیاں جمع کرانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ سمن مجھ سے کہنے لگی:

''سحر! میں سر ہاشم میں کچھ تبدیلیاں دیکھ رہی ہوں۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ، خاص طور پر تمہارے ساتھ ان کا پہلے جیسا انداز نہیں ہے۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسکول میں کام کی وجہ سے کتنی مصروفیت ہو گئی تھی۔''

''خیر! کہتی ہو تو مان لیتی ہوں'' سمن نے کہا۔

سُمن کو تو میں نے ایسا کہہ دیا لیکن میں خود بھی محسوس کر رہی تھی ہاشم کی اس تبدیلی کو۔۔۔ فون بھی نہیں کرتے تھے۔ میں فون کروں تو بھی تھوڑی دیر بات کرتے اور وہ بھی ادھر اُدھر کی۔۔۔ پھر کسی بہانے سے فون رکھ دیتے۔۔۔ اکثر اٹھاتے بھی نہیں۔۔۔ لیکن ہاشم سے متعلق کچھ غلط سوچنے کو دل نہیں چاہتا، پھر میں اپنے دل کو تسلی دے دیتی کہ بہت مصروف وقت گزرا ہے شاید یہی وجہ ہو۔

اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ امّی مجھ سے کہنے لگیں بھائی صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے تم دو ہفتے کے لیے اسلام آباد چلی جاؤ بھابی اکیلی ہیں۔۔۔ میں چلی جاتی مگر نور کے امتحانات نزدیک ہیں۔ تم دونوں کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔ مجبوراً مجھے جانا پڑا حالانکہ میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

''میں ماموں صاحب کے پاس اسلام آباد پہنچی تو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی۔ میں ان کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ جب امان بھائی جدہ سے آ گئے تو میں نے واپسی کا سوچا۔ امان بھائی اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ کہنے لگے میں اب یہیں رہوں گا۔ امّی ابّو کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

میں نے کہا''بھائی آپ نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا۔ ماموں صاحب کو، ممانی کو آپ کی ضرورت ہے۔ مجھے دو ہفتے کے بجائے چار ہفتے لگ گئے۔''

گھر پہنچ کر سب سے ملی۔ بھائی، بھابی دونوں بچوں حسن اور مریم سے بے حد خوشی ہوئی ہم ایک سال کے بعد مل رہے تھے۔ بھائی، بھابی بھی بہت خوش تھے۔ مریم اور حسن تو مجھے چھوڑ ہی نہیں رہے تھے۔ بھابی نے دونوں بچوں کو زبردستی سونے کے لیے بھیجا۔ میں بھی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔۔۔ بہت تھک گئی تھی۔

جہاز میں پورا وقت ہاشم کے متعلق سوچتی رہی۔ کہاں غائب ہیں یہ جناب۔۔۔ آخری بار فون پر بات ہوئی تھی تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد یہ کہہ کر کہ''پریشان ہوں امّی کی طبیعت خراب ہے'' فون ختم کر دیا تھا۔۔۔ اور اس کے بعد کوئی خیر خبر نہیں۔۔۔ میں نے دو تین مرتبہ فون کیا ملا ہی نہیں۔۔۔ فون کی طرف دیکھا۔۔۔ فون کروں۔۔۔ سوچا۔۔۔ پھر وقت دیکھا۔۔۔ بارہ بج رہے تھے۔۔۔ اتنی رات کو مناسب نہیں کل بات کروں گی۔ یہ سوچ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

صبح سب نے ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بھابی کہنے لگیں تمہیں ایک خوشخبری سنائیں:

''نور کی بات پکی ہو گئی''

''خوشی کی بات ہے۔ لیکن یوں اچانک۔ کس کے ساتھ''

''تمہارے اسکول میں کوئی ٹیچر ہیں سر ہاشم ان کے ساتھ''

ہم تو صرف منگنی کرنا چاہ رہے تھے مگر کینیڈا میں ہاشم کی job ہو گئی ہے اس کا ویزا آ گیا ہے۔ نور کے ویزے کے لیے Apply کرنا ہے اس کے لیے نکاح ضروری ہے۔ ہم نے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔ پرسوں ظہر کے بعد نکاح ہے ہال میں پھر کھانا۔۔۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا پورا جسم برف بن گیا۔ میں بالکل منجمد ہوگئی تھی۔ پتہ نہیں کیسے میری سانس چل رہی تھی۔۔۔ یا شاید وہ بھی نہیں چل رہی تھی۔۔۔ میں کیسے زندہ تھی۔ مجھے بھابی کا ایک لفظ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے پر نجانے کیا کچھ گزر رہا تھا۔۔۔ پھر میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا کہ کوئی اور میری اس کیفیت کا اندازہ نہ لگا سکے۔ بھابی میرے سر میں درد ہو رہا ہے یہ کہہ کر اٹھی۔۔۔ جاتے ہوئے میں نے نور کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دیکھی۔۔۔

کمرے میں اندر سے کنڈی لگائی اور بستر پر لیٹ کر بہت روئی۔ ہاشم آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ آپ خود ہی آگے بڑھے اور پھر خود پیچھے ہٹ گئے۔۔۔ آپ نے میرے بارے میں ایک لمحہ نہیں سوچا کہ مجھ پر کیا بیتے گی۔۔۔ روتے ہوئے ان خیالات کے ساتھ کب سو گئی۔۔۔ جب آنکھ کھلی تو تین بج رہے تھے۔۔۔ منہ ہاتھ دھو کر خود کو نارمل کیا پھر باہر نکلی۔ کام بہت تھا کیونکہ پرسوں نکاح تھا۔۔۔ دل پر پتھر رکھ کر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔ اور ہر کام میں حصہ لیتی رہی۔۔۔ میں کس طرح اپنے شکستہ دل کو سنبھال رہی تھی۔

آج نکاح ہو چکا تھا۔ سب لوگ تھک کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں سوچ رہی تھی نور بچپن سے میرے ساتھ ایسا کیوں کرتی رہی ہے۔ جب چھوٹی تھی، میرے کھلونے لے لیتی تھی۔ تھوڑی بڑی ہوئی تو ہر وہ چیز جو مجھے پسند آتی وہ مانگ لیتی۔ میں اس کو دے دیتی۔ جو بھی مجھے تحفے میں چیزیں ملتیں وہ اسے سب چاہیے ہوتیں۔ امّی اس پر بہت ناراض ہوتیں مگر بابا اس کا Favour کرتے اور میں اس کو وہ سب دے دیتی جو وہ پسند کرتی۔ ہم دونوں کو ساتھ تحفے ملتے۔۔۔ لیکن اس کو وہ تحفہ چاہیے ہوتا جو مجھے ملا ہے۔ میں بخوشی اس کے تحفے سے بدل لیتی بڑے ہونے کے بعد کپڑوں میں بھی یہی کرتی۔ ''امّی کہتیں اس طرح تم اس کو بگاڑ رہی ہو۔'' کچھ عرصہ پہلے امّی کی دوست نے میرے لیے ایک رشتہ بھجوایا۔ امّی سے کہا ''بہت اچھے لوگ ہیں، لڑکا بھی بہت اچھا ہے، ایم بی اے ہے ایک امریکی کمپنی میں بہت اچھی جوب ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔

''وہ لوگ آئے امّی نے نور سے کہا تم سامنے مت آنا جب تک وہ نہ جائیں کمرے میں رہنا'' نور میرے مقابلے دبلی تھی، رنگ بھی اس کا مجھ سے زیادہ صاف تھا، قد ہم دونوں کا ایک جیسا تھا۔ باتیں کرنے میں نور کا جواب نہیں تھا۔ امّی کو یہ ڈر تھا کہ کہیں میرے بجائے وہ اس کو پسند نہ کر لیں۔

وہ لوگ آئے میں ان کے سامنے گئی۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ہی نور آ گئی۔ ان لوگوں سے خوب باتیں کیں، شوخیاں کیں اور پھر وہی ہوا جس کا امّی کو ڈر تھا۔ سائرہ آنٹی نے امّی سے کہا ''وہ نور کو مانگ رہے ہیں''

اور اب۔۔۔ اب تو نور نے میری زندگی ہی مجھ سے چھین لی۔ ''کیا بہنیں ایسی ہوتی ہیں۔۔۔؟ میں نے کبھی نور کا برا نہیں سوچا اور اس نے شاید کبھی میرا اچھا نہیں سوچا۔۔۔''

سوچتے سوچتے باہر کھڑکی سے نظر ڈالی۔۔۔ سورج آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔ فضا پر چھایا ہوا قرمزی رنگ آہستہ آہستہ سرمئی رنگ میں تبدیل ہو رہا تھا۔۔۔ پھول، پودے، درخت، پتے سب خاموش تھے، ساکت تھے۔۔۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔۔۔ ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ مجھے ایک شعر یاد آیا:

دونوں وقت ملتے ہیں اب تو شام سے کے سناٹے میں
جی پر وقت کڑا آیا ہے، وقت یہ ٹل جائے تو کہیں

میں نے دوہرایا ''وقت یہ ٹل جائے'' فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا شرمین کا فون۔۔۔ آنٹی کے گھر سے۔۔۔ کیا وہ آئی ہوئی ہے۔۔۔؟

شرمین میری بہت اچھی دوست ہے۔ ہم دونوں نے پہلی کلاس سے بی ایس سی تک ساتھ پڑھا۔ ہم دونوں نہ صرف اسکول، کالج میں ساتھ ہوتے تھے گھر آ کر بھی زیادہ ساتھ ہی رہتے تھے۔ دو گلی چھوڑ کر اس کا گھر تھا کبھی وہ ہمارے گھر ہوتی تھی، کبھی میں اس کے گھر۔ ہر بات ہم ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ دو سال پہلے اس کی شادی ہوگئی اور وہ دوبئ چلی گئی۔ شروع شروع میں فون پر بہت بات ہوتی تھی۔ بچی پیدا ہونے کے بعد یہ سلسلہ کم ہو گیا تھا۔۔۔ اور آج اچانک۔۔۔ شرمین نے فون اٹھایا۔۔۔ ''سحر! کیا تم ابھی آ سکتی ہو۔۔۔ میں آج صبح ہی پہنچی ہوں۔''

جیسے ہی میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی وہ مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔۔۔ رونے کے دوران ہی وہ بولی:

''سحر! وحید نے مجھے طلاق دے کر بچی کے ساتھ جہاز میں سوار کرا دیا۔۔۔ اس کا غم تو مجھ سے بھی بڑا ہے۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ زندگی کی بربادیوں کا یہ کیسا لامتناہی سلسلہ ہے۔۔۔''

تحفہ

عام طور پر لوگ بہت امیر ہو جائیں تو پرانے دوستوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی ہیں کہ جنہیں دولت آتے ہی سب سے پہلے غربت کے زمانے کے دوستوں کا خیال آتا ہے۔

ارب پتی ہولی وڈ اداکار 59 سالہ جارج کلونی بھی ایسے ہی انسان ہیں۔ 2013 میں انہوں نے ایک سائنس فکشن فلم ''گریوٹی'' میں کام کیا تھا، معاوضے کے طور پر انہیں فلم کی کمائی سے کچھ حصہ دینے کا معاہدہ کیا گیا تھا۔ اتفاق سے فلم سپر ہٹ ہوگئی تو انہیں بہت ساری رقم ملی۔

رقم ملنے کے بعد انہوں نے اپنے سات پرانے دوستوں کو ایک ویران جگہ بلا کر ہر ایک کو 10 لاکھ امریکی ڈالر یعنی پاکستانی تئیس تئیس کروڑ روپے تحفے میں دے ڈالے۔

مدراپی کرمت ناچوسادھورام

قمر جمالی
(حیدرآباد، دکن)

سادھورام ایک سیدھا سادا مِل مزدور تھا۔شہر سے دور گاؤں میں رہتا تھا۔مزے میں تھا۔ایک بار جو شہر آیا، یہاں کی چکاچوند دیکھی۔۔۔تو یہاں کی روشنی اس کی آنکھوں کو خیرہ کرگئی۔گاؤں سے رہا سہا ناطہ توڑ لیا۔۔۔اور بس گیا شہر میں۔

ویسے بھی سادھورام کو گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں کام کرنا پسند نہ تھا۔ صاف ستھری قمیص اور پتلوں پہن کر جب وہ باہر نکلتا، تو گاؤں کے لڑکے جنٹلمن، جنٹلمن کہہ کر اس کے آگے پیچھے پھرتے۔ نیچے سے اوپر تک یوں دیکھتے جیسے اس نے لندن سے ہندوستان پہنچتے ہی سیدھے یہیں کی زمین پر قدم رکھا ہو۔

لوگوں کی جھوٹی تعریف سن کر وہ یہ بھول جاتا کہ اس کی آنول اس مٹی میں گڑھی ہے، اور اس نے ماں کے پیٹ سے نمودار ہوتے ہی اسی گوبر بھری ہوا میں سانس لی ہے۔

اپنے گھر کی ہر چیز اسے گندی لگتی۔حتی کہ جب وہ گھر میں جانا چاہتا تو جوتے خراب ہوجانے کے ڈر سے باہر کی دہلیز پر ہی نکال دیتا، اور پنجوں پر چل کر دالان تک پہنچتا جیسے آنگن کی گندگی اس کے پاؤں ناپاک کردے گی۔

ہفتہ کی صبح وہ معمول سے پہلے ہی گھر سے نکل جاتا، کیونکہ سورج نکلتے ہی ماں ایک بڑی بالٹی بھر پانی میں دو ٹوکرے گوبر انڈیلتی، اور پیتل کا لوٹا لئے آنگن کے انچ انچ میں چھڑکاؤ کرتی۔جب سارا آنگن چھڑکاؤ کر چکی ہوتی تو بڑی چاؤ سے دہلیز پر ہلدی اور گیرو سے ٹیکے لگاتی۔پھر۔۔۔آنکھیں موندے، دونوں ہاتھ جوڑے، منہ ہی منہ میں جانے کیا کیا کہے جاتی۔!

اتفاق سے ایسے وقت اگر سادھورام گھر میں موجود ہوتا تو اسے بڑا تاؤ آتا۔مگر ماں اسے اپنے ہی ڈھنگ سے سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''بیٹے! لکشمی یہیں سے ہوکر اندر آتی ہے۔تو ہوئی نا یہ دہلیز مقدس۔۔۔؟''

''چلو ماں! مانا کہ لکشمی یہیں سے ہوکر اندر آتی ہے۔مگر آتی تو اندر ہی ہے نا؟ تم نے تو سارا آنگن گوبر سے گندہ کردیا۔'' وہ بھی اپنے طریقے سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

''ہری ہری ہری! لڑکے! تو کیا ناستک ہوگیا ہے۔۔۔؟ گوبر کو گندہ کہتا ہے۔مورکھ! اس کے چھڑکاؤ سے تو سارا گھر پاک ہوجاتا ہے۔''

صبح جب گوالا گوبر لے کر گھر آتا تو کبھی کبھی ماں حد کردیتی ہے۔گئو پنچکم (۱) کے نام پر اچھا بھلا گھر خراب کردیتی۔

اس ضمن میں سادھورام کی اپنی ماں سے دھواں دھار جنگ ہوجاتی کہ چاہے جو ہو، وہ گئو پنچکم کے نام پر اچھے بھلے گھر کو گندہ ہونے نہیں دے گا۔

شاید باپو بھی اس کا ہم خیال تھا۔اسی لئے کبھی کبھی وہ سادھورام کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا۔

''نیک بخت! تو ہمیشہ لڑکے کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہے۔وہ نہیں چاہتا تو چپ ہوجا۔ضروری نہیں کہ تیری مرضی کے آگے وہ بھی جھک جائے جیسے میں۔۔۔''

''ہاں ہاں۔بڑے فرمانبردار ہونا؟ میرے ظلم کے آگے جھک جاتے ہو۔اگر میں نہ ہوتی تو یہ گھر ناستکوں کا اڈہ بن جاتا۔شکر کرو کہ میرے کارن اس چار دیواری میں دھرم مریادا باقی ہے۔بامن کی اولاد ہو، پھر بھی دھرم مریادا کا پالن نہیں کرتے ہیں۔''

''اب یہ پرانے وچار چھوڑ دو بھی۔دنیا کتنی آگے نکل گئی۔لوگ چاند پر پہنچ گئے۔ایک سادھارن انسان کے مافک (موافق) زندہ رہ لیں۔اپنے اور اپنے پریوار کا پیٹ بھر لیں۔یہی کافی ہے۔آج کی دنیا میں ویدوں اور پُرانوں کے مطابق جی بھی کہاں سکتے ہیں۔بامن کے اصولوں کی بات کرتی ہو تو کندھے پر جھولی ڈالو اور۔۔۔

''دھرما بھکشا ندہی'' کہتے گھر سے نکل پڑو۔کیونکہ بھکشا منگے (مانگے) بغیر تو بامن کے سدھانت پورے نہیں ہوتے۔''

ماں اور باپو کو لڑتا دیکھتا تو سادھورام جوتے ہاتھ میں پکڑے، دبے پاؤں گھر سے نکل جاتا۔۔۔اور شام تک گھر نہیں لوٹتا۔

وہ پڑھنا بھی بہت چاہتا تھا۔مگر گاؤں کا مدرسہ صرف چار جماعتوں ہی تک محدود تھا، سو پڑھ لیا۔پوری چار جماعتوں تک قسم لے لو جو کسی کو اول آنے دیا ہو تو۔اب تو گاؤں کے استاد بھی اسے خود سے پیچھے لگنے لگے تھے۔

سولہ سترہ سال میں قدم رکھتے ہی اس کا رنگ روپ یوں نکھر اٹھا کہ ساتھی سنگ اسے سادھورام سے بانکے رام پکارنے لگے۔

''یہ شہر کا ہیرو لوگ کیا تیرے مافک (موافق) ہوتے ہوں گے۔ بس ذرا سوسائٹی میں تال میل کی جرورت (ضرورت) ہے۔اب یہی دیکھ مشہور فلم اسٹار رمیش واگھرے ہی کو لوگ جات کا دھوبی کہتے ہیں۔بھئے! تو تو جات کا بھی بامن ٹھہرا۔یہ نکھرا، دھلا رنگ روپ، اونچا قد اور چکلا سینہ آخر کس کام کا۔۔۔!''

سادھورام دم بھر کو بھول جاتا کہ ناگ پھنی کے چینڈے سے نکلا ہوا پھول بھی جنگل میں آگ لگا دیتا ہے۔

مگر۔۔۔

کوئی اسے اپنے جوڑے میں نہیں سجاتا۔

گھڑی دو گھڑی کو سادھورام یہ بھی بھول جاتا کہ گوبر لیپے آنگن ہی سے ہوکر اسے اپنی کوٹھری میں جانا ہوتا ہے۔وہ تو یہ تک بھول جاتا کہ باپو صبح سے شام تک بیلوں کے برابر رہٹ کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔تب کہیں جا کر کھیتوں

میں سینچائی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سادھورام اپنی تعریف سن کر آپے سے باہر ہوجاتا، اور یار دوستوں کو لئے کھیتوں میں گھس پڑتا تو کمر سے لے کر گریبان تک ان کی قمیصوں میں ککڑی، کروندے، مونگ پھلی اور جوار کے بھٹے بھر دیتا، یہ سوچے بغیر کے ایک ایک کروندے کو اگانے کے لئے باپو نے کتنے قطرے پسینے کے اس کی جڑوں میں سموئے ہوں گے۔

کہتے ہیں حسن اپنے دام خود وصول کر لیتا ہے۔ سادھورام کی جوانی کو بھی سینگ نکل آئے اور اس نے ان کے دام بھی خود ہی مقرر کر لئے۔

پھر۔۔۔

ایک دن یوں ہوا کہ وہ مکھیا کی بیٹی شنکری کے ساتھ بھاگ نکلا۔

عشق انجام وعواقب سے بے نیاز تھا۔

مگر۔۔۔ پیٹ۔۔۔؟

پیٹ ایک ایسا معلم ہے جس کے ہاتھ میں تھمی پتلی بید لحہ لحہ احساس دلاتی ہے کہ تخیل کے پرواز۔۔۔ پرواز نہیں ہوتی محض اُڑان ہوتی ہے۔ بارود بھرے پٹاخے کی ''سُوں'' کے ساتھ آسمان کو چھوتی محسوس ہوئی۔۔۔ کہ زمین پر چنگاری بن کر بکھر گئی۔ حقیقی زندگی پرواز چاہتی ہے۔

اور پرواز۔۔۔ پنکھ۔

جو اس کے پاس تھے ہی نہیں۔

شنکری کے ساتھ گاؤں کی سرحد چھوڑتے ہی سادھورام کی زندگی بارود بھرے پٹاخے کی طرح پھسپھسا گئی۔

اور باقی رہ گئی۔۔۔

مٹھی بھر راکھ۔

عشق کے بھی کیا کیا تقاضے ہوتے ہیں۔۔۔ سادھورام کو اب سمجھ میں آیا۔

اب کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ حتیٰ کہ زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا، جس پر پتوں کی چھپر ڈال کر وہ شنکری سے کہہ سکتا۔۔۔ ''شنکری! تو بہت پیاری ہے۔'' اس نے بڑی جتن کر کے یہ بھی سیکھ لیا تھا کہ انگریزی میں اظہار عشق کیسے کیا جاتا ہے۔ کاش گھڑی دو گھڑی کے لئے ہی سہی کوئی گوشۂ عافیت مل جاتا؛ اور وہ شنکری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یہ کہہ سکتا۔۔۔

''شنکری! آئی لو یو۔''

ریلوے پلیٹ فارم اور میونسپلٹی پارکس میں بنے سمنٹ کے بنچوں پر پولیس کا پہرہ تھا۔ پھر عشق کیسے کیا جاتا۔۔۔؟ اور وہ بھی اس وقت جب پیٹ میں جلن یہ اعلان کر رہی ہو۔

کہ ۔۔۔

''سادھورام! تم نرے اجڈ ہو۔ ایک دم گنوار اور ناکارہ انسان۔ اپنی اردھانگنی کو ایک وقت کی روٹی نہیں دے سکے۔۔۔ تو اس کی مانگ کو سہاگن کی سرخی کیا دے سکو گے۔''

شام ہوتے ہوتے شنکری کی بڑی بڑی روشن آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اب سادھورام کو اتنا بھی حوصلہ نہ رہا کہ وہ شنکری کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتا۔

کبھی کبھی ٹھوکر آدمی کو انسان بنا دیتی ہے، اور اس کے سر سے فسوں کا سودا نکال کر احساس کا پرتو' یوں اجاگر کرتی ہے جیسے موٹر کے شیشے پر جمی اوس پونچھ دی گئی ہو۔

شنکری کی خوبصورت آنکھوں میں سیلاب کی دھمکی دیکھ کر سادھورام کو ایسی ٹھوکر لگی کہ اسے احساس ہوگیا کہ عورت جب کسی مرد پر بھروسہ کر لیتی ہے تو اسے پرمیشور مان لیتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ امربیل کی طرح اس کے وجود سے یوں لپٹ جاتی ہے کہ الگ کرنا چاہو تو وہ خود ٹوٹتی تو ہے ہی، مگر جس پیڑ سے وہ لپٹی ہوتی ہے۔۔۔ جگہ جگہ سے اس کی چھال بھی ادھڑ جاتی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ شنکری کو اس کے ماں باپ سے علاحدہ کیا ہے تو اس کا سہارا بنے گا۔

وہ شنکری کو لے کر اپنے ایک دوست کے ہاں گیا جو ایک کپڑے کی مل میں مزدور تھا۔

مزدور بستی میں اپنے دوست کے ایک کمرے والے مکان میں رہتے رہتے سادھورام موم کے پتلے کی طرح قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔ صبح سے شام تک سڑکیں ناپ کر شام گھر لوٹتا تو اسے بڑی کوفت ہوتی۔ شہر کی زندگی گاؤں کی زندگی سے کتنی مختلف تھی۔۔۔ یہاں کوئی کسی کو پہچانتا ہی نہ تھا۔ اسے لگا جیسے بھروسہ شہر کی زمین پر پیدا ہی نہیں ہوا۔۔۔ یا پھر ہوا بھی ہوگا تو لوگوں نے اسے اتنا بے بھروسہ کر دیا کہ گھبرا کر شہر کی حدوں سے باہر نکل گیا۔

اب وہ ہر طرح کی محنت کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر۔۔۔ کوئی اسے موقع دے تب نا۔۔۔! آخر اسی دوست نے جس کے گھر میں وہ ناجائز قابض کے طرح جم گیا تھا، اور شاید وہ بھی ان سے پنڈ چھڑانا چاہتا تھا، ایک دن بڑے بابو سے سفارش کروادی اور مل میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی کروادی۔

اس طرح اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مل کے قوانین کے مطابق اسے مزدور بستی میں ایک کوارٹر مل گیا۔۔۔ بس ایک کمرہ۔ مگر وہ ایک کمرہ سادھورام کے لئے کسی محل سے کم نہ تھا۔

حساس تو وہ تھا ہی۔

تب ہی تو اس نے اُڑنے کی کوشش کی تھی۔

اپنے ماحول سے اونچا۔۔۔

اپنے حالات سے پرے۔۔۔

مگر۔۔۔

شاید وہ حساب میں بہت کمزور تھا۔ اسی لئے اپنی پرواز کو حالات کے ساتھ استوار نہ کر سکا۔

اور چادر کا اندازہ کئے بغیر ہی پیر پھیلا دئے۔

وقت کا پنچھی کب کس کا پابند رہا ہے۔۔۔!

وہ تو اڑتا رہا۔
اپنی ڈگر۔۔۔اپنی سمت۔
مگر۔۔۔
جب کبھی وہ مورے گاؤں کی سرحد سے ٹکرایا، خون کا ایک قطرہ سادھورام کی رگوں میں منجمد ہوگیا۔
باپو کی موت۔
ماں کی جدائی۔
اب کچھ نہیں بچا تھا اس کے پاس۔ پہلے پہل تو وہ سڑکوں پر اکیلا گھومتا ہوا جی بھر کر رولیا کرتا تھا۔
مگر اب۔۔۔
آنسو اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ یہ شاید شہر کی تہذیب کی دین تھی۔ یہاں لوگوں کے جگر رِستے بھی ہوں تو وہ روتے نہیں۔ کیونکہ رونا شہر کی تہذیب میں بزدلی کی علامت ہے۔
ہاں مگر۔۔۔
اس بوجھ کو اتارنے کا ایک آسان راستہ وہ ڈھونڈ چکا تھا۔مل سے چھوٹتے ہی وہ اپنے مزدور دوستوں کے ساتھ شراب خانے چلا جاتا۔
اور۔۔۔
رات دیر گئے تک خلاؤں میں تیرتا رہتا۔
آئینے کے سامنے کھڑا بڑی دیر تک وہ اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔
کب۔۔۔؟ کب جوانی رخصت ہوئی۔۔۔!اسے اس کا احساس ہی نہ ہوا۔
رخساروں سے گوشت کب جھڑ گیا۔۔۔!
کیا یہی خواب دیکھے تھے۔۔۔!
مستقبل کی اتنی بھیانک شکل اگر اس نے پہلے دیکھ لی ہوتی، تو آج وہ کم از کم مل میں مزدوری تو نہ کر رہا ہوتا۔
گھر جاؤں تو نظر بھر کر شنکری کو دیکھوں گا۔ پتا نہیں وہ کتنی ٹوٹ گئی ہوگی۔
آج شنکری مجھے وقت پر گھر میں دیکھ کر کتنی خوش ہوگی!
اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ مل سے چھوٹتے ہی وہ سیدھے اپنے گھر جائے گا۔
مل کے پیشاب خانے میں لگے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا وہ خود سے اقرار کرتا رہا۔
مگر۔۔۔شام کے ساتھ ہی اس کے مزدور دوست اُسے گھسیٹ کر وہیں لے گئے جہاں سے لوٹ کر اسے کچھ بھی یاد نہ رہتا تھا۔ وہ تو یہ بھی بھول جاتا تھا کہ لکڑی کا دھواں، تیل کی چراند، اور مکانوں کے سامنے سے بہتی ہوئی گندے پانی کی نالی سے اٹھنے والی بدبو اور گھٹن میں سڑنے والی شنکری دراصل اس کی جان ہے۔اس کی اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز۔

شام دیسی ٹھرّا پی کر وہ گھر لوٹتا تو پتا نہیں اسے کیا ہوجاتا! کچھ یاد نہ رہتا، اور شنکری بھی کیا تھی۔۔۔!
پہلی سی شنکری تو کب کے مر چکی تھی۔ اتنی چرب زبان کہ بولو تو سامنے والے کا جگر کٹ کر لہو ٹپکنے لگے۔
''حرامی کہیں کا۔ بڑا رعاب (رعب) جھاڑتا ہے۔ مرد بنا پھرتا ہے۔شرم کر! ورنہ میں اپنا پیٹ پالنے لگوں۔۔۔تو تجھے باوڑی (باولی) میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ نہیں۔''
نشے میں دھت، سادھورام کو کچھ اور بات یاد رہے کہ نہ رہے۔۔۔ مگر یہ تو یاد رہتا کہ بیوی اس کی متاع ہے۔۔۔اس کی لونڈی۔اس کا کام تو پتی دیو کے آگے سر پر پلّو ڈالے ہاں جی' ہاں جی' کرنا ہے۔ جب اس کو زبان درازی کرتی سنتا تو آپے سے باہر ہوجاتا۔ آؤ دیکھتا نہ تاؤ۔ وراندے میں لگے چھپر سے ڈنڈا کھینچتا اور شروع ہوجاتا۔
ایک آدھ مار کھا کر شنکری تو ہٹ جاتی، مگر نشے میں دھت سادھورام کو یہی احساس رہتا کہ وہ شنکری پر برس رہا ہے۔بس ڈنڈا گھماتا جاتا اور ناچتا رہتا۔
''لے۔۔۔حرام زادی۔۔۔مر۔'' کھٹاک سے ڈنڈا زمین پر مارتا اور پھر پینترا بدل کر ڈنڈا ہوا میں لہراتا۔ بیچ بیچ میں ''لے۔حرام زادی۔۔۔مر'' کی گردان بھی کیے جاتا۔
بازو مکانوں سے لوگ نکل آتے اور ایک میلہ لگ جاتا۔شنکری دوڑی دوڑی اسکول ماسٹر کے پاس جاتی جن کی سادھورام بڑی عزت کیا کرتا تھا، انہیں ساتھ لے آتی۔
ماسٹر جی بڑی خاص مٹی کے بنے تھے۔ نہ ہی انہیں غصہ آتا اور نہ وہ سادھورام کو ڈانٹتے۔ بے خوف وہ سادھورام کے پاس جاتے، اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے۔۔۔
''مدرا پی کرمت ناچو سادھورام۔''
سادھورام یکلخت رک جاتا۔ ماسٹر جی کی طرف دیکھتا۔۔۔ ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیتا اور کہتا ہے۔۔۔
''نہیں ماسٹر جی! لو چھوڑی مدرا۔۔۔توبہ توبہ۔''
اب یہ سادھورام کا معمول بن گیا تھا۔ ہفتہ پندرہ دن میں بار یہ ڈرامہ ضرور ہوتا۔ نشے میں دھت سادھورام ڈنڈا گھما کر ناچتے لگتا، شنکری دوڑی دوری ماسٹر جی کو بلا لاتی۔ ماسٹر جی' سادھورام کے ہاتھ سے ڈنڈا لے لیتے اور نہایت شرافت سے تاکید کرتے۔''مدرا پی کرمت ناچو سادھورام۔''
اور سادھورام بھی اتنی شرافت سے اعادہ کرتا۔۔۔''نہیں ماسٹر جی! لو چھوڑی مدرا۔توبہ توبہ۔''
دسہرہ کا تہوار مزدور بستی میں نئی زندگی لاتا۔اس کی ایک وجہ بونس کی رقم ہوتی، اور دوسری طرف کمیونٹی ہال میں دس دن تک ہوتی دُرگا پوجا اور روز روز کے نت نئے تفریحی پروگرام۔ پورے دس دن تک بستی میں رت جگا رہتا۔

سادھورام کو یوں تو بچپن سے پوجا پاٹ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر جب سے وہ یہاں آیا تھا، ہر سال دسہرہ کے دس دن کمیونٹی ہال روز جایا کرتا اور ساتھ میں شنکری کو بھی لے جاتا۔ پھر دشمی کو یعنی تہوار کے دن تو بس صبح ہی سے ساری بستی دُلہن بن جاتی۔

اس روز بھی ہمیشہ کی طرح سادھورام صبح تڑکے اٹھا، نہا دھو کر کپڑے پہنے اور فیکٹری چل دیا۔ بس ذرا اوزار پوجا تھی۔ پھر۔۔۔ چھٹی۔

پوجا ختم ہوئی تو طبیعت میں ترنگ تھی۔ پھر یار لوگوں کی مجلس۔ یوں بھی بری عادت دلفریب محبوبہ جیسی ہوتی ہے۔ سادھورام اس محبوبہ کی جال میں اس بری طرح پھنس چکا تھا کہ مل سے نکلتا تو سمت کا تعین وہ نہیں کرتا بلکہ اس کے پاؤں کرتے تھے۔

لہٰذا مل سے نکلا۔۔۔ تو سیدھے میخانہ پہنچ گیا۔

وہی کیا۔

سینکڑوں مزدور۔۔۔ عید کی ترنگ، جیب میں پیسہ۔ یوں پئے کہ اپنے پاؤں چل کر مکان نہ پہنچ سکے۔

ہر طرف رونے کی آواز۔

ہر مکین ماتم کناں۔

کسی کو ہوش نہ تھا۔

''ماسٹر جی۔۔۔ ماسٹر جی! دیکھو تو۔۔۔ سادھورام کچھ بولتا کیوں نہیں؟ ماسٹر جی! اس سے کہو کہ کچھ تو کہے۔ یہ لو ڈنڈا۔ کہو اس سے کہ میری پیٹھ پر برسائے۔ قسم لے لو جو اپنی جگہ سے ہلوں۔ سارے مار اپنی پیٹھ پر سہار لوں گی۔ مگر 'سی' نہیں کروں گی ماسٹر جی! تم بھی نہیں بولتے۔

کہو نا اس سے کہ اُٹھے۔

پوچھا نا اس سے کہ اس نے مدرا پی کہ نہیں۔۔۔؟

اگر پی ہے تو نا چتا کیوں نہیں۔۔۔! ماسٹر جی۔۔۔!!''

شنکری رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ ایک سادھورام ہی کیا۔

مزدور بستی کے ہر دوسرے گھر میں صف ماتم بچھی تھی۔ کیا بچے۔۔۔ کیا بوڑھے۔ کس کو پرسا دیتے، اور دیتے بھی کیسے۔ وہ گھڑی کب کے بیت چکی تھی۔ ماسٹر جی جانتے تھے کہ سادھورام نے مدرا نہیں پی، زہر پیا ہے۔۔۔ کبھی نا چے گا نہیں۔

- بقیہ -

گوسپ گرل/کھلی کتاب

کرنا خدا کا۔۔۔ بعینہٖ ایسا ہی ہوا۔

ادھر ان کا انتقال ہوا اور ادھر ابھی قل بھی ٹھیک سے نہ ہو پایا تھا کہ بڑے میاں میری سہیلی کے گھر پہنچ گئے اور بضد ہو کر کہنے لگے۔ ''آج ہی نکاح پڑھا لو اور میرے ساتھ چل چلو!'' یہ سن کے میری سہیلی کا تو یہ حال ہوا گویا بلی کے بھاگو چھینکا ٹوٹا ہو۔ وہ پھدک کے ان کے پہلو میں جا بیٹھی۔

ابھی تین مہینے بھی ٹھیک سے نہیں گزرے ہیں کہ کل اس کا فون آیا تھا۔ کہنے لگی اب تم سے کیا بتاؤں، میری پیاری نجمہ! وہ تو مجھ پر ایسے لٹو ہو گئے ہیں کہ ہر وقت مجھ پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ حتیٰ کہ۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔ پھر بڑی شرماتی ہوئی، لجاتی ہوئی، اس نے خود ہی راز افشاں کیا:

''اب تو میرے پاؤں بھی بھاری ہو گئے ہیں۔''

یہ ساری باتیں نجمہ مجھے فون پر کچھ اس طرح سے بتا رہی تھی گویا اس پہلوانی کشتی کے مقابلے کی کوچ وہی رہی ہو۔ میں نے گذشتہ محاکات پر جو ذرا غور کیا تو مجھے بھی لگا واقعی، اس دنگل کی اصل محرکہ تو وہی تھی۔

نجمہ کی اس سماجی خدمت کا مجھے بصمیم قلب قائل ہونا پڑا۔ میں نے خود کلامی کے انداز میں سوچا۔ ''اب سمجھ میں آیا۔۔۔ کہ مجھ سے ایسے اوٹ پٹانگ سوالات کیوں کیا کرتی تھی۔ میں تو اسے کچھ اور ہی سمجھ بیٹھا تھا۔''

اس دن کے بعد سے نجمہ کے لئے میرے دل میں عزت اور بڑھ گئی۔

- بقیہ -

چڑی سا دل۔۔۔!

'' تو فکر نہ کر۔۔۔ میں نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے'' وہ پختہ ارادے کے ساتھ بولا۔

''میں نے اُسے بہت روکا مگر وہ نہ مانا۔۔۔ مجبور ہو کر میں نے اُس کا گلا تیز دراتی سے کاٹ دیا'' یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اشک بھر آئے مگر وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔

''ہائے ربّا۔۔۔ تو نے کس کا گلا کاٹ دیا بیٹا؟'' ماں نے سیدھے بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا، اُس کی بالوں میں پھرتی انگلیاں اچانک رک گئیں۔

''بابا کا۔۔۔ وہ کولہی کی معصوم بچّی کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنا رہا تھا۔۔۔ مجھے معاف کر دے اماں'' یہ کہہ کر وہ اُس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔

بیٹے کی بات سن کر ماں مکمل سکتے میں آ گئی، اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا رہ گیا۔

اتنے میں دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آواز آئی۔

''ہو سکے تو اماں مجھے معاف کر دینا۔۔۔ پولیس مجھے لینے آ گئی ہے'' یہ کہتا ہوا وہ وہاں سے اُٹھا اور ماں کو اسی حالت میں چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چڑی سا دل۔۔!

شکیل احمد خاں
(کراچی)

اُس نے اپنی جانب آتی قدموں کی آہٹ پا کر درانتی ایک جانب پھینکی اور آواز کی مخالف سمت دوڑتا ہوا، جھاڑیوں سے نکلا اور کماد کے کھیت میں گھس گیا۔

''وہ دیکھ۔۔وہ دیکھ۔۔سامنے جھاڑی میں۔۔کوئی بھاگ رہا ہے'' پہلا شخص اُس کا پیچھا کرتے ہوئے دہاڑا۔

''ابے اُسے چھوڑ۔۔خون میں لت پت اپنی معصوما کو دیکھ۔۔'' دوسرا شخص بین کے انداز میں چیخا اور کاندھے پر پڑا بڑا سا رومال اُس کے نچلے ننگے دھڑ پر ڈال دیا''پتا نئی جندی ہے کہ مرگئی!''۔

پہلے شخص نے واپس پلٹتے ہوئے جب بچّی کی حالت دیکھی تو اُس کی بھی چیخ نکل گئی''ظالم تجھ سے خدا نمٹے''۔

وہ جھاڑیوں سے آتی آوازوں کو پیچھے چھوڑتا گھبراہٹ اور صدمے کی حالت میں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا، کماند کی تیار اور کھڑی فصل کے درمیان چلنے میں اُسے دقّت تو ہو رہی تھی مگر وہ ماں کے پاس پہنچنے سے پہلے ان لوگوں کے ہتّھے چڑھنا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے اُس نے اپنی رفتار بنائے رکھی۔آج اُس نے جذبات کے عالم جو کیا وہ اُس پر دل سے نادم تھا اور نہیں چاہتا تھا اُس کا انجام ایسا ہو، مگر اب یہ ہو چکا تھا اور اُس کا مداوا کسی صورت ممکن نہیں تھا، کاش اُس نے میری بات مان لی ہوتی، یہ سوچتے ہوئے وہ رو پڑا، کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا جب اُسے یقین ہو گیا، پیچھے کوئی نہیں آ رہا، وہ کھیت سے نکل کر گاؤں جانے والے کچّے راستے پر آ گیا۔

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اُس کا بھرا بھرا سیاہ چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے چمک رہا تھا، دونوں ابھرے رخساروں پر آمد شباب کے دانے، کچھ پیلے اور کچھ سرخی مائل بیل بوٹوں کی طرح سجے ہوئے تھے، دو چار دانے جو اپنی بہار دکھلا کر مرجھا چکے تھے، ان کی اور چہرے کی رنگت ایک ہو گئی تھی اور غور سے دیکھنے کے بعد، وہ دھبّوں کی صورت نظر آتے تھے۔

شدید گرمی اور مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے اُسے پانی کی طلب شدّت سے محسوس ہو رہی تھی، وہ احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے قریب ہی کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالی میں اُترا اور اُس کے گدلے پانی سے اپنی پیاس بجھانے لگا، پانی پینے کے دوران جب اُس کی نگاہ اپنی قمیض پر لگے خون کے چھینٹوں پڑی تو وہ سہم گیا اور اُس کے دماغ میں وہ منظر گھوم گیا جب بچّی زیادتی کے وقت بری طرح مچل رہی تھی اور اُس کی چیخ و پکار دبانے کے لیے ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا تھا۔

وہ غصّے سے کانپ اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ زور زور سے پانی پر مارنے لگا، کچھ دیر اسی کیفیت میں رہنے کے بعد اُس نے دوبارہ قمیض پر لگے خون کے چھینٹوں کی طرف جو پانی لگنے کی وجہ سے اب پھیل کر چھوٹے بڑے دھبّوں میں تبدیل ہو گئے تھے، توجہ کی اور اپنی قمیض اتار کر اُنہیں رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا، جب کبھی اُس کا ہاتھ خون کے دھبّوں پر لگتا، کبھی اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا اور کبھی وہ مغموم ہو کر آہستگی سے انہیں مٹانے لگتا، اس لمحے اُس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو بھی ان میں شامل ہو جاتے۔

اُس نے قمیض نچوڑ کر ابھی پہنی ہی تھی کہ کنارے پر لگی لمبی گھاس میں کسی چیز کے گرنے کی ہلکی سی آواز آئی اور ساتھ میں اوپر درخت پر پرندوں کا شور بھی اُٹھا، وہ چونک کر فوراً اُس طرف بڑھا اور وہاں پرندے کے ایک بچّے کو جسے انڈے سے نکلے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، چونچ کھولے گھاس پر بیٹھا دیکھ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور اندر کا بچپنا جاگ اُٹھا، کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا اور بچّے کو ہتھیلی پر رکھ کر پیار کرنے لگا، اس اثنا میں پرندوں کا شور بڑھ گیا، اُس نے نظر اُٹھا کر اوپر درخت کی جانب دیکھا، اوپری شاخ کے آخری سرے پر بنے گھونسلے کے قریب مینا کا ایک جوڑا بچّے کے گرنے پر مسلسل شور کر رہا تھا، اُس سے ماں باپ کی تڑپن دیکھی نہیں گئی اور وہ بچّے کو اپنی بغلی جیب میں رکھ کر بندر کی طرح تیزی سے درخت پر چڑھا اور بچّے کو گھونسلے میں دوسرے بچّوں کے ساتھ رکھنے کے بعد، اُلٹے قدموں نیچے اُتر آیا، مینا کے جوڑے کا شور اب بھی جاری تھا مگر یہ شاید شکرانے کا تھا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی اور یہ دیکھ کر وہ اب پھریرے ہو چکے ہیں اور ان پر کوئی دھبّہ یا نشان بھی نہیں ہے مطمئن ہو گیا اور اعتماد سے گھر کی طرف بڑھنے لگا، محلّے کی مسجد کے باہر اُسے پولیس موبائل کے ساتھ کھڑے پیش امام اور ایک پولیس افسر آپس میں باتیں کرتے نظر آئے، وہ انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا اور کنّی کترا کے وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ پیچھے سے پیش امام کی آواز آئی اور اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب قدم بڑھا دیے۔قریب پہنچ کر اس سے پہلے وہ کچھ پوچھتے، اس نے گھبرا کے بولنا شروع کر دیا۔

''وہ مولوی صاحب، میں۔۔اپنے بابے کو کھانا دینے گیا تھا لیکن وہاں۔۔''۔

''اوہاں پتّر، مجھے معلوم ہے'' انہوں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''تیری ماں نے مجھے بتا دیا تھا''۔

پھر وہ پولیس افسر سے مخاطب ہوئے''جناب یہ قاسم۔۔ہمارے گاؤں کا ہونہار فرزند، دن ہو یا رات، آندھی آئے یا طوفان، یہ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے، بڑا ہم درد اور نیک انسان ہے، خاص طور پر مسجد کی دیکھ بھال اور اس کی صفائی ستھرائی کے کاموں میں یہی پیش پیش رہتا ہے''۔

''بہت خوب، کاش ایسا جذبہ ہر نوجوان میں پیدا ہو جائے'' پولیس افسر نے جواباً کہا۔

اُن کی باتوں سے قاسم کو اندازہ ہو گیا، وہ اصل واردات سے لاعلم ہیں، یہ سوچ کر اُس کا خوف کچھ کم ہوا، اس دوران ایک سنتری نے پولیس افسر کے کان میں وائرلیس پر آیا کوئی پیغام دیا، پیغام سن کر اُس نے فوراً سنتریوں کو وین میں بیٹھنے کے لیے کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا، وہ بھی فوری جان چھٹنے پر دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا اور موقع پا کر پیش امام کو اللہ حافظ کہتا ہوا گھر کی جانب چل پڑا۔

دروازے میں لگی کنڈی دیکھ کر وہ سمجھ گیا امّاں اور چھوٹی گھر پر نہیں ہیں، کنڈی کھول کر اُس نے جیسے ہی اندر قدم رکھا، اُسے دائیں جانب ماموں زاد رضیہ جو اُس کی منگیتر بھی تھی کپڑے دھوتی نظر آئی، بغیر دوپٹے کے پانی اور پسینے میں شرابور اُس کی سفید قمیض باریک سی جالی بنی ہوئی تھی اور بیٹھنے سے اُس کا گلا نہ صرف بڑا ہو گیا تھا بلکہ اُس میں سے اُس کا گورا اور صحت مند سینہ نکلا پڑ رہا تھا۔

رضیہ نے قاسم کو جب اپنے سامنے کھڑا اور سینے کی طرف متوجہ پایا تو وہ بجائے خود کو سمیٹنے اور شرمانے کے، شرارت سے مسکرائی اور اپنی کمان نما بھنوؤں کو حرکت دیتے ہوئے اس انداز میں اوپر نیچے کرنے لگی، جیسے پوچھ رہی ہو'' کیا ارادے ہیں؟''۔

اُس کی اس حرکت پر وہ غصہ کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا اور الگنی پر پڑا دوپٹا اُتار کر اُس کے اوپر پھینک دیا، اُسے غصّے کی حالت میں دیکھ کر رضیہ نے پہلے اپنے صابن لگے ہاتھ صاف پانی سے دھوئے پھر اُسے منانے کے لیے اُس کی کمر سے لپٹ گئی۔

''کبھی تو پیار سے بول لیا کر۔۔ ہر وقت چولہے پر بیٹھا رہتا ہے''۔

''دیکھ رجّو، تیری میری ابھی صرف منگنی ہوئی ہے'' وہ خود کو اُس سے چھڑا کر دور ہو گیا اور اُس کی جانب رخ کرتے ہوئے بولا'' جب تو میری بیوی بن جائے گی، سب کچھ کر لوں گا۔۔ اور یہ، یہ حرکت نہ کیا کر جو تو کر رہی تھی۔۔ شرم حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔۔

اور اب تو یہاں سے جا، جب امّاں آ جائے، آ جانا'' اُس نے روکھے پن سے کہا اور اندر چلا گیا۔

''ہوں۔۔ بڑا مولوی بنا پھرتا ہے'' یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ماں کھانے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور قاسم کے سامنے رکھ کر، وہیں ستون کے سہارے بیٹھ گئی۔

''خیریت، تو ایسے کیوں بیٹھ گئی، روٹی نہیں کھائے گی؟''۔

''نہیں پتر، طبیعت ٹھیک نہیں، جی بہت گھبرا رہا ہے۔۔ خدا خیر کرے'' وہ پاس رکھا ہاتھ کا پنکھا اُٹھا کر جھلنے لگی۔

''تیری خالا نے حکیم کا دیا شربت پلایا تو ہے۔۔ وہ کہہ رہی تھی اس سے جی بھی سنبھل جائے گا اور نیند بھی گہری آئے گی''۔

''تیرے ساتھ چھوٹی بھی تھی ناں!'' اُس نے بے دلی سے نوالا توڑتے ہوئے پوچھا۔

''وہ وہیں رک گئی، آج تیرے خالو کی نیاز ہے ناں۔۔

اور یہ رجّو کہاں چلی گئی آدھے کپڑے بغیر دھوئے چھوڑ کر؟''۔

''میں نے گھر بھیج دیا، مجھ اکیلے کی موجودی میں اُس کا یہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا''۔

''اچھا کیا، میری طبیعت کی وجہ سے میرا ہاتھ بٹانے آ گئی تھی''۔

قاسم نے کھانے کی ٹرے اپنے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف کھسکائی اور ماں کے پہلو میں جا کے لیٹ گیا۔

''ارے یہ کیا۔۔ تو نے کھانا ادھورا کیوں چھوڑ دیا؟''۔

''دل نہیں چاہ رہا'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، دو موٹے موٹے آنسو اُس کے گال سے ڈھلک کر ماں کی شلوار میں جذب ہو گئے۔

وہ پیار سے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی'' خیر تو ہے پتّر۔۔ تیرا باپ ٹھیک ہے؟''۔

اُس نے ماں کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات شروع کر دی'' امّاں یہ جو نفس ہے نا، اگر قابو میں رہے تو عزت ہی عزت لیکن ذرا سا ڈگمگا جائے تو یہ انسان کو ذلّت کی ایسی گہری پاتال میں لے جاتا ہے جہاں سے واپسی کسی صورت ممکن نہیں۔۔ ان نفس پرستوں میں بعضے تو بڑے ظالم ہوتے ہیں'' یہ کہتے ہوئے غصّے سے اُس کے چہرے کا رنگ اور گہرا ہو گیا'' وہ نہ صرف اپنی عمر کا بلکہ اُن لوگوں کی عمر، جنس اور رشتے کا بھی لحاظ نہیں کرتے جن کو وہ اپنی درندگی کا نشانہ بنا رہے ہوتے ہیں، میرا بس چلے تو انہیں سرِ عام گولی مار دوں''۔

''تو اور گولی۔۔ چڑی سا تو دل ہے تیرا، اتنی ہمت کہاں سے لائے گا؟'' ماں اُس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں امّاں، تو نے صحیح کہا۔ مگر اس کام میں ہمت سے زیادہ سچّے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔ برائی کی یہ آگ شہر دیہات ہر جگہ پھیلتی جا رہی ہے، میں اسے بجھا تو نہیں سکتا لیکن اس پر چڑیا کی طرح پانی کا قطرہ تو ڈال سکتا ہوں''۔

''بالکل بیٹا، ہمیں اتنا تو کرنا چاہیے، تاکہ ان درندوں سے ہم اپنے بچّے محفوظ رکھ سکیں۔۔ تو نے پچھلے مہینے برابر والے گاؤں میں ہونے والا واقعہ نہیں سنا، مسجد کا مولوی۔۔ اللہ اُسے غارت کرے، معصوم بچّے کے ساتھ بدفعلی کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا''۔

''امّاں اب بدّعا کا نہیں، ایسے لوگوں کو مار دینے کا وقت ہے'' اُس نے جذبات میں آ کر کہا۔

''لیکن یہ کرے گا کون؟ ہمارے ملک میں قانون نام کی کوئی چیز ہے۔۔!''۔

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

گوسپ گرل/کھلی کتاب

پرویز شہریار
(نئی دہلی)

نجمہ میری فیس بک دوست تھی۔ وہ سوشل میڈیا کے ادبی حلقوں میں گوسپ گرل کے نام سے مشہور تھی۔

کس کا معاشقہ کس کے ساتھ چل رہا ہے، کون اس صحرانوردی میں نیا وارد ہوا ہے، اس طرح کی ساری خبریں آپ اس کی زبانی سن لیجئے۔ اس کے جاسوسی دماغ میں ہر دم نئے نئے شگوفے سر ابھارتے رہتے تھے۔

مجھے یاد ہے، ہماری پہلی ملاقات اتنی غیر رسمی انداز سے ہوئی تھی کہ ہم اسے بھول نہیں پائے تھے۔

دراصل، نجمہ نے میری کسی ''لوسونگ'' پر بہت ہی غیر رسمی اور ذاتی نوعیت کا کمنٹ کیا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوران، میں انگریزی شاعری کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل ہو گیا تھا۔ اور اکثر اپنی نظمیں فیس بک پر پوسٹ کر دیا کرتا تھا۔ لیکن خیر، میں نے نجمہ کو رسماً ''تھینکس!'' لکھ کر بھیج دیا۔ اس پر وہ کہنے لگی۔ ''کیوں میرا کمنٹ پسند نہیں آیا۔ آپ برا مان گئے؟'' میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ بہت خوبصورت ہیں۔ سلامت رہیں۔ خوش رہیں۔''

اس نے کہا۔ ''معاف کیجیے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ آپ کی نجی محبت کی نظم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا بھی نہیں ہے۔ کچھ تو حقیقت ہوتی ہے، کچھ زیب داستان کے لیے اپنی طرف سے بھی اضافی باتیں لکھنا پڑتی ہیں۔ بس'' بات آئی، گئی ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں میرے اس انکشاف کا اس کے ذہن پر کیا اثر پڑا ہو گا۔ یوں بھی میں اپنے دفتر، گھر بار اور بیوی بچوں میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ ہر ایک کے بارے میں سوچنے کے لیے مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی۔

ہماری دوستی فیس بک پر پروان چڑھتی رہی۔۔۔ وہ وھاٹس ایپ اور میسنجر پر بھی صبح بخیر اور شب بخیر کے میسج بھیجنے لگی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی اس کے خوبصورت سے دعائیہ میسج اور نہایت سلیقے سے لکھے ہوئے الفاظ میں 'نیک خواہشات' کے میسج آنے لگے تھے۔ اس کی چٹ چیٹ سے مجھے جو تاثر ملا وہ یہ کہ نجمہ ایک روشن خیال اور آزاد کی قسم کی خاتون تھی۔ اسے خوبصورت کپڑے زیب تن کرنے اور اچھے کھانے کھانے کے علاوہ، بااخلاق مردوں سے گفت وشنید کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔

ہفتہ کے روز ہم صبح یا شام کے وقت فون پر بھی باتیں کرنے لگے۔ اسے معلوم تھا کہ میں صبح سویرے مارننگ واک پر جاتا ہوں اور دیر رات تک فیس بک اور وھاٹس ایپ پر آن لائن نظر آتا ہوں۔ اس نے میرے پروفائل کو خوب اچھی طرح سے بار بار پڑھا ہو گا۔ تبھی تو وہ اتنی نڈر ہو کے مجھ سے باتیں کر لیا کرتی تھی۔ میں جہاں کہیں جاتا اپنی اسٹوری اور وال پر اپنی تصویروں سے سب کچھ اپڈیٹ کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اسٹیٹس پر بھی اپنی تصویر ڈال دیتا تھا۔

میری بیگم اکثر کہا کرتی تھی۔ ''کوئی آپ کے ڈیٹا ہیک کر لے گا۔ آپ اس طرح سے اپنا بایوڈیٹا، فون نمبر اور ای میل آئی ڈی سب کچھ فیس بک پر نہ ڈالا کریں۔'' میں ان سے کہتا۔ ''میرے پاس ایسا کون سا خزانہ ہے، جسے کوئی بھی ہیک کر کے لے جائے گا۔'' لیکن دل میں ڈر بھی محسوس ہوتا کہ محتاط رہنا چاہیے۔ میں نے کبھی اپنے پروفائل کو لاک نہیں کیا تھا اور نظمیں بھی اوپن فائل میں اپلوڈ کر دیا کرتا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ''تخلیق کا مطلب اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ اسے محدود کرنے سے کیا فائدہ!''

نجمہ ایک شریف خانوادے سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی جلدی ہو گئی تو بچے بھی جلدی ہو گئے۔ لیکن اس کی فیملی کی خوشحالی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ نا جانے کس کی نظر لگ گئی اور شوہر کا ایک خوفناک سڑک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ناگہانی، اس کی پر بہار زندگی خزاں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اپنی جوانی میں مرد کی قربت سے اچانک محروم ہو گئی تھی۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ, نجمہ مجھ سے بے خوف وخطر گفتگو کرنے لگی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہم دونوں میں ایک قدر مشترک تھی وہ یہ کہ ہم دونوں ہی افسانہ نگار تھے۔ اور گھورے کی پستی سے لے کر سات ثوریا کی بلندی تک ہم کسی بھی موضوع پر بلا تکلف تبادل؟ خیال کر لیتے تھے۔ الغرض، وہ میری باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

وہ اپنے افسانے مجھ سے شیئر کرتی اور اس کے بعد اس پر مجھے اظہار خیال کرنے کے لئے اصرار کرتی۔ محبت اور جذباتی رشتوں پر مجھ سے داد طلب کرنا چاہتی۔ میں بہت ہی ادبی دیانتداری سے اس کے افسانوں پر برملا اظہار کر دیتا تھا۔ وہ بحث کرتی اور دلائل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ مجھے اس کی باتوں کو ماننے میں بھلا کیوں تامل ہوتا، میں جو بات درست ہوتی اسے بے چوں وچرا تسلیم کر لیتا۔

ہر فنکار کو اپنا 'ولڈ ویژن' پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔

میری اس بات سے وہ بہت خوش ہوتی۔ ''پرویز صاحب! آپ مجھے اردو والے لگتے نہیں ہیں۔ اردو والے بڑے دل پھینک قسم کے ہوتے ہیں اور بات بات پر شعر سنانے لگتے ہیں۔ مجھے تو بہت الرجی ہوتی ہے، ایسے لوگوں سے۔''

رفتہ رفتہ وہ مجھ سے فرینک ہوتی گئی اور اب بات افسانہ لکھنے سے پہلے اچھے موضوعات کے انتخاب اور اس کی صداقت کی توثیق کا بھی احاطہ کرنے لگی تھی۔ ایک دن اس نے پوچھ لیا۔ ''مردوں کو بھی مینو پاز ہوتا ہے, کیا؟'' میں نے بھی ہنس کہہ دیا۔ ''مردوں کو بھلا مینو پاز کیوں ہونے لگا۔ انھیں پیریڈز آتے

ہیں، کیا؟'' اس نے میری باتوں کو بڑی توجہ سے سنا۔ پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگی: ''میں ایک افسانہ لکھ رہی ہوں۔ اس میں ہیرو کی عمر 65 سال ہے۔ اب وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن لڑکی اولاد کی جویا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی گود ہری ہو تو آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ اس عمر میں آدمی بچے پیدا کرسکتا ہے، یا نہیں؟'' میں نے اس کے ایسے اوٹ پٹانگ سے سوال سن کے کہا۔ ''کوروں کے کتنے بچے تھے؟'' وہ ہنس کے کہنے لگی۔ ''ارے، ہٹ! میں تو آج کے دور کی بات کر رہی ہوں۔ آج بھی ہوسکتا ہے'' میں نے کہا۔ ''اگر کھان پان اسی طرح کے ہوں۔''

کچھ عرصہ جب گزر گیا تو ایک دن پھر میری فیس بک فرینڈ نجمہ کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

''میری ایک سہیلی ہے, اس کی عمر 46 سال ہوگئی ہے. وہ ایک 55 سال کے پروفیسر سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اسے ڈر ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو پائے گی بھی یا نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''یہ ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وہ کیسی صحبت میں رہتے ہیں اور کیسے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔'' نجمہ نے کچھ سوچ کے کہا۔ ''میری سہیلی تو شادی کرنے کے لیے بہت بیتاب ہے. اس کے تو ہول اٹھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ شادی نہ ہوئی میری تو میں مرجاؤں گی۔'' میں نے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ نکاح تو سنت ہے۔ مجرد زندگی گزارنے سے بہتر ہے، انسان اپنا گھر بسالے۔ اگر کسی انسان کے اندر خود اعتمادی اور کچھ کر گزرنے کے عزائم ہیں۔ تو اسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔'' میں نے مزید کہا۔ ''مرد، کتنا بھی ٹھس کیوں نہ ہو، عورت اگر چاہے تو اسے پل بھر میں رام کرسکتی ہے۔''

میرا جواب سن کر وہ کہنے لگی۔ ''پرویز صاحب! جس گھوڑے کو پیاس ہی نہ لگی ہو، اسے بھلا پانی کیوں کر پلایا جاسکتا ہے؟'' میں نے یوں ہی رواروی میں کہہ دیا۔ ''اس میں کیا بات ہے، اسے اتنا دوڑاؤ، اتنا دوڑاؤ کہ وہ خود بخود پانی کا متلاشی ہوجائے۔'' یہ سن کر وہ ہنسنے لگی۔ ''آپ کی باتوں میں تو واقعی دم ہے۔'' یہ سن کر میں بھی کچھ دیر کو حیران رہ گیا۔ ایسا، میں نے کیا کہہ دیا۔

مجھے خاموش پا کر وہ بہت سنجیدگی سے کہنے لگی: ''بہت افسوس ہوتا ہے۔ جب اچھے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ویل سیٹلیڈ لوگوں کو دیکھتی ہوں کہ بیٹھا برس گزر جانے کے بعد بھی انھیں من پسند رشتہ نہیں ملتا ہے تو وہ تنہا رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ لیکن انسان کے فطری تقاضے کہاں رکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے جوان مرد اور عورتیں حرام کاری میں آئے دن مبتلا ہوتے جارہے ہیں۔" مجھے اس کی سنجیدگی سے کہی گئی باتوں سے لگا۔ وہ بھی جین آسٹن کی طرح سوچنے لگی ہے۔ انگریزی ناول نگار خاتون جین آسٹن کی نسوانی کردار 'میچ میکنگ' کے لیے مشہور ہوا کرتی تھیں۔

میں نے دل میں سوچا۔ ''جس تن لاگے وہ تن جانے''، موسم بہار کی سنہری دھوپ کی تمازت کی قدر وہی کرسکتا ہے، جس نے موسم خزاں کی سرد طویل راتیں بھی جھیلی ہوں۔

مجھے یاد ہے۔ ایک بار اس کتابی چہرہ، ستواں ناک اور گندمی رنگت والی نجمہ نے مجھے بتایا تھا:

''پرویز صاحب! میری زندگی تو ایک کھلی کتاب ہے۔ میں چاہتی تو دوسری شادی کرسکتی تھی۔ میرے والدین بھی چاہتے تھے کہ میں نکاحِ ثانی کرلوں۔ لیکن، میں نے اپنے بچوں کی پرورش کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ ان کی تعلیم و تربیت میری ترجیحات میں شامل تھیں۔ لیکن، میرا مشورہ کنوارے لوگ سے ہے کہ وہ للہ ایسا نہ کریں۔''

وقت کا تنہا پنچھی اپنا سفر دن رات طے کرتا رہا...

کچھ دنوں کے بعد کسی ہفتہ یا اتوار کے روز نجمہ کا پھر فون آیا۔ کہنے لگی۔ ''میں نے اپنی سہیلی کو آپ کی باتیں سنادی تھی۔ ان دونوں نے ملاقات کی۔ میری سہیلی نے بڑے ڈورے ڈالنے کی کوشش کی مگر بڑے میاں، سارا وقت اپنے بچپن کی کہانیاں اور ماں کی فرمانبرداری کے قصے سناتے رہے، بس اور اس بیچاری کے نہ کپڑوں کی تعریف کی اور نہ ہی اس کے سڈول بدن اور اس کی خوبصورتی کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا۔''

''دیکھیے!'' میں نے کہا۔ ''مرد کو عورت ہی محبت کرنا سکھاتی ہے۔ آپ کی سہیلی کو 'انیشی ایٹیو' لینا چاہیے تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا ہے۔ منع کر دیتے۔ لیکن اخلاقیات کا پاٹھ پڑھانے اور اپنی پارسائی کی دھائی دیتے رہنے سے بات نہیں بنے گی۔''

''نہیں پرویز صاحب، ایسا نہیں ہے۔ عورت کو ''رجیکشن'' کا خوف بہت ستاتا رہتا ہے۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتی ہے، لیکن اپنی استرداد برداشت نہیں کرپائے گی۔''

کئی مہینوں کے بعد ایک دن نجمہ کا فون آیا۔

''پرویز صاحب! مبارک ہو۔'' وہ اپنی آواز اور انداز سے بہت خوش معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کس بات کی مبارکباد۔ پہلے یہ تو بتا دیجیے۔''

''آپ کا نسخہ کام کرگیا۔'' نجمہ نے پرجوش لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''میری سہیلی کی گود بھر گئی۔''

''وہ کیسے؟'' میرے دریافت کرنے پر نجمہ نے تفصیل سے بیان کیا:

''دراصل' پروفیسر صاحب کی والدہ ایک دن اچانک رات کے اندھیرے میں واش روم جانے کے لیے اٹھیں۔ اپنے بستر سے نیچے قدم رکھتے ہوئے فرش پر گر گئیں۔ گرنے سے ان کے ہپ بون میں ہیئر فریکچر آگیا۔ چلنا پھرنا بالکل محال ہوجانے سے وہ بستر پر مستقل پڑ گئیں۔ درد اتنا شدید تھا کہ انہوں نے کھانا پینا سب ترک دیا۔ ڈاکٹر نے پروفیسر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا۔ ''جتنی ہوسکے، خدمت کرلیجیے۔ آپ کی والدہ اب چند ہی دنوں کی مہمان ہیں۔''

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

ترازو

تابش خانزادہ
(لاس اینجلس)

جمشید سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے پھر بھی میں انہیں ماموں کہتا ہوں۔ میری امی بھائی کہتی ہیں، میرے نانی اور نانا جان اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں جس کی وجہ ان کی میرے حقیقی ماموں لطیف سے بے لوث دوستی ہے۔ ماموں لطیف کو جمشید ماموں کے گھر والے بھی اسی طرح عزیز سمجھتے ہیں جیسے ہم جمشید ماموں کو۔ یہ دونوں اگر ایک دوسرے کے گھر پر نہیں پائے جاتے تھے تو گھر سے باہر اکٹھے ہوتے تھے۔ اُن کے شوق ایک تھے اور اُن کی منزل ایک تھی۔ میں نے جڑواں بھائیوں کو کبھی اتنا قریب نہیں دیکھا جتنا ان دونوں کو۔ امی بتاتی ہیں کہ بچپن میں تین سالہ جمشید اپنے گھر والوں کے ساتھ ان کے پڑوس میں رہتا تھا اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے ماموں لطیف کے ساتھ کھیلتا تھا۔ پھر دونوں ایک پرائمری اسکول میں داخل ہوئے، دونوں ایک ہائی اسکول میں پڑھے۔ کالج بھی ایک ساتھ گئے، ایک ہی ساتھ دونوں کو فوج میں کمیشن ملا، حتیٰ کہ انہوں نے اپنی شادی کا بھی ایک ہی دن مقرر کیا تھا۔ ایک ساتھ بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہونے پر ایک دوسرے کے قریب گھروں میں رہتے ہیں اور آج بھی دونوں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی دوستی نبھا رہے ہیں۔ ان کی دوستی کی وجہ سے تین نسلیں ایک دوسرے کے ایسے ہی قریب ہوگئیں جیسے وہ خود تھے۔

میرے لیے ان کی دوستی باعثِ حیرت اس لیے بھی تھی کہ دوستی ٹوٹنے کے کئی بہانے ہوتے ہیں۔ بچپن میں گھر والے، محلے والے، نوجوانی میں کالج میں اپنی اپنی اڑان، شادی کے بعد بیوی بچوں کی ذمہ داریاں، بیوی بچوں کی آپس میں اَن بَن اور ناچاقیاں۔ اس کے علاوہ نہ جانے دوستی ٹوٹنے کے کتنے سو اور بہانے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں جیسے چار سال کی عمر میں تھے، جیسے دس سال کی عمر میں تھے، جیسے تیس سال کی عمر میں تھے اور جیسے اب ساٹھ سال کی عمر میں ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز، فرقے اور دوسری وجوہات نے بھی ان کی دوستی پر کبھی کوئی بُرا اثر نہ چھوڑا تھا۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول گیا کہ جمشید ماموں شیعہ جبکہ ہم سنی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔

مجھے ہمیشہ سے جستجو تھی کہ آخر وہ کیسا جادو ہے یا کونسا ایسا بندھن ہے جس نے پہلے جمشید اور لطیف ماموں کے گھر والوں کو اور اب اُن کے بیوی بچوں کو مضبوطی سے باندھا ہوا ہے۔ پھر ایک دن موقع پا کر جمشید ماموں سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جس کا جواب سننے کے لیے نہ جانے میں کب سے بیتاب تھا، ماموں آپ ایک دوسرے کے اتنے اچھے دوست کیسے بنے تھے؟ میرے سوال پر جمشید ماموں کچھ دیر خلاؤں میں گھورتے رہے پھر مسکرا کر جواب دیا، یوں تو ہم بچپن سے دوست تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ہم محلے دار، ہم عمر اور ہم جماعت تھے اور بس۔ پھر ایک ایسا انقلاب آیا جس نے ہمیں ایک دوسرے کی ابدی دوستی کا تحفہ دیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تھا جب ایک روز کالج میں ایک فوجی سلیکشن کمیشن ایف اے کے طلبا کا انٹرویو لینے پہنچ گیا۔ ہم دونوں بھی بغیر سوچے سمجھے انٹرویو دے آئے اور پاس ہو گئے۔ ایک ماہ بعد ہمیں آئی ایس ایس بی کے امتحان کے لیے کوہاٹ طلب کیا گیا۔ آئی ایس ایس کے لیے جانے کو میرا دل تو بہت چاہتا تھا لیکن میرے گھر والوں کے پاس پیسے نہیں تھے اور مجھے معلوم تھا کہ لطیف کے گھر والوں کا حال بھی پتلا تھا۔ میرے پاس ایک گھڑی تھی اور دو راستے کہ یا تو اپنی گھڑی بیچ کر خود چلا جاؤں یا پھر لطیف کو جانے کے لیے رقم دے دوں۔ ایک دوست ہونے کے ناطے مجھے معلوم تھا کہ لطیف کتنے شوق سے فوج میں کمیشن لینا چاہتا تھا۔

ایک دن اپنی گھڑی بیچی اور رقم جیب میں ڈال کر اس نیت سے لطیف کے ہاں گیا کہ وہ پیسے چپکے سے اُسے پکڑا دوں گا تا کہ وہ فوج میں جانے کی اپنی حسرت پوری کرے۔ لطیف مجھے راستے میں ملا اور وہ بھی میری تلاش میں میرے گھر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ وہ مجھے ایک تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی اُس نے تیس روپے میری ہتھیلی پر رکھے اور کہا تم ان پیسوں سے آئی ایس ایس بی کا امتحان دینے کوہاٹ چلے جاؤ۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹ گئیں اور بہتی آنکھوں سے اس سے پوچھا، تم نے یہ پیسے کہاں سے لیے ہیں؟ اپنی گھڑی بیچ کر تمہارے لیے یہ پیسے حاصل کیے ہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم فوج میں جانے کے کتنے متمنی تھے، لطیف نے جواب دیا۔ میں نے بھی اپنی جیب سے روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے اور اسے بتایا، میں بھی اپنی گھڑی بیچ کر تمہارے لیے اٹھائیس روپے لے کر آیا ہوں تا کہ تم آئی ایس ایس بی کے لیے جاؤ۔ اُس روز ہم نے ایک دوسرے کو روپوں کا نہیں ازلی دوستی کا تحفہ دیا تھا۔ تحفہ قبول کر کے ہم دونوں ایک دوسرے سے دیر تک بغلگیر رہے اور دونوں نے آئی ایس ایس بی پاس کر کے فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ یہ کہتے ہوئے ماموں جمشید کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور زبان نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ماموں کچھ دیر کے لیے خاموش رہ کر اپنے جذبات سمیٹتے رہے اور میں بھی اتنی دیر تک اپنے آنسو پونچھ کر سنبھل چکا تھا، اس لیے ایک اور سوال کیا، ماموں آپ نے ایک دوسرے کو دیا ہوا تحفہ وصول کر لیا پر اب تک اُسے سنبھال کر کیسے رکھا ہے؟ نہ آپ کی دوستی کو زمانے کی نظرِ بدگی اور نہ ہی وقت کی سختیوں نے آپ کی دوستی کو زنگ آلود کیا۔ آج بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اور مل کر آپ کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے جو آج سے پچاس برس پہلے آیا کرتی تھی۔

ماموں نے سوال کا جواب دینے سے پہلے پانی مانگا تو میں نے انہیں ایک گلاس پانی دیا۔ پانی پی کر اُن کا چہرہ پُرسکون ہوا، خالی گلاس ایک طرف رکھا اور کہنے لگے۔ دنیا میں تین اقسام کے رشتے پائے جاتے ہیں۔ پہلا رشتہ خونی ہوتا ہے جو اٹوٹ ہے اور نہ انسان کی مرضی سے شروع ہوتا ہے اور نہ ہی انسان کی مرضی سے ختم ہوتا ہے۔ یہ رشتہ کچھ وجوہات کی بنا پر عارضی طور پر منقطع ضرور ہو سکتا ہے لیکن مستقل طور پر مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ رشتے بہن بھائی، چچا،

باقی صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ کیجیے

"جذبۂ ایماں"

پنڈت برج نارائن چکبست

(۱۹۔جنوری۱۸۸۲ء تا ۱۲۔فروری۱۹۲۶ء)

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نو گرفتار بلا طرز وفا کیا جانیں
کوئی نا شاد سکھا دے انہیں نالاں ہونا

روکے دنیا میں ہے یوں ترک ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سائے سے گریزاں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

ہے مراضبط جنوں جوش جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لیے چاک گریباں ہونا

قید یوسف کو زلیخا نے کیا کچھ نہ کیا
دل یوسف کے لیے شرط تھا زنداں ہونا

○

معین نظام

(سرگودھا)

میں نے کہا تھا آج نہ جائیں گھوڑے بے حد تھکے ہوئے ہیں
اس نے کہا تھا جانا طے ہے دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا دائیں طرف کی گھاٹی میں ہم چھپ جاتے ہیں
اس نے کہا تھا ناممکن ہے تیروں میں ہم گھرے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا غار میں کاٹیں ہجرت رت کی پہلی راتیں
اس نے کہا تھا اس کے بلوں میں سانپ اور بچھو چھپے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا پیاس کے مارے کالی ریت پہ مر جائیں گے
اس نے کہا تھا ٹھیک ہے لیکن دو مشکیزے بھرے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا اس سے آگے چھپنے کی کیا صورت ہوگی
اس نے کہا تھا ڈرتے کیوں ہو آگے قلعے بنے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا دو ہی ہیں ہم شہر ستم سے جانے والے
اس نے کہا تھا بستی میں کچھ اور بھی ساتھی رکے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا سنتے ہو تم پیچھے پیچھے آتی ٹاپیں
اس نے کہا تھا ہم بھی عجب ہیں دورا ہے پر رکے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا اب کیا ہوگا دشمن سر پر آ پہنچا ہے
اس نے کہا تھا غار کے منہ پر لاکھوں جالے تنے ہوئے ہیں

میں نے کہا تھا یہ تو بتاؤ کس کی طرف مہمانی ہوگی
اس نے کہا تھا یثرب والے اک دوجے سے بڑھے ہوئے ہیں

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

روشنی کوئی نہیں اِس شہر میں
کیا ابھی کوئی نہیں اِس شہر میں ؟

کل بھی طاری تھیں یہاں خاموشیاں
آج بھی کوئی نہیں اِس شہر میں !

لوگ چل پھر تو رہے ہیں ہر طرف
زندگی کوئی نہیں اِس شہر میں !

کچھ نہیں، اِس شہر میں کچھ بھی نہیں!
گو کمی کوئی نہیں اِس شہر میں

سارے منظر اِس کے ہیں حیران کُن
حیرتی کوئی نہیں اِس شہر میں !

دِل کسی کا توڑ دینا بے سبب
بات ہی کوئی نہیں اس شہر میں

اُمڈا پڑتا ہے کبھی افراد سے
اور کبھی کوئی نہیں اس شہر میں !

چار سُو سڑکوں کا اِک جنگل سا ہے
اور گلی کوئی نہیں اس شہر میں

ماتمی دُھن بجتی رہتی ہے یہاں
کیا خوشی کوئی نہیں اس شہر میں؟

کر رہے ہیں ہم کوئی دشمن تلاش
دوست ہی کوئی نہیں اس شہر میں

لوٹ جانے کو بھی جی کرتا نہیں
کام بھی کوئی نہیں اس شہر میں

کالے حرفوں میں یہاں تحریر ہے
تیرگی کوئی نہیں اس شہر میں

اُس کے جاتے ہی نسیم ایسا لگا
دلکشی کوئی نہیں اس شہر میں

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا)

دھوپ میں تھے جو شامیانے لوگ
کھو دیئے ہم نے وہ پُرانے لوگ

قہقہے، گفتگو، دھویں کے غبار
بھول بیٹھے ہیں چائے خانے لوگ

سونے کی اشرفی ہوں میں پھر بھی
مجھ کو لگتے ہیں آزمانے لوگ

تُمکو بھولا تھا مشکلوں سے میں
آگئے پھر سے دل دکھانے لوگ

ابر جب آسماں پہ چھاتا ہے
یاد آتے ہیں تب سُہانے لوگ

آپ ماضی میں زندہ ہیں جاوید
گا رہے ہیں نئے ترانے لوگ

○

اشرف جاوید
(لاہور)

دفتر کھلا ہوا ہے مکافات کے قریب
آتا ہے لمحہ لمحہ حسابات کے قریب

سوچا نہیں تھا تخت بھی جائے گا، تاج بھی
حالات آ رہیں گے حوالات کے قریب

ہو جائیں گے ثبوت و دلائل تمام شُد!
بے بس کھڑے رہیں گے جوابات کے قریب

تھوڑی بہت ہَوا ہے غبارے میں، دیکھنا!
کام آئے گا نہیں کوئی حاجات کے قریب

ایوانِ اقتدار سے نکلے تو آ بسے
بے خانماں خراب مضافات کے قریب

یہ زندگی ہے، اس کے تو چالے نرالے ہیں
لے آتی ہے کبھی کبھی آفات کے قریب

شاید کوئی سراغ ملے، کچھ پتا چلے
اک خط پڑا ہوا ہے مقالات کے قریب

جوشِ بیان میں نظر آتا نہیں اُسے!
زنجیر بھی پڑی ہے بیانات کے قریب

اُس کو خبر کہاں ہے نشیب و فراز کی
پھٹکا نہیں ہے ریت و روایات کے قریب

○

عذرا پروین
(لکھنؤ)

میں جل رہی تھی مگر اک جہان رقص میں تھا
میں وہ مکین تھی، جس کا مکان رقص میں تھا

یہ کس کے جبر سے گونگا ہوا بدن میرا
یہ کس بساط پہ صید زمان رقص میں تھا

میں بے نشاں ہوں گاتی رہی فنا مجھ میں
اس کی دھن پہ مرا ہر نشان رقص میں تھا

کسی انام کی دستک نے ایسی وحشت دی
زمیں سے تیز مرا آسمان رقص میں تھا

مجھے بکھر کے بھی رقصندہ رہنا تھا کیوں کہ
مرے ثبات کا سارا گمان رقص میں تھا

○

خورشید طلب
(جمشید پور)

دکھائی دیتا ہے دشمن تمہیں زمانہ کیا
تمہارے ہاتھ لگا ہے کوئی خزانہ کیا

جو تم یہاں وہاں آنسو بہاتے پھرتے ہو
تمہیں نہیں ہے میسّر کسی کا شانہ کیا

یہ جگنوؤں کے تعاقب میں اتنی رات گئے
بجھا کے آئے ہو اپنا چراغِ خانہ کیا

فریفتہ تھے کسی ڈومنی پہ غالب بھی
معاشقے میں بھلاجات، گھر، گھرانہ کیا

جہاں بھی شام ہوئی بال و پر سمیٹ لیے
ہمارے جیسے پرندوں کا آشیانہ کیا

جمالِ یار جو بارِ دگر نہیں دیکھا
لپک اٹھا کوئی احساس مجرمانہ کیا

یہ وہ نشہ ہے جو سانسوں کے ساتھ ٹوٹے گا
محبتوں کے لیے عمر کیا زمانہ کیا

ہماری سانسیں بہت تیز چل رہی ہیں طلب
بہت قریب ہے وہ آخری ٹھکانہ کیا

○

نسیم عزیزی
(کلکتہ)

شاہ بنائے، جہانگیر کرے
خود کو وہ سامان _ تشہیر کرے

رخ پہ گلوں کے چمک تیر گئی
کون ہے! خوشبو کو زنجیر کرے

فکر و عمل سے ہمیں واسطہ کیا
کہیے اسے، صرف تقریر کرے

عکس اٹھانے لگا رخ سے نقاب
جس کو سلیقہ ہو، تصویر کرے

خوب رہی آسماں کی عظمت
ہر غلطی ہم سے تعبیر کرے

قوت _ بازو کو کیا زنگ لگا
اپنی زباں کو وہ شمشیر کرے

اس پہ محبت کا رنگ اور چڑھے
میری طرف جب رخ _ تیر کرے

زور _ فریب _ انا ٹوٹ گیا
اس سے کہو اور تدبیر کرے

کھیل دکھائے چراغ _ سحری
خواب میں سورج کو تسخیر کرے

○

ارشد سعید
(آسٹریلیا)

اشک چشمِ کنول میں آتا ہے
کون دستِ اجل میں آتا ہے

راہداری میں پھول بکھرے ہیں
شاہزادہ محل میں آتا ہے

زلف بکھرے یا پھر سنور جائے
ذکر تیرا غزل میں آتا ہے

اپسرائیں نہا رہی ہیں کہیں
حُسن سب گنگا جل میں آتا ہے

اتنی پھیلی ہے اسکی جادوگری
تُو بھی جس کے عمل میں آتا ہے

میری مٹی میں ہے وفا ارشدؔ
ذائقہ جس کا پھل میں آتا ہے

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

تیری محفل میں جو کچھ لمحے گزار آتے ہیں
واپسی پر وہ بڑے باغ و بہار آتے ہیں

تیری باتیں، ترے اندازِ سخن، تیری ہنسی
زندگانی کے کئی لمحے سنوار آتے ہیں

جب تجھے چاہا تو پھر کوئی تکلف کیسا؟
دل کو ہم اپنی خوشی سے بھی تو ہار آتے ہیں

چار دن کی ہے جو یہ زیست، گزاری ہنس کر
سُوئے رب ہو کے بڑے شکر گزار آتے ہیں

سارا دن ساتھ ترے گزرے ہوئے سب لمحے
نیند کی وادی میں بھی کیف اتار آتے ہیں

سب گزر جائیں گے اس خانۂ ہستی سے ریاضؔ
ہم بہرطور یہ لمحے بھی گزار آتے ہیں

○

بڑا آدمی

رخشندہ روحی
(دہلی)

ممبئی ایرپورٹ سے کیب لے کر سیدھا سیمینار ہال روٹری کلب جاؤنگا۔۔پھر فوراً امی کے پاس بریلی جاؤنگا۔۔۔لیکن امی۔۔۔اور امی کو پاپا کی ادبی خدمات پر ہوئے سیمینار کی ساری باتیں سناؤں گا۔۔۔پاپا کی کامیابی اور ناکامی سب۔۔۔امی کو بتاؤنگا۔میری آنکھیں بھر آئیں اور چھلک بھی گئیں۔۔۔ میرے چشمے کے کالے شیشے اگر مجھے سہارا نہ دیتے تو یہ فطری عمل چہرے کو بھگو جاتا۔

فیس بک پر ایک کارڈ ممبئی سے میرے فیس بک دوست نے میری ٹائیم لائن پر شیئر کیا تھا۔۔۔آج سے ٹھیک ۱۵ دن بعد میرے پاپا کی ادبی خدمات پر کوئی تنظیم ایک دن کا سیمینار کر رہی ہے۔۔۔پاپا کی ادبی خدمات پر انکی موت کے ۳۱ سال بعد یہ سیمینار کیا جا رہا تھا لیکن۔۔۔مجھے کوئی کیسے بتاتا؟۔۔۔میرا پتہ ٹھکانہ کسی کو کبھی معلوم ہی نہ تھا۔۔۔اور میں اپنے ملک سے ہزاروں میل دور کینیڈا میں پچھلے 17 سال سے مقیم ہوں۔جب سے یہاں آیا ہوں۔۔۔کئی بار امی کو دیکھنے جانے کا پکا ارادہ کیا لیکن۔۔۔جا نہ سکا۔

میں نے پہلی فرصت میں اس تنظیم کو اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور اپنے خرچے پر اس سیمینار میں شرکت کی اجازت طلب کی۔

ائیرپورٹ سے باہر نکلتے ہی میں کیب کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔''سر۔۔۔آپ کو روٹری کلب لے جانے کے لئے۔۔۔''میرے سامنے ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنے ہاتھ میں پکڑے بورڈ پر چسپاں تصویر سے میری شکل ملاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں ممبئی ائیرپورٹ سے جائے تقریب کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔ ذہن میں ماضی کے دیمک زدہ سیلن بھرے اوراق الٹنے لگے۔

میں پاپا کی موت کے وقت صرف ۱۴ سال کا تھا۔انکے اتنے بڑے ادبی سرمائے کو میں کیسے سنبھالتا۔امی تو پاپا سے اپنے اور اپنے بیٹے کے حقوق کی دعوے دار تھیں۔اسی رسہ کشی میں امی نے پاپا سے بات چیت بند کر دی تھی۔میری پرورش کی پوری ذمے داری امی نے خود ہی اٹھائی تھی۔پاپا نے کبھی اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کیا بلکہ امی کا دل رکھنے کے لئے ہمیشہ انکو سمجھایا کرتے کہ ابھی محنت کا وقت ہے سب ٹھیک ہو جائیگا۔لیکن امی کی کیا غلطی تھی؟۔ایک بڑے سے پھاٹک میں بند ہو کر گھر کے تمام اخراجات کیسے پورے ہو سکتے تھے۔امی نے خاموشی سے کپڑے سیئے۔کڑھائی اور بُنائی کی اور یہاں تک کہ گھر کی پرانی ملازمہ کو بھی بہانہ بنا کر الگ کر دیا کہ اسکا خرچ بھی بچ جائے۔پھر بھی میرا اسکول۔۔۔کاپی۔۔۔ کتب اور رکشہ والے کی تنخواہ۔۔۔دودھ والے کے پیسے۔اور صاف ستھرے لباس۔۔۔ان سب کو تو فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا نہ۔

پاپا کو دھن تھی ایک کامیاب جرنلسٹ بننے کی۔۔۔ایک کمزور فرقہ کی طاقت ور آواز بننے کی۔اور سب مذاہب کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی۔وہ ایک مشن تھے اپنے آپ میں۔لیکن میں اور امی؟؟

ویران دالانوں کے اونچے دروں میں امی دوپہر کی جلتی دوپہروں میں مشین لئے خلا میں گھورا کرتیں۔۔۔اور میں اپنے ہوم ورک کی کاپی کتاب لئے صرف امی کا چہرہ دیکھا کرتا۔اخراجات کی آندھی میں دکان مکان اور باغ دفن ہوتے گئے۔میرے اسکول کی فیس نہ جمع ہونے پر امی پہلی بار پاپا سے سختی سے بولی تھیں۔۔''ابا کو اپنا فرض پورا کرنا تھا۔آپکا گھر بسانا تھا۔انکو تو معلوم تھا کہ آپکے خواب کیا ہیں تو میری قربانی کیوں دی آپکے ابا نے۔۔۔ابا خود تو چلے گئے اور مجھے آپکے خوابوں کے کھنڈر پر اپنی حقیقی زندگی کا چوبارہ تعمیر کرنے کے لئے چھوڑ گئے۔میں اپنے بچے کو آپ کی طرح ہوا محل کی راہداری میں بھٹکنے نہیں دے سکتی۔۔۔میں اپنے سروش کو ایک عظیم شخصیت کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔آپ ہم دونوں کے لئے کسی طرح کی آسائش نہیں دے سکتے تو کم از کم گزر بسر کا انتظام تو کیجئے۔میں اپنے بچے کے ساتھ کسی بڑے شہر چلی جاؤں گی۔وہاں محنت کر سکتی ہوں۔وہاں آپکے زمیندار رتبے کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔۔۔میں اپنے سروش کو ایک بڑا آدمی بنانے میں جی جان لگا دوں گی۔''امی کی ناک سے سوں سوں کی دھمک تیز ہونے لگی۔پاپا نمناک آنکھوں سے اپنی نااہلی اور کم ہمتی کو اداس مسکراہٹ میں پی گئے۔میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے اور امی کو گہری نگاہوں سے دیکھ کر صرف ایک ہی لفظ کہا''۔۔۔لگی۔۔۔''امی نے چولہے پر ابلتی دال میں زور سے کفگیر چلا دیا۔۔۔پاپا اٹھ کر صدر دروازے کے اونچے پھاٹک کو تاکنے لگے۔میں نے امی کی ناک کی سوجن اور آنکھوں میں ابل کر بہتے آنسوؤں کو دیکھا۔۔۔ پاپا گھر کے صدر دروازے کی لکڑی میں دراڑیں پڑے پھاٹک کے دونوں طرف بنی چوکیوں میں داہنی طرف والی چوکی پر اُکڑوں بیٹھ گئے۔چار مینار سگریٹ کی ڈبی نکالی اور مٹھی بند کر کے دونوں انگلیوں کے درمیان سگریٹ دبا کر ہلکے ہلکے کش لگانے لگے۔امی کی ہچکیوں سے انکا دوپٹہ سر پر سے ڈھلک گیا اور پتیلی سے دال ابل کر بہنے لگی۔۔۔اس دن کے بعد پاپا اور امی کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔پاپا کے مضامین اردو اخبارات میں چھپنے لگے۔اور انکی شاعری رسالوں میں۔۔۔چھوٹے سے شہر میں لوگ ہمارے گھرانے کو تعلیم یافتہ مانتے تھے اب تو ذرا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔لیکن بھوک اور اسکول کی کتابیں۔۔۔بجلی کے بل۔۔۔اخباروں میں چھپی غزلوں اور مضامین سے نہیں خریدے جا سکتے تھے۔ایک سرد دھند کے پردوں میں لپٹی رات کو پاپا نے ہم دونوں سے بہت سی باتیں کیں۔۔۔کھانا بھی دیر تک کھایا اور۔۔۔صبح کی ٹرین سے ممبئی چلے گئے۔

میں چوتھی کلاس میں تھا اور امی کے تکیئے کے نیچے ایک خاکی لفافے میں بہت سارے نوٹ رکھے تھے۔۔۔امی نے سارے نوٹ اسی لفافے میں بند کئے۔۔۔پلنگ کے اوپر اسٹول رکھا اور اس پر کھڑے ہو کر الماری کے اوپر بنے بڑے سے طاق میں رکھ دئے۔پاپا خط میں امی کے نام صرف غزل لکھتے یا پھر نظم۔۔۔امی کا ایک بید کا بنا ہوا صندوق تھا امی اسی میں پاپا کے خطوں کو جمع کرتی رہیں۔۔۔میں

دسویں کلاس میں آ گیا لیکن پاپا لوٹ کر نہیں آئے۔امی نے اخبار اور رسالے پڑھنے بند کر دیئے۔۔۔میں دسویں میں فیل ہو گیا۔اور امی نے پہلی بار مجھے مارا۔۔۔اور پاپا کو بہت کچھ کہہ سنایا۔۔۔اب انکے خطوں کو بے کھولے ہی اس صندوق میں بند کر دیا کرتیں۔مجھے ایک سال اور لگ گیا اور میں امی کے خوابوں کی عظیم شخصیت بننے کی تیاری میں جی جان سے جٹ گیا۔۔۔امی نے مجھے دہرادون بھیج دیا۔اب تو امی کی غصہ ور آنکھیں اور گول ناک کو سرخ ہوتے نیند میں ہی دیکھ سکتا تھا۔۔۔ہر پندرہ دن میں امی سے ملنے جاتا اور امی کی ناک کی سرخی میرے بڑے آدمی بننے کی مشعل راہ بن گئی۔

میں اپنی ٹرین پکڑنے کے لئے اسٹیشن جانے کے لئے صدر دروازے پر کھڑا پاپا کے بیٹھنے کی جگہ اپنی ہتھیلی سے صاف کر رہا تھا کہ۔۔۔محلے کی بڑی مسجد کے موذن صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔۔۔''وہ۔۔۔چھوٹے میاں جی۔۔۔اپنے گھر آ رہے ہیں۔۔۔'' میں بھاگ کر امی کو بتانے گیا۔۔۔امی نے ہاتھوں سے اپنے بکھرے بال سنوارے اور کرسی کی پشت پر لٹکا دوپٹہ اٹھا کر اپنے چہرے پر آیا پسینہ صاف کرنے لگیں۔۔۔میں خوشی سے گھر کے صدر دروازے پر بنی داہنی چوکی پر کھڑا ہو گیا۔ایمبولینس سائیرن بجاتی گھر کے سامنے چوک میں رک گئی۔

پاپا کا جنازہ گھر کے مردانے میں رکھا گیا۔۔اور امی کی ناک کی سوں سوں بالکل بند ہو گئی۔۔۔کوئی خونی رشتے دار نہیں تھا لیکن سوگواروں سے گھر بھر گیا تھا۔۔۔امی نے تیسرے دن مجھے واپس دہرادون بھیج دیا۔۔۔امی میری پڑھائی کا خرچ مجھے پچھلے آٹھ سال سے بھیجتی رہی تھیں اور پھر میں نے امی کی کفالت کی ذمے داری اپنے پر لے لی۔۔۔شام کو ٹیوشن پڑھاتا اور اپنے ہم جماعتوں کی پروجیکٹ بناتا۔۔۔رات کو فوٹو کاپی کی دکان پر کام کرتا۔۔۔گریجویشن میں پورے ضلع میں پہلی رینک آ گئی۔اسکالرشپ ملی اور میں ماسٹرس کے لئے کینیڈا اچلا گیا۔۔۔امی گھر کے در و دیوار میں گم اپنی صندوقچی میں پرت در پرت رکھی نظموں' غزلوں میں جینے لگیں۔۔۔وقت کا پرندہ مجھے اپنے بوجھل پروں میں چھپائے محوِ پرواز تھا۔۔۔کہ پاپا کی ادبی خدمات پر اس سیمنار کا کارڈ میری نظر سے گذرا۔۔۔

''صاحب روٹری کلب۔'' ٹیکسی والے نے مجھے دیکھے بغیر ہی کہا۔

روٹری کلب کے کانفرنس ہال پہنچنے پر میرا استقبال پرتپاک انداز میں ہوا۔۔۔لوگ مجھے شفقت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔میں اپنے لئے صاحبزادے اور بچے جیسے محبت بھرے لفظ اس 39 سال کی عمر میں سن رہا ہوں۔۔۔ایک عجیب اندوہناک سرشاری میرے ذہن و دل میں اتر رہی ہے۔

پاپا کی شخصیت کے اِن اَن دیکھے پہلوؤں سے میں آج تک نا آشنا رہا۔۔۔میں کیوں نہیں آیا اس شہر میں جہاں میرے پاپا ایک بڑے آدمی تھے۔۔۔میں آج ہی امی کو جا کر بتاؤنگا۔۔

''کیا انسان تھے۔۔ایکدم صاف و بے لاگ۔۔خوددار اور غریب پرور۔۔نہ کبھی کسی سے دست طلب دراز کیا اور نہ کبھی کسی کے بے جا دباؤ کو قبول کیا۔۔''

''ہر سال ۲ جنوری کو اپنے ملازمین کو ایک ماہ کی تنخواہ فاضل دیا کرتے تھے۔۔اور 10 مارچ کو سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔۔۔اور میں کچھ سننے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔۔۔10 مارچ کو امی پاپا کی شادی ہوئی تھی۔۔۔اور ۲ جنوری کو میں پیدا ہوا تھا۔

مجھے شال اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔۔میں پاپا کی رہائش گاہ جانے کی جلدی میں سیمینار کے اختتام سے کچھ پہلے ہی ہال سے باہر نکل آیا۔۔۔مجھے آج رات ۲ بجے کی ٹرین سے واپس اپنے وطن جانا تھا۔۔۔امی سے ملنا تھا۔۔۔

مجھے پاپا کے گھر کا پتہ ازبر تھا۔وہ ساری زندگی ایک ہی پتے پر رہائش پذیر تھے۔۔۔کتنے سارے خط لکھا کرتے تھے وہ امی کو اور میرے لئے بھی تھوڑا سا حصہ ضرور ہوتا تھا۔

میں راستہ پوچھتا ہوا صحیح جگہ جا پہونچا۔وہ خالی فلیٹ تھا۔اوپر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی لیکن ایک زنگ آلود تالا لٹکا ہوا تھا۔میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک بزرگ کمزور حالت میں کہہ رہے تھے۔۔۔''جناب نیچے تشریف لے آیئے''۔۔میں نیچے بھاگ کر گیا۔۔۔

''آیئے۔۔''

مجھے معلوم ہوا کہ آپ آج منعقدہ سیمینار میں تشریف لائے ہیں اور میرے محسن مرحوم کے بیٹے ہیں۔'' انہوں نے اپنی جیب سے دو چابیوں کا ایک چھلہ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں واپس سیڑھیاں چڑھ گیا۔۔۔میرے کانپتے ہاتھوں نے زنگ آلود تالا کھولنے کی کوشش کی۔۔تالا جام ہو چکا تھا۔۔۔کافی مشقت کے بعد بزرگوار نے اور میں نے مل کر تالا توڑ ڈالا۔۔۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔۔۔ایک مخصوص و شفیق مہک نے مجھے گھیر لیا۔۔۔جو میرے دماغ میں بسی تھی۔۔۔جو میں نے پاپا کی گود میں پائی تھی۔۔۔بزرگ کونے میں رکھی بوسیدہ سے اسٹول پر ٹک گئے۔کمرے کے وسط میں ایک پلنگ تھا۔۔۔جس پر ایک میلی سفید شکن آلود چادر تھی۔ایک تکیہ' ایک گاؤ تکیہ اور ایک اوڑھنے کی چادر کے آس پاس بستر پر اخباروں کے چیتھڑے بنڈل اور ان پر ایک کاغذ کی چٹ لگی ہوئی تھی۔پلنگ کے برابر میں ایک کرسی اور ایک تپائی۔۔۔ایک ٹیبل لیمپ۔ایک سکڑا ہوا سفید تولیہ کرسی کی پشت پر پڑا ہوا تھا۔۔

کمرے میں چاروں طرف ایک فٹ چوڑا سلیب پڑا ہوا تھا۔۔۔جس پر چار مینار سگریٹ کے خالی پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ایک بید کا بنا ہوا اٹیچی کیس رکھا تھا۔۔۔جس کی کنڈی کپڑے سے بندھی ہوئی تھی۔۔۔بالکل اسی طرز کا جیسا امی کے پاس تھا۔۔۔جس میں پاپا کے خطوط۔۔۔!!!

''میرے محسن میرے دوست۔۔۔میں اس کمرے میں آج ۳۱ سال بعد داخل ہوا ہوں۔۔۔جس دن وہ یہاں سے اپنے وطن روانہ ہوئے تھے اس دن سے یہ کمرہ بند ہے۔۔۔یہ سامنے جو سفید چائے کی پیالی ہے۔۔۔اسی پیالی سے وہ آخری چائے پی کر نکلے تھے۔۔۔دن بھر میں وہ صرف سگریٹ اور چائے پر ہی گذارا کرتے تھے۔۔۔''

وہ اٹھے اور بستر کی چادر کا کونہ ہٹا دیا۔۔۔کالا اور سفید دھاری دار

کمبل مُڑا ہوا رکھا تھا۔۔۔ایک دو پلی ٹوپی اور ایک باریک دانوں کی تسبیح۔۔۔

لوگوں کی نظر میں وہ ایک دنیادار تھے لیکن اپنے اللہ کو اپنے قریب ہی رکھتے تھے۔یہ کرتا اور یہ پاجامہ اور یہ ایک سفید سوئٹر۔۔۔جس کو وہ ہمیشہ پہنے رہتے تھے۔

یہ سفید سوئٹر۔۔۔امی نے بنا تھا۔۔۔اور امی کہتی تھیں کہ پاپا نے کبھی نہیں پہنا۔۔۔اور کسی کو دیدیا تھا۔

''وہ بازار کی بنی روٹی کبھی بھی پوری نہیں کھاتے تھے۔۔۔انکے منھ میں روٹی چبھتی تھی۔۔۔کیونکہ آپکی امی محترمہ کے ہاتھ کی روٹیاں نائیلون کی بنی ہوتی تھیں۔۔۔اور کوفتے اور کباب۔۔۔ اور شوربہ۔۔۔ اور کالی دال کی کھچڑی۔۔۔اور پسندے۔۔۔''

میرے دل میں دبی دبی سی کراہیں ابھرتی رہیں۔۔۔''آم کا باغ۔۔۔امرود کے باغ۔۔۔بیریاں۔۔۔کھیت۔۔۔اور دکان۔۔۔مکان۔۔۔ خاموشی سے بیع نامے پر دستخط ہوتے رہے۔۔۔

شکن آلود چادر' تولیہ' گاؤ تکیہ' تکیہ' ٹوپی' تسبیح' چائے کی پیالی ان سب کی پوٹلی باندھ لی میں نے مجھے شاہ رخ خان یاد آ گیا۔۔۔''سدا تم نے عیب دیکھا ہنر تو نہ دیکھا۔۔۔وہ تو ہے البیلہ۔۔۔ہزاروں میں اکیلا۔۔۔''

میں نے ٹوٹا ہوا تالا اور زنگ آلود چابی بزرگوار کے حوالے کر دی۔

''اب میں چین سے مر سکوں گا۔۔۔'' بزرگ نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

بڑے میاں کے گلے سے لگے لگے میں نے اپنے بے اختیار آنسوؤں کو اپنی سرد انگلی سے پونچھ لیا۔

اسٹیشن پر میں پاپا کے قدموں کے نشانات ڈھونڈھتا رہا۔

ٹرین میں بیٹھ کر میں گہرائی سے سوچنے لگا۔۔۔میں امی کو کیسے یقین دلاؤں گا کہ پاپا انکو کتنا چاہتے تھے۔۔۔کاش امی سمجھ سکتیں۔

اسٹیشن آ گیا میرے شہر بریلی کا۔راستہ بھی طے ہو گیا امی کے پاس جانے کا۔

میں نے دربان کو بتایا۔۔۔''میں سید شہادت حسن مہدی۔۔۔ ولد سید صادق حسن مہدی۔۔۔ولد سید مہدی حسن۔۔۔مہدی منزل محل۔۔''

''میری امی کہاں ہیں۔۔۔''دربان نے سر جھکا کر سلام کیا اور۔۔۔ بھوری گرم چادر میں ڈھکی اپنی انگلی سے اپنی دائیں جانب اشارہ کیا۔

میں دوڑ کر امی کی قدم بوسی کے لئے جھک گیا۔۔۔

میں نے پاپا کے سامان کی پوٹلی امی کے قدموں کے پاس رکھ دی۔

''امی ایک بڑے آدمی کا نذرانۂ عقیدت۔۔۔''میں سر جھکائے امی کو بتاتا رہا کہ پاپا نے کیا کیا صعوبتیں اٹھائیں۔۔۔اور بہت بڑے آدمی بن گئے۔رات گہری ہو گئی۔۔۔دربان نے مجھے اٹھایا۔۔۔''اندھیرا گھنا ہو گیا بابو جی۔۔اب گھر جاؤ۔۔''

''بابا۔۔ایک کام کرو گے میرا۔۔''

میں نے جیب سے مٹھی بھر کے بڑے بڑے نوٹ نکالے۔اور بابا کی مٹھی میں بند کر دئے۔۔۔بابا یہ سامان میری امی کا ہے۔۔۔اسکو یہاں امی کے سرہانے۔۔۔''

میں اس سے آگے ایک لفظ نہیں بول سکا۔۔۔وہ سامان کی پوٹلی وہیں امی کے سرہانے رکھ کر۔۔۔میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔۔۔امی کے قدموں سے ایک بار پھر زور سے لپٹ گیا۔میں سسکتا ہوا ویران اور خاموش قبرستان سے باہر نکل آیا۔

بقیہ : ترازو

ماموں، خالہ، پھوپھی، والدین اور دوسرے تمام اقارب پر محیط ہوتے ہیں۔دوسرا حادثاتی یا اتفاقی ہوتا ہے اور یہ کچا ہوتا ہے۔جیسے آس پاس کے رہنے والے، کام کرنے والے، ہم جماعت وغیرہ۔انہیں وقت کے ساتھ ایسے بدلا جا سکتا ہے جیسے وقت اور موسم کے ساتھ کپڑے۔اس لیے کہ وہ لوگ ہمارے اردگرد حادثاتی وجہ سے ہوتے ہیں۔اگر وہ ہمکار نہ ہوتے تو اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا، اگر وہ ہم جماعت یا پڑوسی نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا۔

تیسرا اور سب سے نازک رشتہ ان دیکھے بندھن کا ہوتا ہے۔جو یا تو شادی کی صورت میں یا پھر دوستی کی صورت میں ہوتا ہے۔شادی اُس سے کی جاتی ہے جسے چاہا جاتا ہے اور دوستی اُس سے ہوتی ہے جسے پسند کیا جاتا ہے۔اگرچہ یہ دونوں بھی ابتداء میں حادثاتی یا اتفاقی رشتے ہوتے ہیں مگر ان میں مرضی کا دخل ہوتا ہے۔یہی دوستی اور شادی کی خوبصورتی ہے کہ یہ باقی رشتوں کی طرح مسلط نہیں کیے جا سکتے اور ایک کے اختیار کی حد وہاں ختم ہوتی ہے جہاں دوسرے کے اختیار کی حد شروع ہوتی ہے۔جس طرح میاں اور بیوی کو بندھن میں باندھنے کے لیے دونوں کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اسی طرح دوستی کا بندھن باندھنے کے لیے دو انسانوں کا رضامند ہونا ضروری ہوتا ہے۔پھر جب دو انسان اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی حدود کا ایک دوسرے کے جذبات کا اور ایک دوسرے کے احساسات کا احترام کرتے ہیں۔

ہم نے ایک دوسرے کے لیے اپنی گھڑیاں کوئی امید باندھ کر یا ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی یا کسی نعم البدل کے لالچ میں نہیں بیچی تھیں۔وہ تو ہماری خواہش تھی اور بس۔جب انسان دوستی کرنے سے پہلے امیدیں وابستہ کر لیتا ہے تو دوستی کا درجہ گرا کر کاروباری بنا دیتا ہے پھر کاروبار سے وابستہ جنس کو نفع اور نقصان کے ترازو پر تولتا ہے اور جونہی ترازو کا پلڑا ایک جانب جھکتا ہے دوستی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ماموں نے مجھے دیکھا اور کہا کیا تم نے کبھی کسی کو بے لوث دوستی کا تحفہ دیا ہے؟ گر نہیں، تو آج کسی جانب حقیقی دوستی کا ہاتھ بڑھا کر تو دیکھو، تمہیں دوستی کے نام سے بھی محبت ہو جائے گی۔

انا کی قیمت

رعنا کوثر
(نیویارک)

کسی چھوٹے سے صاف ستھرے شہر کی پرسکون سی فضا میں بارش کے بعد جونکھار آتا ہے اس میں چہل قدمی کتنی اچھی لگتی ہے۔ آج بھی موسم سرد تھا مگر اتنا بھی نہیں۔ بارش ہونے کے بعد بھی سردی زیادہ نہ تھی۔ فوزیہ بھی اپنی مصروفیات چھوڑ کر موٹا کوٹ پہن کر ابو کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ وہ دونوں دوپہر کی ہلکی دھوپ سینکتے ہوئے ٹہل رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

ابو دیکھیں آسمان کتنا اچھا لگ رہا ہے اس نے ٹہلتے ہوئے آسمان کی جانب نظر کی تو سرمئی بادلوں کے درمیان شفق کی لال لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ اس کے اشارے پر اس کے ابو نے بھی اوپر نظر کی۔ واقعی میں بیٹا بہت خوبصورت لگ رہا ہے یہ شہر ہے ہی بہت دل موہ لینے والا۔ مجھے بھی یہ شہر بہت پسند ہے فوزیہ بولی۔ ہاں بیٹا یہاں اور شہروں کی طرح سناٹا نہیں ہے۔ سراج کتنا بلاتا ہے مگر تمہاری اور بچوں کی محبت سمرہ اور اس کے بچوں کی چاہت ہمیں کہیں جانے ہی نہیں دیتی اس کے ابّا بولے۔ فوزیہ نے پیار سے کہا ابّا آپ نے ہمارا جو ساتھ دیا ہے اس کے مقابلے میں ہماری محبت کم ہے۔ آپ اور امّی تو ہمیشہ ہماری ضرورت رہے ہیں مگر امّی کے بغیر بھی آپ ہمارے لیے ہر کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

رضا صاحب کے چار بچے تھے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بیٹا انجینئر تھا ایک ڈاکٹر، بڑی بیٹی سمرہ بھی ڈاکٹر بنی تھی۔ فوزیہ جو سب سے چھوٹی تھی وہ بھی ڈاکٹر تھی۔ سمرہ امریکہ شادی ہو کر آئی تھی۔ اپنی ڈگری قائم رکھنے کے لیے اسے بڑی محنت کرنی تھی۔ دو بچے بھی ہو گئے تھے اسے مدد کی سخت ضرورت تھی اس کے ابو بھی اب ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ اس نے اپنے امّی ابّو کو امریکہ بلا لیا۔ ان کے آنے سے اسے بڑی سہولت ہو گئی وہ دن بھر بچوں کو دیکھتے اور وہ امتحانات کی تیاری کرتی مشکل امتحانات پاس کرنے کے بعد اس کی جاب بھی بہت وقت مانگتی تھی۔ دونوں بھائی بھی امریکہ آ کر مختلف اسٹیٹ میں بس گئے۔

فوزیہ کی بھی شادی اس کے بھائی کے دوست سے ہو گئی۔ عقیلہ بیگم نے اس کے بھائی کو ہائی سکول میں پڑھایا تھا۔ جاوید ان کا بیٹا تھا اور اس کے بھائی کے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ وہ ایک سخت مزاج، اصول پرست اور بہت متاثر کن شخصیت کی مالک تھی۔ جاوید بہت نرم مزاج اور اچھا لڑکا تھا۔ جب جاوید نے فوزیہ کا رشتہ دیا تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ فوزیہ بھی شادی کے بعد امریکہ آ گئی۔ وہ اور سمرہ ایک ہی شہر میں تھے۔ یہ چھوٹا سا پرسکون شہر دونوں بہنوں کو بہت پسند تھا۔

رضا اور ان کی بیگم بھی بہت خوش تھے دونوں بیٹیاں قریب تھیں۔ فوزیہ کے بھی دو بچے ہو گئے تھے اس کو بھی آگے پڑھنا تھا۔ اب اس کو اپنے امّی ابّو کی ضرورت تھی۔ اس کے ابّو نے اسے بہت ہمت دلائی۔ یوں اس نے بھی اپنے پروفیشن کی دنیا میں قدم رکھا۔ رضا صاحب اکثر اپنے بیٹوں کے پاس جاتے مگر جلد ہی واپس آ جاتے۔ اب تو یہ شہر یہ گھر ہی ان کو اچھے لگتے۔ حالانکہ ایک دفعہ ان کو دل کا دورہ بھی پڑ چکا تھا مگر وہ خوش رہتے اپنا خیال رکھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی بیگم بھی بیمار رہنے لگی تھیں۔ مگر وہ لوگ مصروف ہی رہتے اس کی امّی کھانا پکاتیں رضا صاحب اندر باہر کی دیکھ بھال کرتے۔ کبھی پودوں پر توجہ دے رہے ہیں کبھی بچوں کو پارک لے جا رہے ہیں تو کبھی بچوں کو قرآن پڑھا رہے ہیں۔

فوزیہ کے گھر میں پانچ کمرے تھے ایک ان دونوں میاں بیوی کا ایک بچوں کا کمرے، ایک اس کے امّی ابّو کا اور ایک کمرہ جاوید کی امّی جو کبھی بھی آ سکتی تھیں۔ جاوید نے ان کے لیے بھی کب سے اپلائی کر رکھا تھا۔ اس کے امّی ابّو کا کمرہ کونے والا تھا جہاں سے باہر کا منظر بہت نمایاں رہتا۔ وہ اپنے تمام کام نپٹا کر اپنے پسندیدہ کاؤچ پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے اور باہر نظر بھی رہتی مبادا ان کے لگائے ہوئے پودے پھل کوئی جانور نہ کھا جائے۔ فوزیہ اکثر اپنے ابّو کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلتی اور وہ دونوں کچھ نہ کچھ دریافت کر لیتے۔ کبھی کوئی پھول کبھی کوئی خوبصورت پودا کبھی کسی گھر کی سجاوٹ کبھی آسمان کی قوس وقزح ان دونوں کا مزاج ایک تھا۔ حساس اور محبت کرنے والے۔

فوزیہ نے بھی ان کے ہمت دلانے سے بچوں کو چھوڑ کر امتحانات دیئے، کامیابی حاصل کی مگر وہ بہت زیادہ جاب کرنے کی قائل نہ تھی۔ پارٹ ٹائم جاب کرتی بچوں کے ساتھ امّی، ابّو کے ساتھ وقت گزارتی۔ اسی لیے اس کے ابّو کا بھی بہت دل لگتا ورنہ جس گھر میں بھی جاؤ سناٹا صبح سے شام تک سب مصروف۔ اچانک گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ عقیلہ بیگم کا ویزہ لگ گیا تھا۔ بچے خوش تھے نانی بھی آ جائیں گی ان کو بزرگوں کی موجودگی اچھی لگتی تھی۔ وہ عادی ہو گئے تھے۔ جاوید ان کی سیٹ بک کروا رہے تھے۔

فوزیہ نے سنا وہ پوچھ رہے تھے امّی کب کی سیٹ بک کراؤں۔

جب تم مناسب سمجھو مگر بیٹا فوزیہ کے والدین بھی ہیں مجھے آتے اچھا نہیں لگے گا۔

آپ فکر نہ کریں امّی کافی بڑا گھر ہے۔ آپ کا کمرہ ہم نے پہلے سے الگ رکھا ہوا ہے۔ جاوید نے کہا۔

اچھا وہ خاموش ہو گئیں۔

امّی آپ کی سیٹ دبئی سے کروا دوں آپ عظمیٰ کی پاس سے ہوتے ہوئے یہاں آ جانا۔ جاوید نے اپنی بہن کا نام لیا۔

نہیں بیٹا، واپسی میں پندرہ دن رک جاؤں گی۔

مگر کیوں امّی کچھ دن تو وہاں بھی رہیں اس کے بھی بچے ہیں۔ جاوید نے کہا۔

مجھے اچھا نہیں لگتا وہاں اس کی ساس بھی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں بیٹیوں کے گھر زیادہ دن نہیں رہتے ہیں۔ عقیلہ بولیں۔

آپ بھی کس زمانے کی بات کرتی ہیں امّی۔ جاوید نے کہا۔

آپ نے ہمیں اور عظمیٰ کو ایک جیسا پالا ہے ایک جیسا پڑھایا لکھایا

ہے۔جاوید نے انہیں سمجھایا۔

بس یہی میرا اصول ہے اور یہی ہماری روایات۔انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔جاوید چپ ہوگیا۔جب وہ اتنے سخت لہجے میں بات کرتیں تو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔

عقیلہ آنٹی کے آنے کے دن قریب آرہے تھے۔فوزیہ کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ان کے ہر جملے سے لگ رہا تھا وہ اس کے امّی ابّو کا یہاں رہنا پسند نہیں کر رہی ہیں۔ویسے تو وہ اچھی خاتون تھیں۔فوزیہ کو کبھی تنگ نہیں کیا مگر شاید ان کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا کہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے بیٹیوں کے گھر رہنا وہ بھی اتنا عرصہ۔ فوزیہ کی بھی انا یہ سب سن کر گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ اپنے ابّو،امّی کو آنٹی کی موجودگی میں رہنے دے۔ایک شام جب فوزیہ اپنے ابّو کے ساتھ باہر ٹہل رہی تھی وہ دونوں جانی پہچانی سڑک سے گزر رہے تھے۔دو تین خوبصورت کیفے اور ان کی روشنی گلی کو خوبصورت بنا رہی تھی۔اکّا دُکّا گاڑیاں گزر رہی تھیں کچھ جانے پہچانے چہرے ہیلو کہتے گزر جاتے۔ مجھے تمہارا یہ علاقہ بہت پسند ہے۔خاص طور پر یہ کافی کے خوبصورت کیفے اور ان سے آتی خوشبو۔جی ابّو فوزیہ بولی آئیں کافی پیتے ہیں۔وہ دونوں ایک کیفے میں داخل ہوئے۔سفید گول میز کے اردگرد دو کرسیاں کھینچی۔فوزیہ کافی لے آئی اور وہ لوگ باتیں کرنے لگے۔

فوزیہ نے ہمت کر کے کہا۔ابّو آپ اور امّی کچھ دنوں کے لیے سراج بھائی کے ہاں چلے جائیں۔تھوڑی تبدیلی ہو جائے گی۔بس اب تبدیلی کی ضرورت نہیں۔اس عمر میں جہاں بیٹھے ہیں بیٹھے رہنے دو۔انہوں نے کہا۔ابّو آنٹی آنے والی ہیں۔وہ کم از کم ایک سال تو رہیں گی۔میرا بہت کام بڑھ جائے گا۔آپ سراج بھائی کے پاس آرام سے رہیں گے۔پھر وہاں سے وہاب بھائی کے پاس چلے جانا فوزیہ بولی۔جب تک آپی بھی واپس آجائیں گی۔رضا صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے:اچھی بات ویسے سراج بھی پیارا بیٹا ہے۔

جہاں جاوید اپنی امّی کے آنے پر خوش تھے وہیں فوزیہ اپنے امّی ابّو کے جانے پر اداس۔جاوید نے کئی دفعہ کہا۔فوزیہ یہ تمہارے بھی والدین کا گھر ہے اُن کو کیوں بھیج رہی ہو۔اس نے ہر دفعہ کہا میں تین لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتی۔خدمت جاوید حیران ہوا۔وہ لوگ کہاں خدمت لیتے ہیں الٹا ہمارا خیال کرتے ہیں۔مگر وہ کیا کرتی عقیلہ آنٹی ہر دفعہ فون پر اسے جتا دیتیں کے بیٹوں کے ہوتے والدین بیٹیوں کے گھر اچھے نہیں لگتے۔وہ ایک منہ پھٹ خاتون تھیں نہ جانے کیا کہہ دیتیں اس کے ابّو کو۔

فوزیہ نے امّی ابّو کے سامان کی پیکنگ کر دی تھی۔سراج بھائی رات کو آگئے تھے۔شام کی فلائٹ تھی۔اس کی امّی کو بھی یوں سب کو چھوڑ کر جانا برا لگ رہا تھا۔اس کے ابّو دن بھر اپنی پسندیدہ کاؤچ پر بیٹھے رہے۔ابّو اٹھیے فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔سراج نے انہیں یاد دلایا۔وہ اس طرح بیٹھے رہے۔فوزیہ نے سوچا ابّو بھی بالکل بچوں کی طرح ہو گئے ہیں۔کہاں ان کی شاندار نوکری کسی پر انحصار نہ کرنے والے ایسے ہو گئے ہیں کہ اس کا اشارہ ہی نہیں سمجھ رہے۔اس نے کمرے میں آکر کہا۔ابو جی اٹھیے دیر ہو رہی ہے۔

بیٹا ہم کو کیوں بھیج رہی ہو۔ہم تو سمجھتے تھے یہ ہمارا ہی گھر ہے۔وہ بچوں کی طرح بولے۔ابو کا دل بھی کتنا کمزور ہو گیا ہے۔اُس نے انہیں اس طرح بولتے دیکھ کر سوچا۔دکھ کی لہر تھی جو اس کے اندر سے گزر گئی مگر وہ مسکرا کر بولی۔ابّو آپ اپنے بیٹے کے پاس جا رہے ہیں اتنے اداس نہ ہوں۔انہوں نے گھر کے در و دیوار کو حسرت سے دیکھا۔بچوں کو پیار کیا اور گھر سے تھکے ہوئے انداز میں نکل گئے۔

جاوید نے پھر کہا۔ایسی بھی کیا جلدی تھی ان لوگوں کو بھیجنے کی۔تم نے امّی کا انتظار بھی نہیں کیا۔ان سے مل لیتے آرام سے جاتے۔

فوزیہ نے کچھ نہ کہا۔اصل میں تو اسے عقیلہ آنٹی کی باتوں سے جو ٹھیس پہنچی تھی اس سبب وہ اندرونی طور پر ان سے ناراض ہی تھی مگر جاوید نے جو اس کے والدین کو ہمیشہ محبت اور احترام دیا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ وہ جاوید کو پلٹ کر جواب نہ دے اور اس کی امّی کے جذبات کا احترام کرے۔

عقیلہ بیگم آگئیں۔فوزیہ نے مزیدار کھانے بنائے۔بچوں نے نئے کپڑے پہنے۔سب ائیر پورٹ گئے اور وہ مسکراتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئیں۔

فوزیہ کو بڑا دکھ ہوتا جب وہ امّی ابّو کا خالی کمرہ دیکھتی۔

رضا صاحب کو گئے صرف چھ ہفتے ہوئے تھے کہ ان کے انتقال کی خبر آگئی۔وہ تڑپ کر روئی۔صرف چھ ہفتے کے لیے اُس نے انہیں بھیج دیا۔اس کو اپنی جذباتیت پر بہت غصہ آیا۔

عقیلہ آنٹی نے اس کو گلے لگا لیا۔وہ ان سے لپٹ کر رو دی۔انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

تمہارے ابّو کی زندگی کی کشتی اس سمندر میں جیسے چل رہی تھی چلنے دیتیں میرے ڈر سے ان کو لہروں کے سپرد کیوں کر دیا۔اس عمر میں چھوٹا سا طوفان بھی کمزور کشتیاں برداشت نہیں کر سکتیں۔میں بھی تو نہ جانے کیا کچھ بھی بول جاتی ہوں۔کبھی پرانی روایات یاد آتی ہیں کبھی نئے زمانے کے حساب سے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فوزیہ چپ چاپ سے اپنے آنسو پوچھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی آنٹی کچھ بھی کہیں اچھا ہی ہوا۔ابّو چلے گئے اب روایت پسند لوگ یہ تو کہیں گے کہ رضا صاحب کا انتقال بڑے بیٹے کے گھر ہوا ہے۔

''قابلِ رشک''

تعلیمی درجہ بندی کے اعتبار سے فن لینڈ پہلے نمبر پر ہے جبکہ امریکا 20ویں نمبر پر ہے۔فن لینڈ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں مضمون (سبجیکٹ) نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔فن لینڈ کا ہر اسکول 195 بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ 19 بچوں پر ایک ٹیچر۔دنیا میں سب سے لمبی بریک بھی فن لینڈ میں ہوتی ہے۔بچے اپنے اسکول ٹائم کا 75 منٹ بریک میں گزارتے ہیں۔دوسرے نمبر پر 57 منٹ کی بریک نیویارک کے اسکولوں میں ہوتی ہے۔آپ دلچسپ بات ملاحظہ کریں کہ پورے ہفتے میں اسکولوں میں محض 20 گھنٹے ''پڑھائی'' ہوتی ہے۔جبکہ اساتذہ کے 2 گھنٹے روزانہ اپنی ''اسکلز'' بڑھانے پر صرف ہوتے ہیں۔

تنہائی

ڈاکٹر شہاب افسر خان
(اورنگ آباد)

گاؤں میں ان کی اتنی عالیشان کوٹھی کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے کہ یہ خان بہادر کی کوٹھی ہے اور خان بہادر کے در سے کوئی خالی نہیں جاتا۔ ہر روز وہ اس کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھ کر لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ایک بھیڑ جمع ہوتی تھی اور وہ ہر ایک کی بات سنتے تھے اور ان کی شکایتوں کے حل تلاشتے تھے اور انھیں مایوس واپس نہیں جانے دیتے تھے رمضان ہو یا دیوالی یا اور کوئی تہوار وہ سب ہی کی مدد کرتے تھے۔ خان بہادر کا ایماندار اور وفادار منیم ماروت راؤ تھا جو ان کا حساب کتاب سلیقے سے لکھا کرتا تھا۔ ارجن جسے وہ ''بھیرٹ'' کہتے تھے کیونکہ وہ اونچا سنتا تھا۔ رنگ کالا بالکل بھلانوے کی طرح لیکن مضبوط قوی ہیکل انسان جو دس دس دشمنوں سے بھڑ جائے اور خان بہادر پر کوئی کھروچ نہ آنے دے۔ خان بہادر اپنی ڈمنی میں سفر کرتے تھے۔ اس خاص بیل گاڑی کے آگے ارجن دوڑتا تھا اور پیچھے منیم!

" کہاں چلیں گے کاکا؟" گاڑی بان خان بہادر سے پوچھتا تھا اور بیل گاڑی اس چوراہے کے موڑ پر دھیرے کر لیتا تھا جہاں سے چار راستے تقسیم ہوتے تھے۔ ایک ندی کی جانب جاتا تھا تو دوسرا ان کے کھیت کھلیان کی طرف اور تیسرا راستہ مالی جوگن کے گھر کی طرف لیجاتا تھا اور چوتھا شہر کی جانب جاتا تھا۔ خان بہادر صرف ایک لفظ میں جواب دیتے تھے "ندی" تو گاڑی بان ندی کی طرف مڑ جاتا اور خان بہادر ندی کے کنارے بیٹھ کر ندی سے بہتے پانی میں اٹھتی موجوں کا مزا لیتے تھے۔ ندی کے دوسرے کنارے پر تربوز کی کھیتی ہوتی تھی۔ تربوز والا ندی کے اس کنارے سے آواز لگاتا تھا" کاکا کیا آپ آج تربوز چکھائیں گے؟" خان بہادر اگر منیم کی جانب دیکھتے تھے تو وہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ وہ تربوز کھائیں گے اور اگر ارجن کی طرف دیکھتے تو اس دن وہ تربوز نہیں کھاتے تھے۔ خان بہادر نے منیم کی جانب دیکھا" ارے اولڈوا! کاکا تربوج کھاویں گے۔ لے آ! پکے پکے لال لال میٹھے میٹھے تربوج!" خان بہادر تربوز چکھ لیتے تھے باقی تربوز منیم، ارجن اور گاڑی بان کھا لیتے تھے۔ خان بہادر کو ندی کے گھاٹ پر کپڑے دھونے والی ادھ ننگی عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ زور زور سے میلے کپڑے ندی کے گھاٹ کے پتھروں پر پٹکتی اور ایک عجیب سی آواز کرتیں تھیں "ہاش! ہاش!" خان بہادر اس وقت تک ندی کے کنارے بیٹھے رہتے جب تک کہ سورج غروب نہ ہو جاتا۔ انھیں ڈوبتے ہوئے وقت کا آسمان اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ اس وقت سرخ مائل ہو جاتا تھا۔ خان بہادر کو گاؤں کے لوگ کاکا کہتے تھے۔" کاکا! کیا پھر مان ہے اب ہم کا! کوٹھی واپس جاویں کیا؟" گاڑی بان نے خان بہادر سے پوچھا؟ خان بہادر ان لوگوں سے صرف اشاروں میں ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے سر ہلا کر گھر کی جانب جانے کو کہا۔ کوٹھی پر لوگوں کا ہجوم تھا۔" کاکا آوی گیو! کاکا آوی گیو!" کی آوازیں مجمع میں سے آ رہی تھیں۔ ارجن لوگوں کو ہٹا کر خان بہادر کے لئے راستہ بنا رہا تھا اور منیم خان بہادر کا بیگ اور بہی کھاتا لئے آگے چل رہا تھا۔ خان بہادر نے ہاتھ ہلا کر سب کو بیٹھنے کو کہا اور لوگ قطار لگا کر برآمدے میں ان کی مسند کے سامنے بیٹھ گئے۔ خان بہادر منہ ہاتھ دھو کر آئے اور بالکل تازہ دم ہو کر اپنی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ رمضان شروع ہونے کو تھے اور لوگ زکاۃ کے لئے ہر سال جمع ہوتے تھے۔ انھوں نے منیم کی طرف دیکھا۔ منیم سمجھ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔" رمجان کی جکھات لینے والے گاؤں کے لوگاں ادھر کو آجاو" مجمہ کا بڑا حصہ منیم کے پیچھے ہو لیا۔ لفافے تیار تھے۔ منیم نے ایک ایک کر کے انھیں زکاۃ کے لفافے تھما دیے اور بہی کھاتے پر ان کے انگوٹھوں کے نشان لگاتا گیا۔ جاتے ہوئے ان گاؤں والوں نے خان بہادر کا جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔ باقی لوگوں کے مسائل یکے بعد دیگر خان بہادر نے سنے کسی کو رقم پکڑوائی تو کسی کے بیل چھڑوا دیے۔ ایک گاؤں والے کی بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی اس کے والدین کو سمجھا بجھا کر اسے اپنے شوہر کے گھر واپس بلا لیا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے اور خان بہادر کسی کا انتظار کرتے رہے! دیر گئے رات میں ارجن نے کہا" مالک اندر چلیو رات بہوت ہوگئی ہے کل آپکو اپنے کھیت کھلیان جانا پڑت ہے" وہ ارجن کی بات بہت مانتے تھے کہنے لگے

"چل بھیرٹ اندر چل۔ میں ابھی آتا ہوں!" خان بہادر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور ارجن ان کے پیر دباتا رہا اور انھیں کب نیند لگ گئی انھیں پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح سویرے خان بہادر کا گھوڑا تماز تیار تھا۔ گھوڑے پر زین لگا دی گئی۔ خان بہادر ناشتے کے فوراً بعد گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے کھیت کی طرف نکلے۔ آگے آگے ارجن اور گھوڑے کا نگران گھوڑے کا لگام تھامے چل رہے تھے اور پیچھے منیم دوڑ لگا رہا تھا۔ آج پھر اس چوراہے پر جہاں چار راستے نکلتے ہیں خان بہادر کا گھوڑا کھڑا ہو گیا۔ خان بہادر نے کہا " کھیت" اور گھوڑا کھیت کی جانب دوڑنے لگا۔ کھیت کی دیکھ ریکھ کرنے والا رکھوالا سلیم گیٹ پر کھڑا انکا انتظار کر رہا تھا۔ خان بہادر کا فارم ہاؤس بھی ان کے کھیت سے ہی جڑا ہوا تھا جہاں پر ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا ریستوران بھی تھا۔ فارم ہاؤس پر کالج اور اسکول کے بچے آکر دن گزارتے تھے۔ ان کے فارم ہاؤس پر گھڑ سواری، بیل بنڈی کی سواری، ٹراکٹر سواری، فارم کا چکر لگانے کے لئے ٹرین، جادو کا کھیل، مٹی کے برتن بنانے والا کمہار، پیپٹ شو، بھول بھلیاں، رین ڈانس اور ڈی جے شو فارم ہاؤس کے اٹریکشن تھے بہت بڑا مجمہ ہر روز فارم ہاؤس کی رونق بڑھاتا تھا اور فارم ہاؤس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نلینی اپاٹل اس فارم ہاؤس کی مینیجر تھی اور

''چہارسُو''

وہی اس فارم ہاؤس کی دیکھ ریکھ کرتی تھی اور اسے کامیابی سے چلاتی بھی تھی۔ ہفتہ میں ایک بار نلینی پاٹل خان بہادر کی کوٹھی آتی اور ہفتہ بھر کا کلکشن خان بہادر کے حوالے کرتی جسے وہ منیم کے پاس جمع کرادیتے تھے۔ نلینی ایک خوبصورت نوجوان شادی شدہ عورت تھی۔ جس نے اپنے شوہر کو ایک بھیانک روڈ ایکسیڈنٹ میں کھویا تھا۔ تب سے وہ خان بہادر کے فارم کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ جب وہ خان بہادر کی کوٹھی آتی تو اس وقت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی اور وہ گھنٹوں خان بہادر کے پاس رہتی تھی۔ اندر سے کبھی قہقہوں کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ انکا نلینی سے کیسا رشتہ تھا یہ صرف لوگ قیاس آرائیاں ہی کرتے تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اپنی زبان کھول لے۔

" کا کا گیہوں نکال لیے ہیں۔ اب کی بار گیہوں کم ہوے کا کا! پیاج ابھی لگی ہوئی ہے دو ہپتے بعد کاڑ لیں گے پیاج کھوب پیسا دے گی کا کا! لسون کا ڑ لیا ہے ادھر سوکھ رہا ہے اسے بھی باجار میں نکال لوں گا کا کا! گیہوں کے یہ پیسے آئے ہیں یہ تو م رکھ لو کا کا!" سلیم نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں نیچی رکھتے ہوئے اپنے کھیت کی خبر سنائی۔ خان بہادر نے پیسے گن کر منیم کو دے دیے اور فارم ہاؤس کی طرف چل دیے۔ نلینی خان بہادر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر آئی اور خان بہادر کے پاؤں چھوئے ۔" کیسی ہو پرنلینی ؟ کیسے چل رہا ہے فارم ہاؤس؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمہیں؟" خان بہادر نے ایک ساتھ سوالات کی جھڑی لگا دی۔" اچھا چل رہا ہے آپ کی دعاؤں سے" اس نے دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ خان بہادر اپنی فارم ہاؤس کی ریستوران میں چاے ضرور پیتے تھے اور کوئی غریب نظر آجاے تو اسے کچھ پیسے دے دیتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔

واپسی میں وہ چوراہا آیا۔ گھوڑا رکا خان بہادر نے کہا" گھر"

کوٹھی پر لوگ آج بھی جمع تھے۔ مالی مدد والوں کو تو منیم نے لفافے پکڑا دیے لیکن دوسرے لوگوں سے خان بہادر نہیں ملے۔ منیم نے اعلان کیا کہ " کا کا آج تھکے ہوئے ہیں اس لئے دوسرے لوگاں سے وہ آج نہیں ملی سکت " لوگ جاتے ہوئے خان بہادر کو دعائیں دے کر چلے گئے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ خان بہادر لوگوں سے نہیں ملتے اور وہ اس وقت ہوتا جب انھیں اپنے خاندان کی بہت یاد ستاتی۔" مالک کیا ہوا؟ آپ بہت دکھی نجر آرہے ہو؟ ہاٹل لاؤں کیا؟ گم دور ہویے گا؟ کہ مالی جوگن کو لے آؤں؟ مالس والس کرے گی اور آپ ایک دم پھٹ ہو جائیں گے!" ارجن نے کہا

" ارے نہیں رے بھیرٹ آج مجھے کچھ نہیں ہونا! بس مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ جا آج تو بھی جا! مجھے آج تنہائی میں رہنے کو من کر رہا ہے۔ جا ! تو جا!" خان بہادر نے ارجن کو باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

ان کے ہجرہ میں ان کی مرحومہ بیوی نور جہاں (جنھیں وہ رانی کہتے تھے) کی قد آدم تصویر لگی ہوئی تھی جس کے سامنے ان کی راکینگ چیر رکھی تھی جس پر خان بہادر بیٹھ کر گھنٹوں اس تصویر کو دیکھا کرتے تھے۔ آج خان بہادر کی آنکھیں نم تھیں وہ اپنی مسند پر بیٹھے اور نم آنکھوں سے اپنی بیوی سے باتیں کرنے لگے تھے

"رانی مجھے چھوڑ کر جانے کی اتنی جلدی کیا تھی؟ ابھی تو تم نے سکھ کے دن دیکھے بھی نہیں تھے اور جب مجھے تمہاری بہت زیادہ ضرورت تھی تو تم میرا ساتھ چھوڑ گئی!"

"خان بہادر! اب روتے کیوں ہو آپ۔ میرا جتنا کام تھا وہ میں مکمل کر چکی ہوں۔ میں نے آپ کو دو بیٹے اور دو بیٹیاں دیں! انھیں پالا پوسا، پڑھایا لکھایا ان کی شادیاں کروائی آپ کی جتنی خدمت ہو سکتی تھی کی اور کیا چاہئے تھا آپکو!" کمرے میں آواز گونج رہی تھی اور ایسے لگتا تھا جیسے نور جہاں کی تصویر بول رہی ہو

"یہاں تک تو سب ٹھیک تھا رانی لیکن تم جب تک گھر میں تھیں تو سب کو باندھے ہوئے تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ بیٹیاں تو پرائے گھر کی ہوتی ہیں وہ اپنے اپنے گھر چلی گئیں لیکن تمہاری یہ شکایت اب بھی مجھے ستاتی ہے اور اپنی غلطی کا احساس دلاتی ہے کہ ہم نے بیٹیوں کو بہت دور دے دیے۔ سکھ دکھ میں وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتیں۔ بیٹوں نے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا کہ گاؤں میں کون رہے گا؟ اور شہروں کی طرف دوڑ پڑے۔ یہاں گاؤں میں اکیلا اتنا کما لیتا ہوں کہ ان دونوں کی تنخواہوں سے کئی پٹ زیادہ! پر شہر کی چکا چوندوالی زندگی انھیں دینے سے رہا!"

پھر آواز گونجی " آپ مایوس نہ ہویئے! دیکھنا وہ ایک نہ ایک دن آپ کے پاس واپس ضرور لوٹ آئیں گے!"

"پر کب؟ میرے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد؟ میرا دل بھی بہت چاہتا ہے کہ میں اپنے پوتا پاتی کے ساتھ رہوں۔ ان کے ساتھ کھیلوں۔ انکا گھوڑا بنوں۔ انھیں اپنے ساتھ ندی کے کنارے لے جاؤں، انھیں کھیت میں نیم کے پیڑ پر لگے جھولے جھلاوں۔ انھیں اپنے کلیجے سے لگاؤں اور سینے میں جلتی ہوئی آگ کو ان کے ٹھنڈے اور معصوم لمس سے بجھاووں۔۔۔ پر میری یہ خواہشات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں میں صرف انھیں موبائل فون کے ویڈیو پر ہی دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔"

"دیکھ لیں اب آپ بہت زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں۔ سنبھالیے اپنے آپ کو۔ آپ کر شوگر ہے! آپکا بی پی شوٹ اپ ہو جاتا ہے۔ للہ اپنے آپ کو سنبھالیے ورنہ آپ بیمار ہو جائیں گے!" ایک بار پھر آواز گونجی!

خان بہادر کی سسکیاں کچھ تیز ہو گئی تھیں کہ اچانک ان کا موبائل بجا اور ان کے کمرہ کی وہ گونج مدھم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور کچھ دیر بعد ایسے لگا جیسے وہ گونج قد آدم تصویر میں جا کر ضم ہو گئی ہو!

خان بہادر نے ویڈیو فون اٹھایا۔ انھیں اپنے دونوں بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے نظر آئے۔

"ہلو بچو!" خان بہادر ابھی سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ یہ ویڈیو کال؟ ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ آواز کا زبردست خم گواہی دے رہا تھا کہ بہت ٹوٹ کر رہے ہیں!

باقی صفحہ ۸۵ پر ملاحظہ کیجیے

ناجائز

ارم رحمٰن
(لاہور)

وہ اسکی جائز اولاد تھا مگر ناجائز سے بدتر، جب موقع ملتا تو غصے میں اسے گالی نکالتی "حرامی! کتے کے پلے ذرا بڑا ہو تو تیری ٹانگیں توڑوں"، تو نہ ہوتا تو زندگی اچھی گزر سکتی تھی"، اور نجانے کیا کیا خرافات جو جو منہ میں آتا بکے جاتی چھوٹا سا بچہ جو ابھی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا بیچارہ ماں کی گالیاں سن کر بھی ماں کی طرف لپکتا اور ماں بھی ایسی کہ اس کے سارے کام بھی کرتی اور کوسنے بھی دیتی ذرا سی تکلیف پر رو پڑتی اور ذرا سی بات پر ایک جڑ بھی دیتی، شاہینہ کا واحد سہارا ہی وہ تھا چھوٹا سا گول گوتھنا سا عادل، اس معصوم کو کیا پتہ کہ ابھی تو اس نے چلنا شروع کیا تھا اور ماں ٹانگیں توڑنے کی باتیں بھی کرنے لگی تھی۔

شاہینہ جوان ہوئی تو بہت خوبصورت نکلی لیکن غربت نے اس کا حسن گہنا دیا تھا، نہ پیٹ بھر کھانا نہ اچھا کپڑا التا، بس سادہ سی زندگی، کرائے پر ٹرک چلانے والے کی آمدنی کتنی ہو سکتی تھی جو اپنی بیوی اور بچی کو عیش کرواتا، گھر اپنا تھا یہ ہی کمال تھا، بیوی اور ایک بچی پانچ بچے تو جنتے ہی مر گئے تھے وہ بھی ہزار خرچے، دوادارو، ڈاکٹر اور دائی کی فیسیں، لے دے کر بچی تو شاہینہ، ۱۵ کی ہوئی تو اس کی ماں ساتواں بچہ جنتے ہوئے اللہ کو پیاری ہوگئی اور ننھی سی جان کی قبر ماں کی کوکھ ہی بن گئی،، چپ چاپ دنیا میں سانس لیے بنا ہی دفن ہوگئی، اللہ جانے بیٹا تھا یا بیٹی، ماں کے مرتے ہی گدھ شاہینہ کے گرد منڈلانے لگے، سب سے بڑھ کر حمید عرف میداں ٹرکاں والا جس کا ٹرک اس کا باپ کرائے پر چلاتا تھا، سارا پیسہ وہ ہتھیا لیتا اور کچھ پیسے اجرت کے نام پر فضل دین کے ہاتھ پر رکھ دیتا اسی وجہ سے فضل دین اس کا مقروض بھی تھا کیونکہ گاہے بگاہے قرض لینا پڑتا تھا کئی بار پیسے لینے کے چکر میں شاہینہ پر نظر پڑ گئی، آنکھوں میں میل، نیت میں فتور آ گیا، دن کی روشنی میں شاہینہ کے ساتھ ایک دو بار منہ ماری کی کوشش کی، دست درازی کی نوبت آئی تو شاہینہ کی حقارت نے اسے روک دیا اس کی انا کو ٹھیس لگی اور مردانگی کی ناگن پھنکاری تو اسی رات اپنے ہی مقروض ملازم فضل دین کے گھر ہاتھ باندھ کر اس کی سولہ سالہ بیٹی شاہینہ کا رشتہ مانگنے جا پہنچا، شرط طے پائی کہ خرچہ سب حمید کے ذمے، سارے قرضے معاف، فضل دین ویسے بھی بے چارہ ٹی بی کا مریض، پھر بیوی اور ڈھیر سارے بچوں کی موت دیکھ کر ادھ مرا سا بوکھلایا سا پھرتا بچوں کا دکھ تو جیسے تیسے سہہ گیا لیکن بیوی کا دکھ اسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ گیا تھا رات کو ٹرک چلاتا اور صبح افیم کھا کر سو پڑتا، بس اس نے بھی کیا سوچنا تھا شاید کچھ سوچنے کی حالت میں تھا ہی نہیں، غنیمت جانی اس نے بھی فوراً'' شاہینہ کے لیے ہاں کر دی اگلے ہی دن سولہ برس کی شاہینہ، ۳۵ سال کے حمید سے بیاہی گئی، دو بیویوں کو طلاق دینے کے علاوہ بظاہر کوئی اور حقیقت نہیں کھلی، سہاگ رات میں پرانی بیویوں کے کپڑے گہنے سب اس نے نئی نویلی دلہن کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے، نہ بھی دیتا تو کیا ہوتا، شاہینہ تو بے بس تھی، حمید نے واقعی خوشی سے ولیمہ کیا، ساری گلی والوں کو قورمہ پلاؤ اور زردہ کھلا کر اپنا گواہ بنا لیا کہ حمید جیسا دریادل کیسے کسی غریب کی بیٹی کو بیاہ کر لے گیا۔

کسی کو اس شادی پر اعتراض کیا ہونا تھا اور تھا بھی تو اتنا اچھا اور کھلا کھانا ملنے پر منہ بند ہو گئے یا کر دیئے گئے، شاہینہ کو حمید سے نکاح پر کوئی خوشی نہیں تھی مگر غریب بچے اپنی عمر سے پہلے ہی بڑے اور سمجھدار ہو جاتے ہیں، اسے معلوم تھا کہ اس کے لیے کوئی شہزادہ نہیں آئے گا آٹھویں جماعت تک پڑھنے کی وجہ سے وہ ساری کہانیاں پڑھ لیا کرتی تھی، کچھ ماں نے سکھا دیا تھا اور کچھ حالات نے، جس گھر میں اسکی ماں کام کیا کرتی تھی وہاں اس صاحب کے دو جوان لڑکوں نے بھی شاہینہ کو مفت کا مال سمجھ کر اس پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی لیکن قسمت مہربان تھی شاہینہ کی ماں موقع پر تھی, چپ چاپ اگلے دن کام کرنے سے منع کر دیا، مالکن نے پوچھا بھی مگر وہ بیماری کا بہانہ کر گئی، شاہینہ سب نہیں سمجھی مگر اتنا سمجھ گئی تھی کہ وہ لڑکے اس کے ساتھ بدتمیزی کر رہے تھے وہ ڈری سہمی، ماں کے درست اور بروقت فیصلے سے سب ٹھیک ہو گیا، ویسے بھی جن آنکھوں نے غربت دیکھی ہو انھیں امیری کے خواب نہیں آتے، شادی کے وقت تو شاہینہ نے اس کریہہ الوجود شخص کو اپنا لیا تھا مگر مسلسل ایک ذہنی اذیت کا شکار رہتی تھی، حمید کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ شاہینہ خوش نہیں بس خاموش ہے۔

اب حمید نے بھی نئی دلہن کا دل جیتنے کے چکر میں خوب اہتمام کرنا شروع کر دیا، اچھے کپڑے پہنتا، خوشبو لگاتا اور شاہینہ کو بھی اس نے کھلا پلا کر دو تین ماہ میں کھلتا گلاب بنا دیا، حسین تو پہلے ہی تھی غربت سے گدلایا حسن نکھر کر سامنے آیا تو نظر نہیں ٹکتی تھی۔

حمید کے ذاتی دو ٹرک تھے ایک خود چلاتا ایک کرائے پر لیکن پہلو میں حسین بیوی کو چھوڑ کر کبھی کبھار کام پر جانا ناممکن ہو جاتا تو اپنا ٹرک بھی کرائے پر دے ڈالتا اور وہ دن شاہینہ پر بھاری گزرتے، کیونکہ اس دن اس کے جسم سے حمید مسلسل خراج وصول کرتا، اور ایسا لگتا کہ شاہینہ سے کھلائی پلائی کی قیمت اور گھر پر رکھنے کا بھتہ وصول کیا کرتا۔

کرتی کیا نہ کرتی، اپنے پیٹ کے جہنم کو ایندھن مہیا کرنے کے لیے اور خود کو باہر منہ کھولے عفریتوں سے بچانے کے لیے اسے اپنے جسم کو ہوس کی بھٹی میں جھونکنا پڑتا یہ اس کی مجبوری تھی وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ حمید کی قربت اس کے لیے اتنی دردناک کیوں ہوتی تھی اتنی خوشبو لگا کر بھی سانسوں سے سڑاند اور بدن کی باس نہیں جاتی تھی، جانے کون سی آگ بھری تھی کہ بار بار شاہینہ میں انڈیل کر بھی چین نہیں ملتا تھا، دس پندرہ منٹ میں ہی شاہینہ کے جسم میں آگ بھر جاتی یا پھر کوئی تیزاب جو اسے اندر تک جھلسا کر رکھ دیتا خود تو اپنے وجود کو سکون دے کر کھڑا ہو جاتا اور شاہینہ کتنی دیر تک اس آگ میں جلتی رہتی، کیا کیا جتن کرتی تھی ٹھنڈا کرنے کے مگر ٹھنڈا ہو کر نہ دیتی اور جب اسے کچھ سکون ہوتا تو پھر اسی مشق ستم سے گزرنا پڑتا۔

حمید کی شدید پکڑ دھکڑ کے باوجود گود نہ بھری اور ایک سال ہو گیا، امیر ہو یا غریب شادی کے بعد ایک ہی خوشی شاید مشترکہ ہوتی ہے، گود بھرنے کی مگر شاہینہ اس سے محروم تھی۔

ایک دن حمید کی پڑوسن کچھ کھانے کے لیے لے کر گھر آئی تو جاتے ہوئے بولی "ارے حمید کسی ڈاکٹرنی کو دکھا دے ایک بچہ تو ہو جائے" اپنی طرف سے اس اماں نے سرگوشی کی مگر شاہینہ نے سن لیا اس کا جواب میں حمید نے کھل کر کہا:

"خالہ جلدی کیا ہے ابھی تو کھیلنے کے دن ہیں، عمر ہی کیا ہے اس کی، ویسے بھی خوامخواہ کی جھک جھک، نہ ہی ہوں تو اچھا ہے"

اماں تو چلی گئی مگر شاہینہ کے دل میں گرہ ڈال گئی، رات کو شاہینہ نے حمید کو بدمست دیکھ کر پوچھ ہی لیا کہ "تم کیا کھاتے ہو جو میرے جسم میں آگ اتر جاتی ہے ہزار ٹھنڈا پانی ڈالو جلن ختم نہیں ہوتی" لہجہ کرخت اور سوالیہ تھا، حمید کو شدید ناگوار گزرا کہ اس نے اس کے عمل میں رخنہ کیوں ڈالا؟ اس نے اس کا اظہار غصے میں گندی گالی دے کر کیا اور کرختگی سے بولا:

"تو یہ سوال بعد میں بھی تو پوچھ سکتی تھی"

"اور کان کھول کر سن لے بچہ نہیں چاہیے مجھے"

شاہینہ منہ تکتی رہی اس سے پہلے کہ مزید کچھ بولتی حمید پھر گرجدار آواز میں بولا:

''نہیں چاہیے بچہ مجھے نہیں پسند کہ عورت موٹی بھدی ہو جائے پھولے جسم کے ساتھ میرے پاس آئے، کنوارے بدن کی خوشبو کی جگہ دودھ کی ہمک آنے لگے''

شاہینہ کے پاس اب راستہ نہیں تھا اس نے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور اب اس کی سزا تو ملنی تھی، بار بار ڈسے جانے کی سزا، رات بھر ایک اذیت سہنا مشکل تھا اور اب تو درگت ہی بنا دی گئی، پھر کبھی شاہینہ کو کوئی سوال پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی، اس کے پاس کیا نہیں تھا وافر مقدار میں کھانا پینا گوشت دودھ پھل فروٹ، کپڑا زیور، لیکن حال ایسا کہ بہترین جوتا مگر کیل نکلا ہوا، جو مستقل اسے کے پیر میں چبھتا آ رہا تھا، باہر کا حسن نکھرتا گیا اور اندر کی اذیت بڑھتی گئی، تین سال ہو گئے تھے شادی کو، باپ بھی پچھلے سال چل بسا اور اب حمید کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا اور اوپر سے قلانچیں بھرتا جوبن، بھرا گداز جسم کہ ہر کپڑا اچتا، اور وقت بھی بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا حمید بولتا کم تھا بس اس کے حسن کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اتارتا جاتا، ایسے تکتا کہ چکور چاند کو، اب تو شاہینہ کو بھی اولاد کا خیال آنے لگا تھا اور حیران بھی ہوا کرتی کہ اب تک اولاد سے محروم کیوں تھی لیکن حمید سے پوچھنے کی جرأت نہیں تھی، سب سے بڑھ کر حمید کی دی ہوئی آگ پہلے تو کچھ دیر بعد ہلکی ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ نڈھال ہو جایا کرتی لاکھ کوشش کے باوجود وہ پہلے کی طرح کسی لمحے بھی سکون نہیں پاتی تھی پھر دھیرے دھیرے جلن کے ساتھ خون بھی رسنے لگا تب اس کا درد اسے سسکیاں لینے پر مجبور کر دیتا، حمید بے حس بنا اپنے کام میں مگن رہتا لیکن اب شاہینہ کی رنگت پیلی پڑنے لگی، ہونٹ نیلے اور بخار کی شدت سے جسم کھوکھلا محسوس ہونے لگا، ہر بار حمید کا جنون اس کے ہی جسم کو لال کرنے تو حمید کی طبیعت کو مکدر کرنے لگا، کراہت زیادہ ہوئی تو چڑچڑا ہو کر حمید اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے ہی گیا یا لے جانا ہی پڑا کیونکہ اس کی آگ نکلنے کی بجائے اسے ہی جلا کر بھسم کرنے پر تلی تھی سارے معائنے اور تفصیلات جاننے کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے تفتیش ناک انداز میں حمید کو دیکھا اور بولی:

"کیا یہ مانع حمل کی دوا کھاتی ہے"

حمید نے مثبت انداز میں سر ہلایا اور شاہینہ ہکا بکا رہ گئی کہ یہ مجھے دوا کب دیتا تھا؟

پھر خیال آیا کہ رات کو ہمیشہ یہ ہی دودھ لاتا تھا اس کے اور اپنے لیے۔۔۔ شاہینہ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں پھر ڈاکٹر بولی کہ مانع حمل کی جو دوا یہ کھاتی رہی ہے اس کی وجہ سے اس کی بچہ دانی گلنے کی تشخیص کر دی اور تنبیہہ کی، اگر علاج نہ کروایا تو یہ مرض کینسر بن سکتا ہے۔

پہلی بار حمید کو تشویش ہوئی اور بولا "کیا اس کا کوئی حل ہے" ڈاکٹر نے پرامید انداز میں کہا:

"ہاں! علاج کے ساتھ ساتھ اس کا فوری طور پر حاملہ ہونا ضروری ہے، شاید اس طرح اس بیماری سے نجات مل جائے ورنہ۔۔۔"

ڈاکٹر جملہ ادھورا چھوڑ کر شاہینہ کا اترا ہوا منہ دیکھنے لگی پھر ڈاکٹر نے دوا کا نام پوچھا کہ کونسی دوا دیتا آ رہا تھا اتنے عرصے سے اب حمید بتاتا بھی تو کیا کہ وہ خود تو طاقت کے کشتے کھاتا تاکہ بیوی کی جوانی کا رس چوس سکے اور بیوی کو بھی کسی حکیم کی لائی پڑیاں دودھ میں گھول کر دیتا رہا کہ بچہ ہونے سے جسم بدہیئت نہ ہو سکے ڈاکٹر نے پھر پوچھا اور حمید کی ہکلاہٹ اور اڑے رنگ دیکھ کر سمجھ گء کہ معاملہ کافی مشکوک ہے۔ ڈاکٹر صاحب سب سوال چھوڑیں بس میری بیوی کو بچالیں، سر جھکائے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

خیر وہ ڈاکٹر تھی پولیس والی نہیں ویسے بھی جو ظلم شاہینہ کے ساتھ ہو چکا تھا اس کا حل بتانا ضروری تھا ڈاکٹر نے دوائیں لکھ دیں اور سختی سے منع کر دیا کہ "اب کوئی دوا دی اور تمھاری بیوی کو کچھ ہوا تو میں ذمہ دار نہیں"

حمید اس وقت واقعی گھبرا گیا تھا اور پھر کچھ دن سہما رہا اتنی خوبصورت بیوی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنی طاقت کے کشتے کھانے کم کر دیے مگر چھوڑ نہیں سکا کیونکہ اس کا جسم بھی شاید ان کا محتاج ہو چکا تھا جیسے وہ شاہینہ کے جسم کا، لیکن شاہینہ کو کوئی بھی دوا دینی بند کر دی پھر ایک ماہ کی محنت سے شاہینہ حاملہ ہو گئی، حمید نے پوری کوشش کی کہ وہ شاہینہ کے ساتھ اچھا رویہ رکھے مگر جب ساتواں مہینہ لگا تو جسم میں نمایاں فرق آ چکا تھا وزن کافی بڑھ گیا پیٹ پھول گیا ممیض چھاتیوں پر سے گیلی ہونے لگی تو حمید کی وحشت نے اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا ہی دیا بیوی کا بدن نہیں رہا وہ کسی کی مامتا سے لبریز درخت بن چکا تھا ایسا تناور درخت جو ذرا سے دباؤ پر رس کی جگہ دودھ اگلنے لگتا اور حمید کے لیے شاہینہ کے رس میں آگ بجھانے کی صلاحیت کم ہو چکی تھی بلکہ وہ کسی نئے بیج کو اندر ہی اندر سینچ رہا تھا جوان بدن کی مہک ختم ہو کر دودھ کی ہمک آنے لگی اور خوبصورت عورت کا روپ اسقدر بھدا لگنے لگا

کہ آٹھویں ماہ باقاعدہ دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیا کپڑے لتے زیور پیسہ اس کے ہاتھ میں رکھا اپنے ایک ملازم کے ذریعے اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا ،شاہینہ اس وقت کسی بھی ردعمل دکھانے کے قابل نہیں تھی اور حمید کچھ سننے کے لیے تیار ہی کب تھا آخر رات کے اندھیرے میں اپنے گھر پہنچی تالا لگا ہوا تھا جس کی چابی ،مرتے وقت اس کا باپ حمید کو دے گیا تھا اب وہ شاہینہ کو دینا بھول گیا ملازم نے شاہینہ کو دروازے پر چھوڑا یہ جا وہ جا بے چاری جاتی کہاں پڑوسن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس کی ماں کی سہیلی تھی بچی کو اس وقت اور اس حالت میں دیکھ کر افسردہ ہوگئی۔رات کو اپنے ہی گھر رکنے کا مشورہ دیا اور کہا صبح تالا تڑوا لیں گے یا چابی بنوا لیں گے رات آنکھوں میں کٹی صبح ہوتے ہی صبر نہ ہوا تو شاہینہ نے اماں کی سہیلی سے کہا۔

"خالہ تالا توڑ ڈالو مجھے ابھی گھر جانا ہے"

اور پھر اس کے بیٹے نے اینٹ کے دو تین زوردار وار کیے تو دو گھڑی میں زنگ آلود تالا دھڑ سے ٹوٹ کر گر گیا

اسے افسوس ہوا کہ رات ہی ایسا کر لیتے تو اچھا ہوتا۔

گھر مٹی سے اٹا ہوا تھا خود صفائی کرنے کا فیصلہ کیا تو اماں نے مدد کرنے کی کوشش کی لیکن حمیدہ نے صاف منع کر دیا پکے منہ سے بولی"

صرف دو کمرے ہی تو ہیں چھوٹا سا برآمدہ اور صحن کونسی کوٹھی بنگلہ ہے جو مدد کریں گی"، کیونکہ شاہینہ کے ذہن کو توجہ بٹانے کی اشد ضرورت تھی وہ کچھ دیر صرف اپنے ساتھ تنہا رہنا چاہتی تھی، اپنے دکھوں کو چیخ چیخ کر دیواروں کو سنانا چاہتی تھی رات کو وہ پڑوسن کے سامنے خاموش رہی مگر اب تنہائی میں وہ کھل کر رونا چاہتی تھی، وہ حمید کے اس رویے سے اس قدر دلگیر تھی کہ دو تین گھنٹے صفائی کرنے میں لگے مگر اسے پتہ ہی نہیں لگا اور روتے روتے گھر صاف ہوگیا ماں باپ کی یاد، غربت اور پھر حمید کے ساتھ شادی کی اذیت ،اس کی غربت نے اکیس سال کی لڑکی کو بڑی بوڑھی بنا دیا،طبعیت بوجھل اور تھکن سے چور جسم، چہرہ نقاہت زدہ،لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ابھی تو جوان ہوئی ہے، دنیا میں سانس لیتے فقط اکیس سال ہی تو گزرے ہیں اس کے سارے بہن بھائی تو کھل کر ایک سانس بھی نہ لینے پائے تھے شاید اچھا ہی ہوا، ورنہ وہ سب بھی اس کی طرح نجانے کیا کیا دکھ بھوگتے پھر وقت آ گیا اور اس کی کوکھ نے ایک اور حمید اگل دیا۔

بظاہر تو اپنے جیسا جیتا جاگتا جاندار جننا ایک تکلیف دہ عمل تھا،لیکن اس تکلیف کے طفیل اس کے مردہ ہوتے جسم میں جان پڑ گئی، اسے اس مرض سے چھٹکارا مل گیا جس کا وہ کافی عرصے شکار رہی بیٹے کی خبر سن کر حمید ہسپتال پہنچ گیا اور خرچہ بھی اٹھایا اور رات کو ماں بیٹے کو گھر چھوڑنے بھی آیا اور اپنا حکم بھی سنا ڈالا کہ بچہ رکھنا ہے تو طلاق نہیں ملے گی ،طلاق لینی ہے تو بچہ چھوڑنا ہوگا، اگر بچہ پالے گی تو بچے کے ساتھ ساتھ تیرا خرچہ بھی اٹھالوں گا،لیکن رہنا تجھے یہیں پڑے گا۔

شاہینہ خاموش رہی اور خود ہی کہہ سن کر حمید جا چکا تھا شاہینہ ہر بار نئے آزمائش سے گزرتی تھی۔وہ مسلسل سوچتی رہتی کہ آزمائشیں کب ختم ہوں گی جب خود بچی تھی تو شدید غربت دو وقت کھانے کو ملنا مشکل ،سیانی ہوئی تو ماں مرگئی، جوانی کا دریا چڑھا تو اس کے بہاؤ میں پھسل جانے کے ڈر سے باپ نے حمید کے پلے باندھ دیا وہاں سب کچھ تھا تو بیماری ایسی کہ کہا بھی نہ جائے اور سہا بھی نہ جائے اور جب عورت ذات کی تکمیل ہوئی تو بچہ زندہ باپ کی شفقت سے محروم کسی بھی وقت نے اسے مکمل طور پر خوش نہیں ہونے دیا اس کی زندگی کے تانے بانے الجھے ہی رہے کبھی سلجھ ہی نہ سکے بچے اور شاہینہ کا خرچہ باقاعدگی سے حمید اپنے کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتا،لیکن خود ملنے نہیں آیا اس دن کے بعد اسے کبھی کبھی بہت احساس ہوتا کہ جب حمید جیسا گھنا، سایہ دار ،درخت جو اسے ہر گرمی سردی اور گدھوں سے محفوظ رکھتا تھا لیکن جب تک اس کے پاس تھا تو وہ ثمر سے محروم تھی۔

اب وہ باثمر ہوگئی تو اسے اپنی ذات کی بنیادی احساس سے محروم ہونا پڑ گیا تھا۔جیسے اس کے پاس اب صحتمند تنا تو ہے،لیکن جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں حالانکہ اب ان جڑوں نے زمین کو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا اب ان میں اگر کوئی دوا ڈال بھی دی جائے تو یہ سہار جائیں گی ایسے ہی خرافات اور بے ہنگم خیالات اسے دبوچے رکھتے اس کو یہ سوچیں دن رات کچوکے لگاتی تھیں کیونکہ وہ دنیا کی نظریں بھانپ چکی تھی، اسے مرد تو کیا کہتے محلے والی عورتیں ہی جس چبھتی نظر سے دیکھتیں کلیجہ کٹ کے رہ جاتا جیسے کہہ رہی ہوں کہ شوہر کے بنا پڑے رہنے میں کونسا سکھ مل رہا ہے،اولاد نہ بھی ہوتب بھی شوہر سائبان تو ہوتا ہے اسے شدت سے کمی محسوس ہونے لگی تھی،اب اسے حمید کے سب عیب بھول گئے تھے،ایک دن ایسے ہی سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی:

وہ بوجھل قدموں سے دروازے تک گئی اور پوچھا" کون ہے"

"حمید بھائی نے بھیجا ہے"

جواب ملا تو اسنے جھٹ دروازہ کھولا۔

دروازے پر ایک جوان لڑکا ایک بھاری لفافہ پکڑے کھڑا تھا۔

"حمید بھائی نے یہ آپ کے لیے بھیجا ہے"

شاہینہ نے کانپتے ہاتھوں سے پکڑا اور بولی:

حمید صاحب سے کہنا اگلی بار پیسے نہ بھیجیں میں ان سے لینے خود آؤں گی۔

گزارہ

ایک دن ایک مہمان نے میرا اور امروز کا ہاتھ دیکھا، مجھے کہنے لگے۔۔۔ ''تمہارے ہاتھ پر دولت کی بڑی گہری اور لمبی لکیر ہے تمہیں زندگی میں دولت کی کمی نہیں ہوسکتی۔''لیکن امروز سے کہنے لگا۔''تمہارے پاس دولت کبھی نہیں جمع ہوگی۔تمہارے ہاتھ کی لکیر جگہ جگہ ٹوٹتی ہے۔''امروز نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔''اچھا تو پھر ہم دونوں ایک ہی لکیر پر گزارہ کرلیں گے۔۔۔!''

امرتا پریتم

''سرکتی جائے ہے رخ سے''

(حضرت امیر مینائی کی حیات پر)

فیروز عابد (کولکتہ)

آوازیں بہت قریب سے آرہی تھیں
درد میں ڈوبی محبت سے لبریز آواز
زندگی جینے کی آواز۔۔۔۔
آواز میں کشش تھی، جادو تھا اور اپنائیت تھی۔۔۔قدم رک گئے، میں ٹھٹھک گیا۔۔۔آواز سے قربت حاصل کروں، دیکھوں کیا ماجرا ہے یا پھر تجسس کی آگ دل میں لیے آگے بڑھ جاؤں۔۔۔نہیں دروازے سے قریب ہوکر معذرت کرلوں اور خیریت پوچھ لوں گا۔

دروازے پر دستک دی،
''کون''
مسافر
دروازہ ایسے کھلا جیسے استقبال کی تیاری آگے سے مکمل تھی۔
آیئے تشریف لایئے۔
''آپ نے پوچھا نہیں میں کون ہوں؟''
دستک میں اتنی اپنائیت تھی کے استقبال کو قدم شک کے دائرے میں نہیں آئے۔

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

یعنی آپ کی محبت اور آپ کی سادگی مجھ پر محبت کے دروازے کھول گئی۔۔۔میں اس کمرے سے آتی ہوئی آوازوں کے سحر میں گم ہو گیا تھا۔ یہ آوازیں مجھے زندگی اور موت دونوں کا منظر نامہ لگ رہی تھیں۔

چلتے قدم رک گئے اور۔۔۔
کیا بات کہی آپ نے۔۔۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

یعنی دنیا کی بے ثباتی میں محبت کی داستان، کسی اور کے درد میں اپنے درد کا احساس۔۔۔آپ کون ہیں، آپ کی آنکھوں میں درد کے وہ سائے نظر آ رہے ہیں جو میں نے حضرت مینائی کے آستانے میں کسی کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔۔۔ مصحفی تھے یا اسیر، یاد نہیں۔۔۔
آپ نے مصحفی کا ذکر کیا۔۔۔مجھے دادا جان یاد آگئے، ان سے سنا تھا:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

ہاں میرے عزیز مسافر دوست وہ میرے دادا استاد تھے۔
آپ کی گفتگو میں مجھے صندل، گلاب، عود اور رات کی رانی کی خوشبو کا ملا جلا لہجہ محسوس ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ آپ معشوق سے دل لگی کر رہے ہیں لیکن اس دل لگی میں عشق حقیقی کا وہ سایہ نظر آجاتا ہے جو دل کو واہمے سے دور کر کے حضرت مینائی کے آستانے تک لے جاتا ہے جہاں خدائے بزرگ برتر کی گفتگو ہو رہی ہوتی ہے۔
اچھی بات کہی مسافر دوست آپ نے، جی خوش ہو گیا۔

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے
صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر
بھیجتے تحفہ موذن کے لئے

کیا بات ہے، کیا بات ہے۔۔۔دل لگی اور زہد تقوی۔۔۔آپ کی گفتگو میں سوز و گداز ہے۔۔۔عشق اور مشک دونوں کا احساس جاگتا ہے۔۔۔ معشوق مجازی ردائے صوفیانہ اوڑھے کچھ اس طرح میری آنکھوں میں سماتی جا رہی ہے جیسے لگتا ہے کوئی کہہ رہا ہے:

لازم ہے کیا کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤنہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

مسافر دوست میں اور کوہ طور۔۔۔میں تو حضرت اسیر کا اسیر رہا۔ان کی اسیری میں زندگی کے نت نئے، رنگ دیکھے۔۔۔عشق کی ندی میں غوطہ زن لوگوں کی بلندی اور پستی دیکھی۔۔۔آوازوں کی اس بھیڑ میں خود کو بچا کر رکھا اور پھر آب و دانہ کے لیے شہزادوں کا معلم بنا لیکن وقت کی ستم ظریفی اودھ سفید فاموں کے قبضے میں چلا گیا اور میں گوشہ نشیں ہو گیا۔۔گوشہ نشینی بھی چھن گئی، مسکن تباہ ہوا۔حوادثوں سے کھیلتا رام پور کے نواب کا مصاحب بنا۔دکن میں داغ تھے۔ بلاوا آیا۔۔۔قسمت نے یاوری کی، نظام کلکتہ سے حیدرآباد آگئے۔میں ان کا نمک خوار تھا۔۔۔ایک قصیدہ لکھا۔۔۔نواب خوش ہوئے۔میں بھوپال سے گلبرگہ ہوتا حیدرآباد پہنچا۔۔۔بیمار پڑ گیا اور بستر مرگ سے جا لگا۔۔۔قبرستان یوسفین میں جسد خاکی منوں مٹی کے نیچے اعلا اور ادنا کے درمیان دفن ہے۔شب برات میں آوازوں اور دعاؤں کی بھیڑ میں شاہ نصیر، داغ اور فانی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔شاید نہیں یقیناً وہ آس پاس ہیں۔
زندگی کے مسائل اور تصوف کی بلندی نے ہم عصروں کے برابر کر دیا۔میں حریف کبھی نہیں بنا۔۔۔بس لوگوں نے خیالی الزام لگائے داغ میرے لئے بے داغ رہے اور میں اندر سے بینائی رہا، دوست نوازی اور عیب پوشی میرا شعار۔۔۔میں نے کسی کی شاعری پر انگلی نہیں اٹھائی۔زبان کے معاملے میں میرا

اندازلوگوں کے خاطر خواہ نہیں رہا۔۔زبان میلی نہ ہو۔۔تین سوصفحات میں اندرکی آگ انڈیل دی جو سرمائیہ بصیرت بن گئی۔

لفظ ڈھونڈتا رہا۔۔۔معنی اور مفاہیم کی تلاش میں سرگرداں لغت کے دو ہی پودے لگا سکا۔ان کی شاخوں میں صحیح الفاظ اور ان کے صحیح معنی آویزاں کئے۔۔۔میں نے اللہ اور رسول سے عشق کیا اور سوچتا رہا توشہ آخرت کیا ہوگا۔۔۔میرا نعتیہ کلام مسدس ذکر شہر انبیا۔صبح ازل شام ابد، لیلتہ القدر۔۔۔عشق و عاشقی کی کتاب صنم خانہ عشق۔۔۔آوازیں گونج رہی تھیں۔۔۔

میرے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔امیر مینائی کی محبت کی خوشبو سے میرا گھر رچا بسا تھا۔۔۔میں ان کے گھر کب گیا تھا۔ وہ آوازیں کیسی تھیں۔۔۔ میرے اندر کا میں کیا وہ بن گئے تھے یا پھر خواب میں خود کلامی آج کی شب کا مقدر بن گئی تھی۔

کس نے کس کے در دل پر دستک دی تھی۔کون آیا تھا میرے گھر۔۔۔امیر اللغات کی دو جلدیں میری کتابوں کی الماری میں مسکرا رہی ہیں اور اس سے لپٹی ''صنم خانہ عشق بھی''۔۔۔میری کتابوں کی الماری کے اوپر غالب، اقبال اور فیض کی لکڑی پر بنی روغنی تصویر ہے۔ایسا لگا کہ غالب اور فیض کے درمیان سے اقبال کی آواز ابھری۔میں امیر مینائی کے صنم خانہ عشق کا سودائی ہوں۔

وہ عجیب شئے ہے صنم خانہ 'امیر'اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی وہیں جبیں میں نے

اللہ اور رسول کا شیدائی صنم خانہ عشق میں کیا کیا نہ کہہ گیا۔۔اشعار پڑھو تو دل کا درد اچھل کر کوچہ یار میں محبوب کا سراپا ڈھونڈھے۔

میں کب گیا تھا ان کے حجرے میں۔۔۔ہاں قبرستان یوسفین تو گیا تھا۔ان کے استقبال کی خوشبو میری ہتھیلیوں میں اب بھی باقی ہے۔قبرستان یوسفین سے آواز آئی۔۔۔اگر آنا ہو تو فاتحہ پڑھ لینا۔۔۔عشق و عاشقی، محبت و پیار کی غزلیں کہنے والا زہد و تقوی کا علم بردار تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔۔۔ کانوں نے سنا:

سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا آ رہا ہے ۔۔۔آفتاب آہستہ آہستہ

- بقیہ -

تنہائی

"ہلو ابو! کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ رو رہے تھے؟ کیا ہوا ابو! بولیے نا!" دونوں بیٹے خان بہادر سے مخاطب تھے

" کچھ نہیں بیٹے آپ کی امی کی یاد آ گئی تھی اسی لئے ان کی تصویر کے سامنے وقت گذاری کر رہا تھا۔دل بھر آیا اس لئے اپنے آپ کو روک نہیں پایا اور میرے آنسو چھلک گئے" خان بہادر نے اپنی اس شکستہ حالت کی وضاحت کی۔

"دادو آپ نا روئیں لیجیے میرا یہ کھلونا لے لیجے" ننھے افان نے اپنا ٹیڈی بیئر دادو کی طرف بڑھایا اور پوتی عظمہ نے اپنی باربی ڈال!۔اس پر خان بہادر بہت زیادہ جذباتی ہو گئے ضبط مشکل ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔رونے کی آواز سن کر ارجن کھڑکی سے کود کر اندر آ گیا اور خان بہادر کو سنبھالنے لگا۔

"مالک کائے ہو گیا آپ کو؟ یہ پانی پیلیو!" اس نے پانی کا گلاس خان بہادر کی طرف بڑھایا خان بہادر کے سب ہی بیٹے اور پوتے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔انھوں نے ارجن سے اپنے والد کو سنبھالنے کی ہدایت دی اور ویڈیو کال منقطع ہو گیا۔

خان بہادر کو ارجن نے بستر پر لٹایا اور ان کے پیر دبانے لگا۔رات دیر گئے خان بہادر کو نیند لگی اور وہ سو گئے۔

دوسرے دن صبح ارجن خان بہادر کے جوتے لئے تیار تھا اس نے انھیں جوتے پہنائے اور پوچھنے لگا۔"ڈمنی، گھوڑا یا موٹر سائیکل؟"

خان بہادر نے ڈمنی کی طرف اشارہ کیا اور وہ اس میں بیٹھ گئے۔آگے ارجن دوڑتا رہا، پیچھے منیم۔ڈمنی کچے راستے پر دوڑ رہی تھی جس سے کافی دھول اٹھ رہی تھی۔یہ قافلہ دھول کے غبار سے ہوتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

''نصابِ زیست''

عادل راہی

(ممبئی)

اسے تم سے محبت ہے غلط فہمی میں مت رہنا
یہ بس دل کی شرارت ہے غلط فہمی میں مت رہنا

تمہی کو دیکھ کر وہ مسکراتا ہے تو حیرت کیا
اسے ہنسنے کی عادت ہے غلط فہمی میں مت رہنا

ہوئے برباد تو اب آہ و زاری کر رہے ہو تم
کہا بھی تھا سیاست ہے غلط فہمی میں مت رہنا

میں تجھ کو چاہتا ہوں بات یہ سچ ہے مگر پھر بھی
مجھے تیری ضرورت ہے غلط فہمی میں مت رہنا

جھکی نظروں سے تکنا اور خموشی سے گزر جانا
محبت کی روایت ہے غلط فہمی میں مت رہنا

کیا کرتا ہوں راہی اس کی تعریفیں سبب یہ ہے
وہ مجھ سے خوب صورت ہے غلط فہمی میں مت رہنا

○

سہیل اقبال

(سعودی عرب)

امیرِ شہر کی عزت بچائی جاتی ہے
سو بے قصور پہ تہمت لگائی جاتی ہے

خوشی ملی ہے مگر ایک مسئلہ ہے مرا
خبر نہیں خوشی کیسے منائی جاتی ہے

اس اہتمام سے چارہ گری نہیں ہوتی
جس اہتمام سے میت اٹھائی جاتی ہے

نظر پڑے نہ پڑے بے لباس جسموں پر
مگر مزار پہ چادر چڑھائی جاتی ہے

نصابِ زیست میں اب یہ پڑھایا جانے لگا
کہ آگ بستی میں کیسے لگائی جاتی ہے

دوائیں کام کریں گی تمہیں یقین ہے کیا؟
دوا تو روز مجھے بھی پلائی جاتی ہے

○

رئیس صدیقی

(دہلی)

زندگی میں تُو جو مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
اِس کرم سے، میرا رُتبہ آسماں ہو جائے گا

چند دن ہی، لانے لے جانے میں پیغام وسلام
کیا پتہ تھا، نامہ بر، جادو بیاں ہو جائے گا

یوں ہی گر، روتا رہا فرقت میں اُس کی رات دن
عشق تیرا، اِس جہاں میں، داستاں ہو جائے گا

ہر طرف ہی ڈھونڈنے نکلیں گے، دیوانے ترے
جب تجھے شہرت ملے گی، بے مکاں ہو جائے گا

اپنی منزل کے سفر میں، راہِ ویراں سے نہ ڈر
لوگ ملتے جائیں گے، اور کارواں ہو جائے گا

اب نظر آتے ہیں آثارِ قیامت ہر طرف
کچھ دنوں میں، یہ جہاں بھی، بے نشاں ہو جائے گا

بار بار اُس سے نہ کر، عرضِ محبت، اے رئیسؔ
''ایسی باتوں سے وہ کافر، بدگماں ہو جائے گا''

○

نویدسروش
(میرپورخاص)

ہےخوابِ عشق تو آنکھوں میں پھر بسایا جائے
جنوں کا راستہ اس کو نیا دکھایا جائے

وہ جس مسافرِ شب کا، کہیں پڑاؤ نہیں
چراغِ صبح کا مژدہ اُسے سُنایا جائے

میں ہجر یار کی اس آگ میں جلوں کب تک
اس انتظار کی آتش کو اب بجھایا جائے

نہ اب وہ فکر وعمل ہے نہ لفظ کی حُرمت
وقارِ لوح و قلم کس طرح بڑھایا جائے

اُتر رہی ہے جو یہ کیسی روشنی ہے سروشؔ
کیا اِس کا راز اندھیروں کو بھی بتایا جائے

○

ندیم راجا
(لاہور)

میرے سر پر سوار تھوڑی ہے
ایک دشمن ہے یار تھوڑی ہے

اک تناسب سے مجھکو ملتا ہے
رزق ہے ماں کا پیار تھوڑی ہے

سر جھکا کر نہیں اُٹھا کر مانگ
یہ ہے مسجد مزار تھوڑی ہے

یار اِس دل کو کون دیکھتا ہے
کوئی کوٹھی یا کار تھوڑی ہے

تم کو ظاہر ہے لوگ دیکھیں گے
خواب پر اختیار تھوڑی ہے

چھوڑ کر مجھ کو جا بھی سکتا ہے
یار ہے یارِ غار تھوڑی ہے

تجھ سے پہلے جو وقت گزرا تھا
زندگی میں شمار تھوڑی ہے

پھول آئے ہیں تیرے آنے سے
ورنہ موسمِ بہار تھوڑی ہے

مجھ سے پہلے ہے زندگی تیری
پانچ کے بعد چار تھوڑی ہے

دیکھ جنت ہے ماں کے قدموں میں
آسمانوں کے پار تھوڑی ہے

مسئلہ ہے کوئی بصارت میں
آئینے پر غبار تھوڑی ہے

عشق میں اک قرار تھا لیکن
عشق اب برقرار تھوڑی ہے

میرا ہمدرد ایک میں ہی ہوں
کوئی لمبی قطار تھوڑی ہے

○

یوسف چوہان
(سرگودھا)

حسن جب پیکرِاظہار میں آجائے گا
عکس آئینۂ دیوار میں آ جائے گا

ہم کلامی کا شرف بخشیں ذرا دیر وہ گر
اک سلیقہ مری گفتار میں آجائے گا

ان کو لفظوں میں مجسم تو میں کر دوں لیکن
داغِ فنکار بھی شہکار میں آجائے گا

ان کو آئے گا مرے قتل کا اس وقت یقیں
جب لہو کوچہ و بازار میں آ جائے گا

قوس مرکز سے گریزاں ہے اگرچہ یوسُف!
دائرہ نقطۂ پرکار میں آ جائے گا

○

طارق تاسی

(لاہور)

زندگی کے راستے مسدود ہو کر رہ گئے
ہم کہ اپنی ذات میں محدود ہو کر رہ گئے

لازمی تھے ہم کبھی کارِ جہاں کے واسطے
پھر نجانے کیا ہوا بے سود ہو کر رہ گئے

جس گھڑی بدلے ہوئے ایاز کے تیور ملے
اُس گھڑی حیرت میں گم محمود ہو کر رہ گئے

کل جو کی بے اعتنائی تم نے اے چارہ گرو!
آج میرے درد لا محدود ہو کر رہ گئے

جن کو اپنی پائیداری کا یقیں تھا کسقدر
ہو بھی تاسی ایک دن نابود ہو کر رہے گئے

○

صائم بلتستانی

(بلتستان)

لکھ لوں گا غزل تجھ سے کوئی بات ہوئی تو
نادار کو الفاظ کی خیرات ہوئی تو

فرصت سے دکھاوں گا تجھے زخمِ جگر میں
اب تجھ سے کبھی میری ملاقات ہوئی تو

یہ کارِ خدا اور بڑھاتا ہے مرا غم
جب جب بھی ترے ہجر میں برسات ہوئی تو

ممکن ہی نہیں خود کو میں کر پاؤں مکمل
اک بار جدا مجھ سے تری ذات ہوئی تو

کاغذ پہ مرا عکس بناتا ہے وہ دن بھر
اور آگ لگاتا ہے اسے رات ہوئی تو

رسماً ہی لگالینا مجھے اپنے گلے سے
اس بار زمانے سے اگر مات ہوئی تو

○

سہیل ضرّار خلش

(لندن)

تمہاری ترجمانی کر رہا ہوں
میں سب سے بدزبانی کر رہا ہوں

بہت دیکھے ہیں یہ ایمان والے
جب ہی تو بے ایمانی کر رہا ہوں

اُدھر احباب مری جاں کے درپے
اِدھر میں چائے پانی کر رہا ہوں

جو مجھ سے بدگمانی کر رہے ہیں
میں اُن کی میزبانی کر رہا ہوں

خموشی ، بے سکونی ، یادِ ماضی
میں یوں تقلیدِ فانی کر رہا ہوں

پھر اُن کی دید کی ہو عید یارب
دعائے فصلِ ثانی کر رہا ہوں

خلش یوں ہی نہیں رکھا تخلص
دلوں پہ حکمرانی کر رہا ہوں

○

ڈاکٹر ریشا قمر

(کرناٹک)

عجز و خلوص جب مرے پیکر میں آ گیا
سارا کمال پھر مرے دفتر میں آ گیا

دل کا تھا باب گرچہ مقفّل وہ اجنبی
دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا

اس آسماں نے مجھ پہ مصیبت جو توڑ دی
میرا وجود کرب کے محور میں آ گیا

میں منتظر رہی کوئی مشقِ ستم تو ہو
وہ مصلحت شناس کہ لشکر میں آ گیا

میری وفا پہ تم کو جو کچھ اعتبار تھا
تو کیسا انقلاب یہ تیور میں آ گیا؟

وہ میری زندگی کی تمنا، وہ میری جان
بگڑا تو پھر زمانے کی ٹھوکر میں آ گیا

میرے ہر ایک لفظ، مری سوچ کا محل
بے لوث آج دامنِ دلبر میں آ گیا

کس کو ریشا درد کا انبار چاہیے
جتنا ہنود قسمتِ دختر میں آ گیا

○

علی قائم نقوی

(لاہور)

حدودِ دشت میں وہ آئینہ جبیں آیا
تو سب کو اپنے خدوخال پر یقیں آیا

یہ شاہراہِ تمنا بڑی ہی سیدھی ہے
زمانہ پھر کے ترے پاس میں نہیں آیا

وہ شکل رزق کی صورت ہمیشہ ساتھ رہی
جہاں جہاں میں گیا خواب بھی وہیں آیا

تمام نقص مری ذات تک رہے محدود
سو حرف عزتِ آئینہ پر نہیں آیا

مکانِ دل تو میاں اپنے انہدام کو ہے
کہاں بٹھائیں گے اُسکو اگر مکیں آیا

تمہارے صحن سے باہر یہ پھل نہیں گِرتا
میں دل کو ڈھونڈنے نکلا تھا سو یہیں آیا

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیار پور)

مرے تن من میں یہ کیسی چبھن ہے
سحر کی تازگی میں بھی تھکن ہے

مرے ننگے بدن پر ہنسنے والو
کڑکتی دھوپ میرا پیرہن ہے

تری ہر بات میں بیگانگی ہے
تری آنکھوں میں لیکن اپنا پن ہے

دوپٹہ لے کے چلنا بھی ہے مشکل
ہوائے شہر کا کیسا چلن ہے

مرے پیچھے ہے اک سیتا اکیلی
تو آگے ایک سونے کا ہرن ہے

جسے سکوں سے کل تولا تھا ہم نے
اسی کا شام کو پتلا دہن ہے

○

وسیم عباس

(لاہور)

شب ڈھلی صبح مہربان ہوئی — دِل کی مسجد میں جب اذان ہوئی
مجھ میں چودہ چراغ جلتے ہیں — روشنی میرا خاندان ہوئی
رات پھر اِک غزل کہی میں نے — طبعِ رنجیدہ شاد مان ہوئی
کام بس کام کے نتیجے میں — زندگی کی کمر کمان ہوئی
ناؤ اپنی لگی کنارے پر — موجِ دریا جو بادبان ہوئی

○

شاہد رضوان

(چیچہ وطنی)

میں منتظر ہی رہا ہم قدم نہیں آیا — سکون خواب میں بھی کوئی دم نہیں آیا
نہ راس آئی مجھے بزم ناز کی خلوت — وہ خوش نصیب ہے جو چشم نم نہیں آیا
دعا کسی کی بچائے ہوئے ہے خلقت کو — اگرچہ شہر میں سیلاب کم نہیں آیا
تباہ کر دیا اس کو انا پسندی نے — وہ شخص کٹ گیا گردن میں خم نہیں آیا
ہے شوق پینے کا تو ڈال مے کدے کی اساس — کسی کے ہاتھ یونہی جام جم نہیں آیا
کسی کے واسطے جاری ہے سلسبیل کرم — ہمارے حصے بجز درد و غم نہیں آیا
حدود حس سے تجاوز معاذ اللہ — مگر نظر وہ غزل حرم نہیں آیا
کسی کے ساتھ اسے خواب میں فقط دیکھا — پھر اس کے بعد مرا دم میں دم نہیں آیا
تری ہنسی پہ تصرف ہے غیر کا شاہدؔ — مزاج یار میں ہر چند رم نہیں آیا

○

لاریب رحمان

(میرپورخاص)

بند آنکھوں میں اک حیرانیِ در وا دیکھا — قابلِ گفت نہیں ہے، جو تماشہ دیکھا
ہم کہ اک آنکھ بھی اس کو نہ اٹھا کر دیکھیں — اُس نے جب جب بھی کبھی دیکھنا چاہا، دیکھا
میں نہ کہتا تھا اُسے مجھ سے وفا ہے ہی نہیں — اب تلک اس نے میرا خواب نہ دیکھا، دیکھا
واژگوں کر نہ سکے ورقِ حیات آخر تک — ہم نے اک عمر جو دیکھا ، یہی صفحہ دیکھا
بات پھر بات ہے، پر بات میں یہ دیکھنا ہے — آپ نے بات کے انداز کو کیسا دیکھا
جو کہ اک حرف کی حرمت نہ سمجھ پائیں، انہیں — معنی و لفظ پر کرتے ہوئے چرچا دیکھا

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میامی)

قسط ۱۱

کیا کام کیا تم نے تھی یہ بھی ادا کوئی
پردے سے نکل آنا اور جی میں سما جانا

مصحفی نے شعر مذکور۔۔۔ خدا معلوم۔۔۔ کس رنگ۔۔۔ اور۔۔۔ کس کیفیت میں کہا ہوگا۔۔۔ اور۔۔۔ نہ جانے۔۔۔ کس ہستی کے لیے۔۔۔ کہا ہوگا۔۔۔!

مگر آسیہ خاتون میواتی المعروف۔۔۔ امّاں بی پر۔۔۔ صد فی صد۔۔۔ صادق آتا ہے۔۔۔ فرق یہ ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ مصحفی کا روئے سخن۔۔۔ تن تنہا۔۔۔ اُن کا محبوب ہے۔۔۔ آسیہ خاتون میواتی۔۔۔ المعروف۔۔۔ امّاں بی۔۔۔ اہل میوات۔۔۔ بلکہ۔۔۔ ہندوستان بھر کے۔۔۔ حریت پسندوں کے دل۔۔۔ دماغ۔۔۔ اور۔۔۔ سوچ۔۔۔ و۔۔۔ فکر میں بستی ہیں۔۔۔!

یہ وہی امّاں بی ہیں۔۔۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں۔۔۔ اپنے اہلِ خانہ۔۔۔ اہل علاقہ۔۔۔ اور۔۔۔ ملک بھر کے حریت پسندوں کی۔۔۔ آواز بن کر۔۔۔ ظالم سامراج کو۔۔۔ ناکوں چنے چبوائے تھے۔۔۔ اور۔۔۔ یہ۔۔۔ وہی۔۔۔ امّاں بی ہیں۔۔۔ جنہوں نے۔۔۔ کالا پانی کی قید کے دوران۔۔۔ سینکڑوں حریت پسندوں کے ہمراہ۔۔۔ انگریز حکومت کی جانب سے معافی کی پیشکش ٹھکرا کر۔۔۔ بہادری۔۔۔ اور۔۔۔ استقامت کی نئی مثال۔۔۔ نئی اُمنگ۔۔۔ اور۔۔۔ نئی۔۔۔ اُمید۔۔۔ پیدا کی تھی۔۔۔!

آج سے ٹھیک دو دن بعد۔۔۔ استقامت۔۔۔ جرأت۔۔۔ اور۔۔۔ بہادری کے اسی۔۔۔ کوہِ گراں۔۔۔ امّاں بی کی۔۔۔ ضمانت کی درخواست پر۔۔۔ سنوائی ہورہی ہے۔۔۔ معافی کی پیشکش کو۔۔۔ حقارت سے ٹھکرانے کے سبب۔۔۔ انگریز حکومت۔۔۔ نہ صرف اشتعال میں ہے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ تمام منفی حربے کام میں لاتے ہوئے۔۔۔ امّاں بی کی۔۔۔ درخواست ضمانت کو۔۔۔ رد کرانے پر تُلی بیٹھی ہے۔۔۔!

گذشتہ کل۔۔۔ بعد از جمعہ۔۔۔ مسجد خداداد میں۔۔۔ امّاں بی کی درخواست ضمانت کے لیے۔۔۔ بعد از جمعہ۔۔۔ دعائے قبولیت کا اہتمام تھا۔۔۔ جمعہ کے دن کا انتخاب۔۔۔ امّاں بی کے وکیل صفائی۔۔۔ بیرسٹر فصاحت علی بیگ کی تجویز پر کیا گیا۔۔۔ وجہ انتخاب۔۔۔ جمعہ کی نماز میں۔۔۔ نمازیوں کی تعداد کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا۔۔۔ مگر۔۔۔ کسے معلوم تھا۔۔۔ کہ۔۔۔ میوات کا ہر شخص بلا رنگ و نسل۔۔۔ اور بلا۔۔۔ مذہب وملت۔۔۔ نماز جمعہ میں شریک ہوکر۔۔۔ اتنا بڑا ہجوم۔۔۔ اتنا بڑا مجمع بن جائے گا۔۔۔ کہ مسجد کے باہر میدان میں بھی۔۔۔ تِل دھرنے کو جگہ نہ ہوگی۔۔۔ نمازِ عیدین۔۔۔ نماز جنازہ۔۔۔ کی طرز پر ایک سے زائد احباب کو۔۔۔ تکبیر۔۔۔ کہنے کی سعادت ملی۔۔۔ بعد از دعا۔۔۔ اہل میوات ایک دوسرے سے۔۔۔ اس طرح گلے مل رہے تھے۔۔۔ جیسے عیدین پر ملا کرتے ہیں۔۔۔ کیا ہندو۔۔۔ کیا مسلمان۔۔۔ کیا عیسائی۔۔۔ کیا پارسی۔۔۔ کیا بدھ۔۔۔ کیا جین۔۔۔ سب کی زبان پر۔۔۔ مبارک۔۔۔ سلامت۔۔۔ اور۔۔۔ کامیابی کا ورد تھا۔۔۔ اس دعائیہ مجمع نے۔۔۔ انگریز حکومت۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کے ہرکاروں کی نیندیں۔۔۔ اُڑا کر رکھ دی تھیں۔۔۔!

آج بعد از نماز عصر۔۔۔ امّاں بی کے گھر۔۔۔ خواتین کی محفل میلاد۔۔۔ اور دعائیہ تقریب کا اہتمام ہے۔۔۔ محفلِ میلاد۔۔۔ بارہ ربیع الاوّل کو۔۔۔ حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے حضور۔۔۔ نذرانۂ عقیدت۔۔۔ بہ صورت۔۔۔ نعتیہ کلام۔۔۔ اور۔۔۔ منظوم قصائد کی شکل میں۔۔۔ پڑھنا باعث۔۔۔ رحمت۔۔۔ اور۔۔۔ برکت ہوا کرتا ہے۔۔۔ عام دنوں میں بھی۔۔۔ شادی۔۔۔ بیاہ۔۔۔ عقیقہ۔۔۔ منگنی۔۔۔ سالگرہ۔۔۔ نئے مکان کی تعمیر۔۔۔ نوکری۔۔۔ یا۔۔۔ کاروبار میں کامیابی۔۔۔ کسی مشکل میں آسانی کے لیے۔۔۔ گھروں میں۔۔۔ محفلِ میلاد۔۔۔ منعقد کی جاتی ہے۔۔۔!

امّاں بی کی۔۔۔ ہر دلعزیزی۔۔۔ اور۔۔۔ وسیع المشربی۔۔۔ کا یہ عالم ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ محفلِ میلاد کے اس روح پرور موقع پر۔۔۔ مسجد خداداد میں ہونے والی۔۔۔ دعائیہ تقریب کی طرز پر۔۔۔ میوات کے تمام مذاہب۔۔۔ اور۔۔۔ مکاتب فکر کے لوگ۔۔۔ جوق۔۔۔ در۔۔۔ جوق۔۔۔ امّاں بی کے گھر کی جانب بڑھے آتے ہیں۔۔۔ امّاں بی کے گھر کا وسیع دالان۔۔۔ اور صحن۔۔۔ خواتین سے کھچا کھچ بھرنے کے بعد۔۔۔ گھر کے باہر میدان میں۔۔۔ تنبو۔۔۔ اور۔۔۔ قناتیں نصب کردی گئی ہیں۔۔۔ ایک طرف پینے کے پانی کے ٹب کا اہتمام ہے۔۔۔ تو۔۔۔ دوسری جناب شربت کی سبیل لگائی جا رہی ہے۔۔۔!

نہ کوئی منتظم ہے۔۔۔ نہ کوئی مہتمم۔۔۔ ایک خلقِ خدا ہے۔۔۔ جو اپنی مرضی۔۔۔ اپنی منشا سے۔۔۔ امّاں بی کے گھر کی جانب۔۔۔ کھنچی آ رہی ہے۔۔۔ کسی کے ہاتھ میں پھول ہیں۔۔۔ کسی کے ہاتھ میں۔۔۔ ہار۔۔۔ اور۔۔۔ کوئی۔۔۔ بتاشے لیے آ رہا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ کسی نے۔۔۔ مکھانے اُٹھائے ہوئے ہیں۔۔۔ کوئی جلیبی کا دونا تھامے ہوئے ہے۔۔۔ تو کسی نے۔۔۔ موتی چُور کے لڈو کا ٹوکرا۔۔۔ سر پر۔۔۔ اُٹھایا ہوا ہے۔۔۔ کوئی۔۔۔ عرقِ گلاب سے مجمع کو۔۔۔ مشکبار کر رہا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ کوئی۔۔۔ عطر کے پھریرے لگا

کر۔۔۔آسمان کی جانب۔۔۔دستِ دعا۔۔۔دراز کر رہا ہے۔۔۔نہ چاہتے ہوئے بھی۔۔۔لوگ باگ۔۔۔ایک دوسرے کی جانب۔۔۔کبھی پانی۔۔۔کبھی شربت کے کٹورے۔۔۔پیش کر رہے ہیں۔۔۔کسی کو اندازہ نہیں ہے۔۔۔کہ۔۔۔امّاں بی کے گھر میں۔۔۔ہونے والی۔۔۔زنانہ۔۔۔محفلِ میلاد۔۔۔بڑے ہجوم۔۔۔بڑے جلسے کا۔۔۔سماں پیدا کر دے گا۔۔۔اور۔۔۔مجمع بھی ایسا۔۔۔قرینے۔۔۔قاعدے۔۔۔اور نظم۔۔۔و۔۔۔ضبط سے۔۔۔میلاد سننے۔۔۔اور۔۔۔عقیدت سے۔۔۔آنسو صاف کرتے ہوئے۔۔۔آسمان کی جانب دعائیہ ہاتھ اٹھائے ہوئے۔۔۔اس طرح۔۔۔ہم ساز۔۔۔و۔۔۔ہم آواز ہے۔۔۔کہ۔۔۔خاموشی کا سینہ چیرنے کے لیے۔۔۔کسی قسم کے تردد کی۔۔۔قطعاً ضرورت نہیں۔۔۔بہ آسانی۔۔۔ہر کوئی۔۔۔ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے۔۔۔!

جوں ہی۔۔۔گھر کے احاطے میں۔۔۔امّاں بی کے گھر۔۔۔اور۔۔۔محلے کی دیگر خواتین نے۔۔۔عقیدت۔۔۔و۔۔۔احترام کے ساتھ۔۔۔قصیدہ بردہ شریف کے منتخب اشعار۔۔۔لحن۔۔۔اور۔۔۔سوز کے ساتھ پڑھنا شروع کیے۔۔۔تو۔۔۔گھر کے باہر موجود۔۔۔بلا رنگ و نسل۔۔۔اور۔۔۔بلا ملک و ملت۔۔۔ہر ذی روح نے۔۔۔خواتین کی آواز میں۔۔۔آواز ملا کر۔۔۔محفلِ میلاد کی اس روح پرور مجلس کو۔۔۔فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔۔۔ہر آنکھ اشک بار۔۔۔ہر زبان گریہ کناں۔۔۔اور۔۔۔ہر دل۔۔۔دل پُرسوز۔۔۔

مَوْلَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ
اَمِنْ تَذَکُّرِ جِیْرَانٍم بِذِیْ سَلَمِ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰی مِنْ مُّقْلَةٍ بِدَمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّ مِنْ عَجَمِ
هُوالْحَبِیْبُ الَّذِی تُرْجٰی شَفَاعَتُه‘
لِکُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحِمِ
فَاقَ النَّبِیّیْنَ فِیْ خَلْقٍ وَّ فِیْ خُلُقٍ
وَلَمْ یُدَانُوهُ فِیْ عِلْمٍ وَّلَا کَرَمِ
وَ کُلُّهُمْ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ
غُرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ أَوْ رَشْفًا مِّنَ الدِّیَمِ
وَ وَاقِفُوْنَ لَدَیْهِ عِنْدَ حَدِّهِمُ
مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ أَوْ مِنْ شَکْلَةِ الْحِکَمِ
فَهُوَ الَّذِیْ تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُوْرَتُه‘
ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِیْبًا بَارِئُ النَّسَمِ
مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِهِ
فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِیْهِ غَیْرُ مُنْقَسِمِ
دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارٰی فِیْ نَبِیِّهِمِ
وَاحْکُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِیْهِ وَاحْتَکِمِ
فَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ
وَّانْسُبْ اِلٰی قَدْرِهٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ
فَاِنَّ فَضْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَیْسَ لَهُ
حَدٌّ فَیُعْرِبَ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ
لَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهُ اٰیَآتُهُ عِظَمًا
اَحْیَا اسْمُهُ حِیْنَ یُدْعٰی دَارِسَ الرِّمَمِ
کَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَیْنَیْنِ مِنْ بُعُدٍ
صَغِیْرَةً وَ تُکِلُّ الطَّرْفَ مِنْ أَمَمِ
وَکَیْفَ یُدْرِکُ فِی الدُّنْیَا حَقِیْقَتَهُ
قَوْمٌ نِیَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ
فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِیْهِ أَنَّهُ بَشَرٌ
وَ أَنَّهُ خَیْرُ خَلْقِ اللّٰهِ کُلِّهِمِ
وَ کُلُّ اٰیٍ أَتَی الرُّسُلُ الْکِرَامُ بِهَا
فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُّوْرِهٖ بِهِمِ
فَاِنَّهُ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ کَوَاکِبُهَا
یُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ
کَالزَّهْرِ فِی تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِی شَرَفٍ
وَالْبَحْرِ فِی کَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِی هِمَمِ
کَاَنَّهُ وَهُوَ فَرْدٌ مِنْ جَلَالَتِهِ
فِی عَسْکَرٍ حِینَ تِلْقَاهُ وَ فِی حَشَمِ
کَأَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَکْنُونُ فِی صَدَفٍ
مِنْ مَعْدِنَیْ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَ مُبْتَسَمِ
أَبَانَ مَوْلِدُهُ عَن طِیبِ عُنْصُرِهِ
یَا طِیبَ مُبْتَدَاٍ مِنْهُ وَ مُخْتَتَمِ
نَبْذًام بِهٖ بَعْدَ تَسْبِیحٍم بِبَطْنِهِمَا
نَبْذَا الْمُسَبِّحِ مِنْ أَحْشَاءِ مُلْتَقِمِ
جَآءَ تْ لِدَعْوَتِهِ الْأَشْجَارُ سَاجِدَةً
تَمْشِیْ اِلَیْهِ عَلٰی سَاقٍم بِلَا قَدَمِ
مَا سَامَنِی الدَّهْرُ ضَیْمًا وَاسْتَجَرْتُ بِهٖ
اِلَّا وَ نِلْتُ جِوَارًا مِنْهُ لَمْ یُضَمِ
وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَی الدَّارَیْنِ مِنْ یَدِهِ
اِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰی مِنْ خَیرِ مُسْتَلَمِ

تَبَــارَکَ اللّٰــهُ مَــا وَحُــیٌّ بِمُكْتَسَبٍ
وَلَا نَبِــيٌّ عَــلٰــی غَيْبِــم بِــمُتَّهَــمِ
كَـمْ اَبْـرَأْتُ وَصِبًّــا مبِــاللَّمْــسِ رَاحَتُـهٖ
وَ أُطْـلَـقَــتْ أرِبًــا مِّــنْ رِّبْـقَةِ الـلَّـمَـمِ
يَــا أكْــرَمَ الْـخَـلْـقِ مَــالِــی مَنْ أَلُوذُ بِــهٖ
سِـوَاکَ عِـنْـدَ حُـلُـولِ الْحَادِثِ الْعَمِمِ
فَــاِنَّ مِـنْ جُـودِکَ الـدُّنْـيَــا وَ ضَــرَّتَـهَــا
وَ مِـنْ عُـلُـومِکَ عِـلْـمَ الـلَّـوْحِ وَالْقَلَمِ
يَــا رَبِّ بِــالْـمُـصْـطَـفٰی بَلِّغْ مَقَــاصِدَنَــا
وَاغْـفِـرْلَـنَــا مَــا مَـضٰی يَــا وَاسِعَ الْكَرَمِ

☆

لفظ پولیس---بجائے خود---خوف ودہشت کی علامت---پہلے بھی تھا---اور---آج بھی ہے--- ہر کسی کو یہ شک--- یہ واہمہ--- اور--- یہ یقین تھا---کہ--- تلے اوپر--- مسجد خدادادا میں--- دعائیہ تقریب---اور---امّاں بی کے گھر---محفلِ میلاد پر---انگریز حکومت بوکھلا گئی ہے---قبل اس کے---لوگ باگ---اپنی---اپنی---پوزیشن سنبھالتے---اور--- پولیس سے دو، دو ہاتھ کرنے کی تدبیر نکالتے--- پولیس کی ٹم ٹم---گرد اُڑاتی---امّاں بی کے گھر سے---آگے کی جانب بڑھ گئی---!

دوسری طرف---ہر کسی کو---اپنی جگہ---یہ اشتیاق---کہ--- پولیس گئی کہاں ہے---اور---اُن کے علاقے میں--- پولیس کے آنے کا سبب کیا ہے---باری---باری---کئی--- جہاندیدہ---اور---تجربہ کار لوگوں نے---اپنی---ذہنی اُپچ کے مطابق--- ہوائی گھوڑے دوڑائے--- مگر---جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو---صوفی عبدالکریم نے---مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے شیخ ابراہیم ذوق کو پکارا:

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

صوفی عبدالکریم کی بقراطی کے جواب میں---مولوی علی بخش سے چپ نہ رہا گیا---!

''اماں---آپ بھی کمال کرتے ہیں صوفی صاحب---شاید--- آپ کی نظر سے---حضرتِ داغ کا یہ شعر نہیں گزرا---وگرنہ---آپ--- موضوع سے---یوں پہلو تہی نہ کرتے---!''

ہزاروں کام محبت میں ہیں مزے کے داغ
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

صوفی عبدالکریم صاحب---تہبند اُڑستے ہوئے---میدانِ جنگ میں اُترنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے---کہ--- ایک چودہ --- پندرہ--- برس کے نوجوان نے--- پھولتے سانس کے درمیان--- یہ خبر دے کر---سب کے ہوش اڑا دیئے---کہ--- پولیس کی ٹم ٹم---شاہ صاحب کے آستانے پر جا کے ٹھہر گئی ہے---!

☆

ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا ہے---شاہ صاحب کی وفات کے بعد--- اُن کی اولاد میں---پہلے جیسا اتفاق---بھائی چارہ---نیکی---اور--- خدا ترسی کا چلن---عنقا ہو گیا ہے---خدا جھوٹ نہ بلوائے---تو---آج سے پیشتر بھی--- پولیس---ایک سے زائد بار---آستانہ عالیہ کا---طواف کر چکی ہے---وثوق سے کچھ کہنا---یا---اندازے قائم کرنا---ٹامک ٹوئیاں---مارنے کے مترادف ہے---جتنے منہ---اُتنی باتیں---کوئی کہتا ہے---آستانہ عالیہ---شاہ صاحب کی وفات کے بعد---کچھ--- ناپسندیدہ حرکات وسکنات میں---مصروف بتلایا جاتا ہے---!

مثلاً---! شاہ صاحب مدینے والے کے زمانے میں---زنانہ و مردانہ انتظار گاہ---ایک دوسرے سے متصل ہوا کرتی تھیں---جبکہ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد---دونوں انتظار گاہوں کے درمیان نہ صرف--- حد فاصل کھینچ دی گئی---بلکہ---پرانی انتظار گاہ کو---مردوں کے لیے وقف کرنے کے بعد---زنانہ انتظار گاہ ---آستانہ عالیہ کی پشت پر تعمیر کرائی گئی---دوسری تبدیلی یہ کہ--- بڑے شاہ صاحب ہال کمرے میں بیٹھ کر دائیں جانب خواتین---اور--- بائیں جانب---مرد حضرات کی حاجت روائی کیا کرتے تھے---!

نئی انتظامیہ نے---زنانہ انتظار گاہ کے ساتھ---ہال نما کمرہ تعمیر کرا کر---خواتین کی حاجت روائی الگ---اور--- مرد حضرات کی دادرسی الگ شروع کر دی--- پہلے پہل---شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے ---زوار شاہ صاحب---ایک گھنٹہ مردانے---اور---ایک گھنٹہ زنان خانے میں---سائلین کی دادرسی کیا کرتے---زائرین کی تعداد بڑھنے کے بعد---زوار شاہ صاحب مردان خانے میں---اور---جبّار شاہ صاحب زنان خانے میں زائرین کی حاجت روائی کرنے لگے۔

تیسرے شاہ صاحب---یعنی دلدار شاہ صاحب نے--- زنان خانے---اور---مردان خانے کے بیچ و بیچ---ورانڈے کو ڈھانپ کر--- اپنے بیٹھنے کی جگہ بنالی--- دلدار شاہ صاحب کے دائیں جانب زنانہ لائن لگتی---اور--- بائیں جانب مردانہ---شروع میں تمام زائرین سے--- مقررہ نذرانہ وصول کر کے--- نمبر الاٹ کیا جاتا--- وقت--- اور--- زائرین کی تعداد بڑھنے کے ساتھ---نذرانے کی رقم میں اضافہ بھی دیکھنے میں آیا---ازاں بعد نذرانہ کی رقم میں کمی بیشی بھی نوٹ کی جانے لگی---!

زائر جس قدر حاجت مند یعنی جتنا لاغر۔۔۔ اور۔۔۔ کمزور۔۔۔ یا نحیف۔۔۔ رقم اُسی حساب سے بڑھادی جاتی۔۔۔ اس بڑھوتری میں۔۔۔ کسی قاعدے۔۔۔ قانون۔۔۔ یا۔۔۔ ضابطے کو ہرگز دخل نہ تھا۔۔۔ یہ سراسر۔۔۔ دلدارشاہ کا اختیار تھا۔۔۔ کہ وہ کس سے کتنی رقم لے۔۔۔ اور۔۔۔ حساب کتاب کے کھاتے میں۔۔۔ کتنی درج کرے۔۔۔!

بڑے شاہ صاحب کے زمانے میں ۔۔۔ دم۔۔۔ دُرود۔۔۔ تعویذ۔۔۔ گنڈا۔۔۔ اور ۔۔۔ پڑھے ہوئے پانی کے علاوہ ۔۔۔ گاہے بہ گاہے۔۔۔ سفوف کی شکل میں۔۔۔ ہومیو پیتھک دوائی ۔۔۔ زائرین کو دی جاتی۔۔۔ بڑے شاہ صاحب کے بعد۔۔۔ طرح طرح کے سفوف۔۔۔ قسم قسم کے شربت کا اضافہ کر دیا گیا۔۔۔ مثلاً۔۔۔ سفوفِ یلدان۔۔۔ سفوف قلزم۔۔۔ سفوفِ مریم۔۔۔ سفوف کشف وغیرہ۔۔۔ اسی طرح لال۔۔۔ نیلے۔۔۔ پیلے۔۔۔ اور کتھئی شربتوں کو۔۔۔ شربتِ وصل۔۔۔ شربتِ مخملی۔۔۔ شربتِ ۔۔کوکین۔۔۔ شربتِ قرابیں وغیرہ کا نام دے کر۔۔۔ حاجت مندوں کو۔۔۔ نشے کا عادی بنایا جارہا تھا۔۔۔!

صاحبزادگان کے درمیان ناچاقی۔۔۔ اور۔۔۔ شکر رنجی۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ چشمک سے ہوتی۔۔۔ تُو تُو۔۔۔ مَیں مَیں۔۔۔ اَبے تَبے۔۔۔ تو تڑاخ۔۔۔ کے بعد نوبت۔۔۔ گالم گلوچ تک جا پہنچی۔۔۔ اب آستانہ ایک تھا۔۔۔ پیروں کی تعداد۔۔۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔۔۔ بقول نظیر اکبرآبادی:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گو میں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقی ' سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب ناایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری رہ جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی کی ہنڈیا چینی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصا نین سکھ اور ململ
چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھتر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھا اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
کیا سخت مکاں بنواتا ہے خم تیرے تن کا ہے پولا

تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک تنکا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

☆

باتیں اختلافی ایک سے زائد۔۔۔ بلکہ۔۔۔ اُن گنت۔۔۔ اور۔۔۔ لاتعداد۔۔۔ مگر۔۔۔ سب سے زیادہ توجہ طلب۔۔۔ پولیس کی ماہانہ ادائیگی۔۔۔ جس کے عوض۔۔۔ پولیس نے۔۔۔ آستانہ عالیہ کی جانب سے۔۔۔ نہ صرف آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ ماہانہ ادائیگی کی وصولی کے عوض۔۔۔ شاہ صاحب مرحوم کے صاحبزادگان کو کھلی چھٹی بھی دی ہوئی تھی۔۔۔!

اُڑتی۔۔۔ اُڑتی۔۔۔ خبر یہ ہے کہ پولیس نے۔۔۔ ماہانہ ادائیگی میں کسی قسم کی تاخیر۔۔۔ تعطل۔۔۔ یا۔۔۔ اڑچن کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے۔۔۔ کالا پانی کی جھلک دکھلانا بھی ضروری جانا۔۔۔ پولیس کے سخت رویے کے بعد۔۔۔ شاہ برادران نے۔۔۔ آستانہ کی گھٹتی آمدنی کا رونا رویا۔۔۔ پولیسی کے ذمہ داران نے۔۔۔ اُس پر زیادہ توجہ نہ دی۔۔۔ تو۔۔۔ شاہ برادران۔۔۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی کے تیرے چلانے لگے۔۔۔ پہلے تو پولیس نے ٹیڑھی اُنگلی سے گھی نکالنے کا عندیہ دیا۔۔۔ مگر۔۔۔ اس طریقۂ کار میں۔۔۔ سالم مرغا۔۔۔ ہاتھ سے جانے کا اندیشہ تھا۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ پولیس کے کرتا دھرتاؤں نے۔۔۔ تینوں بھائیوں کو۔۔۔ آمنے سامنے بٹھا کر۔۔۔ پولیس کی ماہانہ ادائیگی کو۔۔۔ تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے۔۔۔ تینوں بھائیوں کو۔۔۔ اس امر کا پابند کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر۔۔۔ تینوں بھائی۔۔۔ اکٹھا۔۔۔ یا۔۔۔ الگ الگ۔۔۔ اپنے حصے کی رقم۔۔۔ باقاعدگی سے ادا کریں گے۔۔۔ پولیس کو اس سے کوئی غرض نہیں۔۔۔ کہ۔۔۔ آستانہ۔۔۔ کون چلاتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ کس طرح چلاتا ہے۔۔۔!

آگے بڑھنے سے پہلے۔۔۔ آتش سے نہ ملے۔۔۔ تو۔۔۔ بات نہ بنے گی۔۔۔!

مجھ میں اور شمع میں ہوتی تھی یہ باتیں شب ہجر
آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

☆

رات بجائے خود طویل ہوتی ہے۔۔۔ ہجر کی ہو۔۔۔ فراق کی۔۔۔ یا۔۔۔ وصال کی۔۔۔ کبھی۔۔۔ انتظار کی چھری سے سابقہ پڑتا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ کبھی ہجر کے تیز دار آلے کی کسک سہنی پڑتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ وصال نصیب میں ہو۔۔۔ تو۔۔۔ ناز۔۔۔ و۔۔۔ انداز۔۔۔ پیمانۂ صبر کی چولیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔۔۔!

کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا۔۔۔ شاہ برادران کو بھی تھا۔۔۔ پولیس سے عہد و پیمان کے بعد۔۔۔ آستانہ عالیہ۔۔۔ تین حصوں میں تقسیم ہو کے رہ گیا تھا۔۔۔ تین بھی ہوتے تو کوئی بات نہ تھی۔۔۔ بقول میرؔ:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

راتوں رات۔۔۔ آستانہ عالیہ کے گرد۔۔۔ قدِ آدم اشتہار۔۔۔ دیواروں۔۔۔ اور۔۔۔ چھتوں پر نظر آنے لگے۔۔۔ ہر اشتہار میں۔۔۔ پیر صاحب بڑے بھی تھے۔۔۔ اور۔۔۔ اُن کی کرامات بھی بڑی تھی۔۔۔ ہر کسی کے قبضۂ قدرت میں۔۔۔ غیر مرئی قوتیں دستیاب تھیں۔۔۔ جو۔۔۔ ہر مرض۔۔۔ اور۔۔۔ ہر پریشانی کا علاج۔۔۔ چٹکی بجاتے۔۔۔ حل کرنے پر قادر تھیں۔۔۔!

اس کے بعد مریدین کی ہوڑ مچی۔۔۔ تینوں بھائیوں نے۔۔۔ اپنے گُرگے۔۔۔ آستانہ عالیہ کے چہار جانب پھیلا دیئے۔۔۔ جو۔۔۔ زائرین کو۔۔۔ ورغلا کر۔۔۔ بڑے پیر صاحب کے روبرو حاضر کرتے۔۔۔ اور منہ مانگا انعام یعنی۔۔۔ کمیشن وصول کرتے۔۔۔ کچھ عرصہ۔۔۔ اس ہڑبونگ میں گزرا ہو گا۔۔۔ کہ۔۔۔ پیروں کی تعداد میں یکا یک اضافہ ہونے لگا بقول غالب:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یا بقول ثاقب لکھنوی:

باغباں نے آگ لگا دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یعنی۔۔۔ پہلے جو لوگ مریدین کی شکل میں پیر صاحب کی دلالی پر مامور تھے۔۔۔ اب وہ خود پیر بن بیٹھے۔۔۔ بیٹھے بٹھائے۔۔۔ ہلدی لگی نہ پھٹکڑی۔۔۔ اور۔۔۔ رنگ بھی چوکھا۔۔۔!

☆

قصہ مختصر یہ کہ۔۔۔! جُوں، جُوں پیری کا دھندہ۔۔۔ مندہ پڑتا گیا۔۔۔ وَوں۔۔۔ وَوں۔۔۔ علاقے میں۔۔۔ جرائم کی رفتار بڑھنے لگی۔۔۔

سیٹھ۔۔۔ساہوکار۔۔۔تو۔۔۔لُٹ ہی رہے تھے۔۔۔غریب۔۔۔غربا۔۔۔ بھی۔۔۔محفوظ نہ تھے۔۔۔ڈکیتی۔۔۔اور۔۔۔چوری کے ساتھ۔۔۔رسّہ گیری کے واقعات بھی۔۔۔تواتر سے ہو رہے تھے۔۔۔ایسے میں۔۔۔ پولیس کے لیے خاموش بیٹھنا۔۔۔ ایک طرح سے۔۔۔ ملازمت سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔۔۔!

شنید یہ ہے۔۔۔کہ۔۔۔ایک رات۔۔۔ پولیس۔۔۔تینوں بھائیوں کو۔۔۔ بہلا۔۔۔ پھسلا کر۔۔۔کسی دور اُفتادہ مقام پر لے گئی۔۔۔جہاں۔۔۔ حکومت برطانیہ کی۔۔۔بڑی توپ۔۔۔ان لوگوں کی منتظر تھی۔۔۔ایک مرتبہ تو شاہ برادران۔۔۔ بڑی توپ کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔۔۔مگر۔۔۔جب بڑی توپ نے گرم جوشی سے آگے بڑھتے ہوئے۔۔۔ نہ صرف۔۔۔تینوں بھائیوں کا استقبال کیا۔۔۔ بلکہ۔۔۔حالات کی نزاکت کے پس منظر میں۔۔۔اُونچ نیچ سمجھاتے ہوئے۔۔۔تینوں بھائیوں کو۔۔۔کسی نہ کسی طرح۔۔۔اس امر پر راضی کر لیا۔۔۔ کہ۔۔۔ آستانہ عالیہ۔۔۔ ایک بھائی چلائے۔۔۔ اور۔۔۔ باقی کے دو بھائی۔۔۔آستانے کا۔۔۔انتظام۔۔۔انصرام۔۔۔سنبھالیں۔۔۔اسی ملاقات میں۔۔۔ حکومت کی بڑی توپ نے۔۔۔گاجر اور چھڑی کو کام میں لاتے ہوئے۔۔۔تینوں بھائیوں کو یہ مت بھی دی۔۔۔کہ۔۔۔وہ۔۔۔آستانہ عالیہ کے گرد۔۔۔ برساتی مینڈکوں کی طرح اُگنے والے پیروں کے خلاف۔۔۔عدالت میں۔۔۔ نالش کر دیں۔۔۔کہ۔۔۔ان جھوٹے۔۔۔مکّار۔۔۔نوسر باز۔۔۔ جعلی۔۔۔ پیروں کی وجہ سے۔۔۔آستانہ عالیہ کی شہرت کو۔۔۔ نہ صرف۔۔۔ نقصان پہنچ رہا ہے۔۔۔ بلکہ۔۔۔غریب۔۔۔نادار۔۔۔اور۔۔۔ پریشان حال لوگوں کو۔۔۔جعلی سازی کے ذریعے۔۔۔دونوں ہاتھوں سے لٹا جا رہا ہے۔۔۔!

☆

پولیس سے ملاقات کے بعد تینوں بھائی۔۔۔سر جوڑ کے بیٹھے۔۔۔ مسئلہ وکیل کا تھا۔۔۔کسی کا ووٹ۔۔۔شہر کے واحد انگریز وکیل۔۔۔مسٹر وکٹر اولول کے حق میں تھا۔۔۔مسٹر وکٹر اولول کے بارے مشہور تھا۔۔۔کہ۔۔۔وہ جعلی۔۔۔یا۔۔۔جھوٹ پر مبنی۔۔۔کیس۔۔۔قطعی طور پر نہ لیتا تھا۔۔۔ اگر۔۔۔کسی مجبوری۔۔۔یا۔۔۔سفارش پر۔۔۔کیس لے بھی لیتا۔۔۔تو۔۔۔ جھوٹ۔۔۔یا غلط بیانی۔۔۔ثابت ہونے پر فوری طور پر کیس واپس کر دیتا۔۔۔ مسٹر اولول اکثر کہا کرتا:

You can't escape from the clutches of Law if you are found guilty and if you are innocent then Law can not harm you.

دوسرا نام۔۔۔ترویدی پرساد تیواڑی کا تھا۔۔۔اوّل تو۔۔۔ترویدی پرساد۔۔۔ عام لوگوں کے کیس کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا۔۔۔کسی وجہ سے لگا لیتا۔۔۔تو۔۔۔پیشی پر حاضر نہ ہوتا۔۔۔کچھ لوگوں کے خیال میں۔۔۔ترویدی پرساد۔۔۔من موجی قسم کا آدمی تھا۔۔۔جبکہ قریب سے جاننے والوں کا خیال یہ تھا۔۔۔کہ۔۔۔ ترویدی پرساد۔۔۔پکا کر کھانے کا قائل ہے۔۔۔یعنی۔۔۔اگر وہ۔۔۔ہر پیشی پر حاضر ہو کر کیس کی پیروی کرے گا۔۔۔تو۔۔۔معمول کی فیس کے علاوہ۔۔۔ کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔۔۔اگر کیس کو لٹکائے گا۔۔۔تو۔۔۔مؤکل سے منہ مانگے پیسے بھی وصول کرے گا۔۔۔اور۔۔۔منشیوں کی دال روٹی بھی چلتی رہے گی۔

لے دے کے۔۔۔ایک ہی نام بچتا تھا۔۔۔جو۔۔۔ بڑا ہونے کے ساتھ۔۔۔ مشہور بھی تھا۔۔۔ یعنی۔۔۔ سید محمد حسین۔۔۔ المعروف محمود میواتی۔۔۔!

☆

محمود میواتی کی فیس سُن کر تینوں بھائیوں کی سٹی گم ہو گئی۔۔۔ بقول حفیظ جونپوری:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

فی پیشی سو روپے۔۔۔کیس جیتنے کی صورت میں پانچ سو روپے۔۔۔ سودے بازی۔۔۔یا۔۔۔کسی طرح کی کمی بیشی کا۔۔۔محمود میواتی کے ہاں۔۔۔ تصور نہ تھا۔۔۔مرتا۔۔۔کیا نہ کرتا۔۔۔ کے مصداق۔۔۔ تینوں بھائیوں نے۔۔۔محمود میواتی کی۔۔۔کڑوی گولی کو نگلنا مناسب جانا۔۔۔کیونکہ۔۔۔محمود میواتی کی شہرت یہ تھی۔۔۔کہ۔۔۔محمود میواتی نے۔۔۔آج تک کوئی کیس ہارا نہیں ہے۔۔۔!

شاہ برادران کے اتفاق۔۔۔ اور۔۔۔ عدالت کی چارہ جوئی کے سبب۔۔۔نفلی۔۔۔آستانوں کو۔۔۔پتو۔۔۔ پڑ گئے تھے۔۔۔کسی آستانہ میں۔۔۔اُلوؤں کا ڈیرہ تھا۔۔۔تو۔۔۔کسی میں صف ماتم کی کیفیت تھی۔۔۔ اوّل۔۔۔شاہ برادران۔۔۔کا۔۔۔رعب و دبدبہ۔۔۔دوئم۔۔۔مالی۔۔۔ و۔۔۔اخلاقی طاقت کے آگے۔۔۔کسی ایک۔۔۔آستانے کے لیے۔۔۔شاہ برادران کا مقابلہ کرنا۔۔۔آسان نہ تھا۔۔۔!

کئی دنوں کی بھاگ دوڑ۔۔۔کانا پھوسی۔۔۔جوڑ توڑ۔۔۔اور۔۔۔ میل ملاپ کے بعد۔۔۔درجن بھر سے زیادہ آستانے۔۔۔بھی عدالت میں جا پہنچے۔۔۔بڑے اعتماد۔۔۔اور۔۔۔بڑے اتفاق کے بعد بھی۔۔۔اُن میں اتنا دم خم نہ تھا کہ۔۔۔وہ۔۔۔میوات کے تینوں۔۔۔ بڑے وکیل۔۔۔مسٹر وکٹر اولول۔۔۔ترویدی پرساد۔۔۔یا۔۔۔یا کا تو۔۔۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ محمود میواتی تو۔۔۔شاہ برادران کے کیس کی۔۔۔ پیروی کر رہے تھے۔۔۔ اور۔۔۔ایک سے زائد پیشیاں۔۔۔بھگتانے کے بعد۔۔۔ ہر طرح سے مطمئن۔۔۔اور۔۔۔پُر اعتماد تھے۔

☆

دن گزرے۔۔۔ مہینے گزرے۔۔۔ سال۔۔۔مگر۔۔۔ نہیں

گزرے۔۔۔عدالت کا فیصلہ۔۔۔اچانک تھا۔۔۔نہ غیر متوقع۔۔۔سیانے کہہ گئے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔پانی۔۔۔ہمیشہ۔۔۔ڈھال کی جانب گرتا ہے۔۔۔ سو۔۔۔اصلی۔۔۔اور۔۔۔خالص۔۔۔شاہ برادران کی۔۔۔موجودگی۔۔۔ اور۔۔۔تحرک ۔۔۔ کے۔۔۔ سامنے۔۔۔نقلی۔۔۔ اور۔۔۔ جعلی۔۔۔ آستانوں کی دال گلنی تو۔۔۔دُور کی بات۔۔۔ہانڈی بھی۔۔۔نہ چڑھی۔۔۔ محمود میواتی کے زوردار۔۔۔ثبوتوں۔۔۔اور۔۔۔دلائل کے سامنے۔۔۔مخالف وکیل۔۔۔ ہونق۔۔۔ بن کر رہ گیا۔۔۔ زبان لُکنت کا شکار ہو گئی۔۔۔ چارو۔۔۔و۔۔۔ناچار۔۔۔عدالت کو۔۔۔محمود میواتی کے آگے۔۔۔سرِ خم تسلیم کرنا پڑا۔۔۔اور۔۔۔ساتویں پیشی کے بعد۔۔شاہ برادران۔۔۔ فاتح کی صورت۔۔۔جیت کا پھریرا لہراتے۔۔۔عدالت سے۔۔۔کچھ اس طرح برآمد ہوئے۔۔۔جیسے امیر مینائی کی غزل کا پرتو:

سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ
نکلتا آ رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

ایک طرف جیت کا جشن۔۔۔دوسری جانب۔۔۔ ہار کی خفت۔۔۔ مگر۔۔۔جنگل میں رہ کر۔۔۔شیر سے بیر۔۔۔ہر کسی کے بس کی بات کہاں۔۔۔ ایک طرف۔۔۔شاہ برادران کے۔۔۔حمایتی۔۔۔اور حالی موالی۔۔۔جیت کا جشن۔۔۔ ہار۔۔۔پھول۔۔۔ مٹھائی۔۔۔ اور۔۔۔ ڈھول۔۔۔ تاشوں کی صورت منا رہے تھے۔۔۔تو۔۔۔ دوسری جانب۔۔۔صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔۔۔عدالت کے حکم پر۔۔۔کوئی فرد۔۔۔یا۔۔۔افراد۔۔۔آستانہ عالیہ شاہ صاحب ۔۔۔ کے علاوہ۔۔۔ کوئی۔۔۔ پیرخانہ۔۔۔ یا۔۔۔ دم۔۔۔ دُرود کی۔۔۔ دکان کھولنے کا مجاز تھا۔۔۔ نہ۔۔۔کسی ایسے عمل کا مرتکب ہو سکتا۔۔۔جو آستانہ عالیہ کی شہرت و ناموری کے لیے باعث آزار ہو۔۔۔!

☆

شاہ برادران نے۔۔۔اپنے حمایتوں۔۔۔اور۔۔۔مریدین کی بڑی تعداد کی خواہش کے پیش نظر۔۔۔ آمدہ جمعرات کی شام۔۔۔ بعد عصر۔۔۔ آستانہ عالیہ شاہ صاحب پر۔۔۔ یوم تشکر۔۔۔منانے کا اعلان کیا۔۔۔ مدت کے بعد۔۔۔آستانہ عالیہ شاہ صاحب کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔۔۔ہر چہرہ خوشی سے لال۔۔۔اور۔۔۔ ہر زبان۔۔۔ اظہار تشکر سے لبریز تھی۔۔۔ایسے میں ہارے ہوئے جواری۔۔۔کیا کرتے۔۔۔کہاں جاتے۔۔۔باہمی مشورے کے بعد۔۔۔باغی۔۔۔اور۔۔۔بھگوڑے۔۔۔مریدوں۔۔۔اور۔۔۔جعلی پیروں کے لیے۔۔۔شاہ برادران سے۔۔۔معافی۔۔۔تلافی۔۔۔اور۔۔۔آئندہ کے لیے۔۔۔بھرپور تعاون کے علاوہ۔۔۔کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔شاہ برادران بھی۔۔۔ بڑے شاطر۔۔۔اور۔۔۔کائیاں نکلے۔۔۔کسی باغی۔۔۔یا۔۔۔ بھگوڑے کو۔۔۔لعن تعن کرنے کے بجائے۔۔۔ گلے لگا کر۔۔۔خوش آمدید کہنے لگے۔۔۔یہ صلح نامہ۔۔۔ایک طرح سے۔۔۔خاموش معافی نامہ تھا۔۔۔ جس میں۔۔۔آستانہ عالیہ شاہ صاحب۔۔۔اور۔۔۔شاہ برادران کی۔۔۔غیر مشروط حمایت۔۔۔اور۔۔۔فرماں برداری۔۔۔لازمی شرط تھی۔۔۔!

آستانہ عالیہ شاہ صاحب پر۔۔۔ بُرے دن۔۔۔ آسیب بن کر آئے۔۔۔اور۔۔۔ جادو بن کر چلے تو گئے۔۔۔مگر۔۔۔ خاندان کے ہر فرد کو۔۔۔کسی نہ کسی طور۔۔۔اندر سے کھوکھلا ضرور کر گئے۔۔۔آزمائش کی گھڑی سے۔۔۔ سرخرو ہونے کے بعد۔۔۔ ہر کوئی۔۔۔ خاندان کی یکجائی۔۔۔ اور۔۔۔باہمی اتفاق کے لیے کوشاں تھا۔۔۔!

بڑی پیرنی۔۔۔یعنی شاہ صاحب مرحوم کی پہلی بیوی۔۔۔مسماۃ کلثوم بیگم نے۔۔۔ اس سمت۔۔۔ پہلا قدم بڑھایا۔۔۔تو۔۔۔ خاندان کے سبھی افراد۔۔۔ کے چہروں پر۔۔۔خوشی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ کہاں وہ وقت۔۔۔ کہ۔۔۔ بڑی پیرنی۔۔۔اپنی سوکن کا نام تک سننا گوارا نہ کرتیں۔۔۔کہاں یہ حال۔۔۔کہ۔۔۔برسوں سے رُکی۔۔۔سوکن کی بیٹی کی شادی کی تجویز خود۔۔۔ بڑی پیرنی نے پیش کی۔۔۔ بلکہ شادی کی رسم کو۔۔۔اس قدر دھوم دھام۔۔۔ اور۔۔۔ بڑے پیمانے پر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔۔۔کہ۔۔۔مخالفین۔۔۔ اور۔۔۔ناقدین کے منہ بند ہو جائیں۔۔۔!

بڑی پیرنی کا حکم۔۔۔اور۔۔۔خواہش کے آگے خاندان کے ہر فرد نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے۔۔۔ اپنی بساط سے بڑھ کر۔۔۔اس شادی کو یادگار بنانے کے لیے۔۔۔تن۔۔۔من۔۔۔دھن۔۔۔سے جُٹ گیا۔۔۔بڑے شاہ صاحب کے انتقال کے بعد۔۔۔ خاندان کی یہ پہلی خوشی تھی۔۔۔جس کے ذریعے۔۔۔حریفوں۔۔۔اور حاسدوں کو۔۔۔منہ توڑ جواب دیا جانا مقصود تھا۔۔۔!

سب سے پہلے۔۔۔دہلی۔۔۔لکھنؤ۔۔۔حیدر آباد۔۔۔لاہور۔۔۔ پٹنہ۔۔۔اور کشمیر سے۔۔۔نامی گرامی باورچی۔۔۔ بندو خان۔۔۔ جھنڈے خان۔۔۔پیارے خان۔۔۔ تراب خان۔۔۔ اور منصف خان کو طلب کیا گیا۔۔۔ اُس کے بعد۔۔۔بمبئی کے نامور قوال بچے اُستاد چھجوں خان اور ہمنوا۔۔۔گولیار کے اُستاد بسمل خان اور ہمنوا۔۔۔پٹیالہ کے اُستاد مٹھے خان اور ہمنوا۔۔۔کیرانہ کے اُستاد بنّے خان اور ہمنوا۔۔۔ کے علاوہ زہرا بائی انبالے والی۔۔۔خوشتر بائی پٹیالے والی۔۔۔اور۔۔۔شمیم عرف چھمّو بائی کلکتے والی کے علاوہ۔۔۔ نامور مسخرے۔۔۔ جادو گر۔۔۔ ۔ بہروپیے۔۔۔مالشیئے۔۔۔ پالشیئے۔۔۔نائی۔۔۔دھوبی۔۔۔حکیم۔۔۔وید۔۔۔پہلوان۔۔۔نوٹنکی۔۔۔ اور خوانچہ فروشوں کو بھی۔۔۔طلب کیا گیا۔۔۔!

☆

لڑکے والے۔۔۔ تین دن سے زیادہ قیام کے حامی نہ تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ بڑی پیرنی کے حکم پر۔۔۔ بارات کو۔۔۔ پورے سات دن ٹھہرایا گیا۔۔۔اور۔۔۔تمام خانساموں۔۔۔و۔۔۔ باورچیوں کے مشورے سے

۔۔۔ساتوں دن کے ناشتے۔۔۔ظہرانے۔۔۔اور عشائیے۔۔۔کی بابت۔۔۔ تمام تفصیل۔۔۔و۔۔۔ترتیب پیشگی طور پر تیار کر لی۔۔۔لڑکے والوں کی فرمائش پر باورچیوں اور خانساموں کو صوفیانہ کھانوں سے قطعی پرہیز کی ہدایت کر دی گئی تھی۔۔۔یعنی خالص سبزی والے کھانے۔۔۔!

ناشتہ:

۱۔ جلیبی۔۔۔کچوری۔۔۔بھلیئے کی بھجیا۔۔۔اور۔۔۔بالائی والا دودھ
۲۔ نہاری۔۔۔نان۔۔۔باداموں والا سوجی کا حلوہ۔۔۔بادام والا دودھ
۳۔ حلوہ۔۔۔پراٹھا۔۔۔سیخ کباب۔۔۔کانجی کے بڑے۔۔۔ربڑی دودھ
۴۔ بونگ۔۔۔پائے۔۔۔تافتان۔۔۔نان کھتائی۔۔۔پیڑے والی لسّی
۵۔ انڈہ۔۔۔پراٹھا۔۔۔اندرسے۔۔۔باقرخانی۔۔۔دودھ جلیبی
۶۔ مٹھی۔۔۔کشمیری کلچہ۔۔۔بیسن کے لڈو۔۔۔تل بھگا۔۔۔کیسری والا دودھ
۷۔ سرسوں کا ساگ۔۔۔مکّا کی روٹی۔۔۔سوہن حلوہ اور مہری

ظہرانے:

۱۔ قورمہ۔۔۔پلاؤ۔۔۔زردہ۔۔۔فیرنی۔۔۔شیرمال
۲۔ شب دیگ۔۔۔ تلی ہوئی بھنڈی۔۔۔ بھنے ہوئے تیتر۔۔۔ چپاتی۔۔۔رس ملائی۔
۳۔ بریانی۔۔۔بگھارے بینگن۔۔۔اُردکی دال۔۔۔پھلکے۔۔۔فالودہ
۴۔ دوپیازہ۔۔۔بڑیئے۔۔۔پسندے۔۔۔چپاتی۔۔۔ٹھنڈی قلفی
۵۔ کوفتے۔۔۔پارچے۔۔۔کھنڈلی۔۔۔چپاتی۔۔۔شاہی ٹکڑے
۶۔ حلیم۔۔۔بریانی۔۔۔اُلٹے پکٹے۔۔۔نان۔۔۔گلاب جامن
۷۔ بھرواں کریلے۔۔۔مچھلی کا سالن۔۔۔کڑھی۔۔۔چاول۔۔۔گاجر کا حلوہ

عشائیے:

۱۔ پالک پنیر۔۔۔بھیجہ۔۔۔بتھوے کا ساگ۔۔۔چپاتی۔۔۔دیسی گھی کی پنجیری
۲۔ حیدرآبادی بریانی۔۔۔پتھر گوشت۔۔۔دالچہ۔۔۔چپاتی۔۔۔پیٹھے کا حلوہ
۳۔ دم پخت۔۔۔یخنی۔۔۔کھڑے مصالحے کی سب ملی دال۔۔۔دہی پھلکی۔۔۔چپاتی۔۔۔کھیر
۴۔ ہرن کا بھنا گوشت۔۔۔ بکرے کی چانپیں۔۔۔ مونگرے کا ساگ۔۔۔چپاتی۔۔۔شیرخورما
۵۔ آلو پالک۔۔۔مٹر قیمہ۔۔۔شامی کباب۔۔۔ہریسہ۔۔۔گجریلا
۶۔ مرغ قورمہ۔۔۔ روسٹ بٹیرے۔۔۔ آلو کی بھجیا۔۔۔ ارہر کی دال۔۔۔چپاتی۔۔۔گولے کی لوج
۷۔ دال گوشت۔۔۔بھُنی ہوئی کلیجی۔۔۔کابلی پلاؤ۔۔۔چپاتی۔۔۔رس ملائی

☆

باراتیوں کی دلچسپی کے پیشِ نظر۔۔۔ناشتے۔۔۔ظہرانے۔۔۔عشائیے کی طرز پر۔۔۔ورائٹی پروگرام کی۔۔۔تفصیل۔۔۔و۔۔۔ترتیب حفظ مراتب کو سامنے رکھ کر طے کی گئی تھی۔۔۔ روزانہ۔۔۔ تین وقت مرغن کھانا۔۔۔ سونا۔۔۔ اور ۔۔۔ اینڈنا۔۔۔ دن بھر۔۔۔ باراتیوں کے چہروں پر۔۔۔ تھکان۔۔۔ بےزاری۔۔۔ اور ۔۔۔ بے رونقی چھائی رہتی۔۔۔جس باراتی سے بات کرو۔۔۔اُس کا ایک ہی سوال ہوتا۔۔۔آج رات۔۔۔کس کا پروگرام ہے۔۔۔؟

۱۔ چھمّو بائی کلکتے والی
۲۔ اُستاد بنّے خان اور ہمنوا
۳۔ زہرا بائی انبالے والی
۴۔ اُستاد مٹھے خان اور ہمنوا
۵۔ خوشتر بائی پٹیالے والی
۶۔ اُستاد بسمل خان اور ہمنوا
۷۔ اُستاد چھجو خان اور ہمنوا

روزانہ کی بنیاد پر۔۔۔ مسخروں ۔۔۔ بہروپیوں۔۔۔ اور۔۔۔ جادوگروں کو۔۔۔ حالات کی مناسبت سے۔۔۔ وقفوں کے درمیان۔۔۔ باری۔۔۔ باری۔۔۔موقع فراہم کرنا تھا۔۔۔مگر۔۔۔پہلے دن ہی۔۔۔کیا باراتی۔۔۔کیا۔۔۔باراتیوں کے میزبان۔۔۔سب کے سب۔۔۔چھمّو بائی کی اُٹھتی جوانی۔۔۔ لچکیلے بدن۔۔۔اور۔۔۔قاتل اداؤں کے۔۔۔کچھ اس طور دیوانے ہوئے۔۔۔کہ۔۔۔یکا یک داغ صاحب یاد آ گئے:

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

دوسرے۔۔۔ تیسرے۔۔۔ غرض۔۔۔ ہر دن۔۔۔ تماشائیوں کی جانب سے۔۔۔ایک ہی مطالبہ ہوتا۔۔۔چھمّو بائی۔۔۔چھمّو بائی۔۔۔چھمّو بائی۔۔۔ہر روز۔۔۔آغاز۔۔۔اور۔۔۔اختتام پر چھمّو بائی کا۔۔۔ ہیجان خیز مجرا۔۔۔لازمی ہو گیا تھا۔۔۔!

نوجوانوں کی دل بستگی۔۔۔اپنی جگہ۔۔۔مگر۔۔۔اُن کی ٹولیوں کے درمیان۔۔۔مقابلہ۔۔۔ بلکہ سیدھی۔۔۔ سیدھی۔۔۔ جنگ۔۔۔ علاقے کی فضا کو کشیدہ۔۔۔کر رہی تھی۔۔۔گاؤں کے چوہدری کی۔۔۔لٹھ بردار پلٹن۔۔۔ سر پھرے۔۔۔ جذباتی نوجوانوں کو قابو میں کرنے سے قاصر تھی۔۔۔غریب ۔۔۔ غربا۔۔۔ اور کمی کمین۔۔۔ تو۔۔۔ چوہدری کی لٹھ بردار پلٹن کے سامنے۔۔۔ بھیگی بلّی بن جاتے۔۔۔ مگر۔۔۔ کھاتے ۔۔۔ پیتے۔۔۔ زمینداروں ۔۔۔ نوابوں ۔۔۔اور۔۔۔ پیروں کے۔۔۔ منہ زور۔۔۔ نوجوان۔۔۔چوہدری کی لٹھ بردار پلٹن کو۔۔۔قطعی خاطر میں نہ لاتے۔۔۔!

یوں تو۔۔۔ دل پھینک۔۔۔لونڈوں ۔۔۔اور منچلوں کی۔۔۔لمبی

قطار۔۔۔چھمّو بائی کلکتہ والی پر۔۔۔فریفتہ ہوکر۔۔۔سب کچھ وارنے۔۔۔ اور۔۔۔نچھاور کرنے کو۔۔۔بے چین۔۔۔و۔۔۔بے قرار تھی۔۔۔مگر۔۔۔ بڑے شاہ صاحب مرحوم کی تیسری بیگم۔۔۔ دلشاد بانو کے بڑے صاحبزادے۔۔۔ابصار حسین۔۔۔اور۔۔۔عبداللہ پور کے نئے نویلے نواب شوکت علی خان کے درمیان۔۔۔تو۔۔۔جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔۔۔ اگر۔۔۔ نواب آف عبد اللہ پور۔۔۔ چوتیوں کی تھیلی۔۔۔ چھمّو بائی پر وارتے۔۔۔تو۔۔۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے۔۔۔ ابصار حسین۔۔۔ اٹھنّیوں کی تھیلی ہوا میں لہرا کر۔۔۔چھمّو بائی کے اوپر نچھاور کردیتے۔۔۔نواب زادے اور پیرزادے۔۔۔کی چشمک سے۔۔۔طوائف زادی خوب خوب۔۔۔ مسحور ہو رہی تھی۔۔۔ اُس کی خواہش تھی۔۔۔ کہ۔۔۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔۔۔دونوں۔۔۔امیرزادوں کے جذبات۔۔۔اس قدر انگیخت کرے۔۔۔ کہ۔۔۔وہ اپنی۔۔۔تمام تر دولت۔۔۔اس پر نچھاور کردیں۔۔۔اپنی خواہش کی تکمیل میں۔۔۔ جوں ہی۔۔۔شمیم عرف چھمّو بائی نے۔۔۔روایتی۔۔۔ گیت۔۔۔اور۔۔۔غزلوں کے برعکس۔۔۔حضرت امیر خسرو کا کلام چھیڑا:

اپنی چھوی بنائے کے جو میں پی کے پاس گئی
جب چھوی دیکھی پیہو کی تو اپنی بھول گئی
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائے کے
بات ادھم کہہ دی نی رے موسے نیناں ملائے کے
بل بل جاؤں میں تورے رنگ رجوا
اپنی سی رنگ دی نی رے موسے نیناں ملائی کے
پریم بھٹی کا مدوا پلائے کے متواری کر دی نی رے
موسے نیناں ملائے کے
گوری گوری بَیّاں ہری ہری چوڑیاں
بَیّاں پکڑ دھر لی نی رے موسے نیناں ملائے کے
خسرو نجام کے بل بل جایئے
موہے سہاگن کی نی رے موسے نیناں ملائے کے

خدا معلوم۔۔۔چھمّو کے گلے کا سوز۔۔۔یا۔۔۔خسرو کے کلام کی تاثیر تھی۔۔۔کہ۔۔۔فوراً ہی۔۔۔چاندی کے روپوں کی باری آ گئی۔۔۔دونوں گروہوں کے درمیان۔۔۔کشیدگی۔۔۔انتہا کو پہنچ رہی تھی۔۔۔اتنے میں۔۔۔ نشے میں دھت۔۔۔عبداللہ پور کے نوخیز نواب نے۔۔۔چاندی کے روپوں کی تھیلی کو۔۔۔چھمّو بائی کی جانب اُچھالنے کے بجائے۔۔۔چھمّو بائی کے قریب جا کر۔۔۔کھینچا تانی کرتے ہوئے۔۔۔روپوں کی تھیلی۔۔۔چھمّو بائی کی چولی میں اُنڈیل دی۔۔۔!

چھمّو بائی غیظ وغضب کے عالم میں۔۔۔ایک نظر۔۔۔ابصار حسین شاہ کی جانب دیکھتی۔۔۔حقارت کی دوسری نظر۔۔۔عبداللہ پور کے نوخیز نواب پر ڈالتی۔۔۔فضا میں ہُو کا عالم تھا۔۔۔ایسا لگتا تھا۔۔۔جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے۔۔۔!

اتنے میں۔۔۔ٹھاہ۔۔۔کی آواز سے۔۔۔بندوق کی گولی۔۔۔عبد اللہ پور کے نواب کی جانب داغی گئی۔۔۔گولی۔۔۔نواب آف عبداللہ پور کے سینے میں پیوست ہوگئی۔۔۔!

نواب آف عبداللہ پور کا بدن۔۔۔چند ثانیے پھڑکنے کے بعد۔۔۔ سرد پڑ گیا۔۔۔مجمع میں۔۔۔بھگدڑ مچ گئی۔۔۔کسی کو کچھ دکھائی دیتا تھا۔۔۔ نا۔۔۔سنائی۔۔۔ہر کوئی۔۔۔نہ معلوم منزل کی جانب۔۔۔سر چھپانے کو بے تاب تھا۔۔۔!

کچھ دیر بعد۔۔۔بھیڑ چھٹی۔۔۔تو۔۔۔ابصار حسین شاہ۔۔۔ اور۔۔۔اُن کے حواری۔۔۔ندارت تھے۔۔۔قریب۔۔۔پچاس۔۔۔ پچپن۔۔۔برس کا۔۔۔ایک نحیف۔۔۔و۔۔۔ناتواں شخص۔۔۔ہاتھ میں طمنچہ لئے۔۔۔سر جھکائے۔۔۔مجمع کے بیچوں بیچ۔۔۔نادم۔۔۔و۔۔۔شرمسار۔۔۔ کھڑا تھا۔۔۔!!!

جِن

یورپ کی جوان لڑکیوں پر جِن کیوں نہیں آتے۔۔۔؟ ایک تو جِن زیادہ تر مسلمان ہوتے ہیں انھیں غیر مذاہب والے پسند نہیں۔۔۔ دوسرا یورپ میں ہر جوان لڑکی کا بوائے فرینڈ ہوتا ہے اس لیے لڑکی اکیلی نہیں ملتی۔۔۔ پھر لڑکیاں رات کسی درخت کے نیچے اکیلے بسر نہیں کرتیں اس طرح جِن کو موقع نہیں ملتا۔۔۔ دوسرا پاکستان کی طرح لڑکیاں نہا کر بال کھول کر نہیں پھرتیں یورپ کی تمام لڑکیاں کام کرتی ہیں اس لیے نہا کر ڈرائر سے فوری بال خشک کر کہ باندھ لیتی ہیں اور کام پر چلی جاتی ہیں۔۔۔ پھر یورپ میں لڑکیاں منت مرادیں وغیرہ مانگنے مزاروں پر نہیں جاتیں جہاں اکثر مولوی صورت جِنوں کا راج ہوتا ہے اس لیے جِنوں سے محفوظ رہتی ہیں۔۔۔ دوسرا یورپ میں رات کو ہر جگہ بلب جلتے ہیں گھپ اندھیرے کا تصور نہیں ہے روشنی سے زیادہ تر جِن دور بھاگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی جِن کسی جوان لڑکی پر آ بھی جائے تو لڑکی پادری کے پاس جانے کی بجائے ڈاکٹر سے رجوع کرتی ہے اور ڈاکٹر بہت جلد جِن کو دور بھاگا دیتا ہے۔ چونکہ یورپ میں جِن حضرات کو جوان لڑکیوں پر آنے کا موقع نہیں ملتا اس لیے جنوں کی اکثریت پاکستان (اور ہندستان) ہجرت کر چکی ہے۔۔۔!

بھیڑنی

تحریر: جوبانی ویرگا (اٹلی)
ترجمہ: احمد مشتاق (امریکہ)

وہ لمبی تھی اور پتلی۔ جلد کا رنگ زیتونی تھا اور سینہ پر شکوہ اور سخت۔ لیکن اب وہ ایسی جوان نہیں لگتی تھی۔ رنگ اُس کا پیلا تھا۔ جیسے ہمیشہ سے ملیریا کے مرض میں مبتلا ہو۔ اور اس پیلاہٹ میں دو بڑی بڑی آنکھیں اور کھا جانے والے تازہ سرخ ہونٹ۔ گاؤں میں سب اُسے بھیڑنی کہتے، کیونکہ کسی بھی شے سے اُس کا جی نہیں بھرتا تھا۔

عورتیں جب اسے گزرتے دیکھتیں تو فوراً صلیب کا نشان بناتیں۔ لیکن وہ اُن کے پاس سے بڑی بے نازی سے وحشی کتیا کی طرح اکیلی گزری چلی جاتی۔ وہ چلتے ہوئے کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح لگتی جو شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر سونگھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ گاؤں کی عورتیں اس سے پناہ مانگتی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے سرخ ہونٹوں کی ایک جھلک سے ان کے شوہروں اور بیٹوں کا لہو چاٹ سکتی تھی۔ وہ چاہے گرجا ہی میں کیوں نہ کھڑے ہوں، اس کی کالی شیطانی آنکھوں کے ایک اشارے پر اُس کے پیچھے پیچھے چل کھڑے ہوتے۔ خوش قسمتی سے بھیڑنی کبھی گرجا نہ گئی، نہ کبھی ایسٹر پر نہ کرسمس میں، نہ پادری کا وعظ سنے، نہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے۔ سینٹ مری کے گرجا کا ایک پادری بھی تو اس کے پیچھے اپنی روح کا سکون لٹا بیٹھا تھا۔

لیکن اُس کی اِن باتوں کی وجہ سے سب سے زیادہ پریشان اُس کی بیٹی مریشیا تھی۔ مریشیا بیچاری اکیلے میں چھپ کے روتی کیونکہ بھیڑنی اُس کی ماں تھی اور وہ جانتی کہ اِس وجہ سے گاؤں کا کوئی لڑکا بھی اُس سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ گاؤں کی اور لڑکیوں کی طرح اُس کے پاس اچھے اچھے کپڑے بھی تھے اور زمین بھی کافی تھی۔

ایک دفعہ بھیڑنی ایک خوبصورت نوجوان کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ یہ نوجوان فوج سے تازہ تازہ لوٹا تھا۔ اور اُنہی کھیتوں میں گندم کی کٹائی کے کام پر لگا تھا۔ جن میں بھیڑنی بھی کام کرتی تھی۔ جب وہ اُسے دیکھتی تو اُسے کپڑوں کے نیچے اپنا جسم جلتا ہوا محسوس ہوتا۔ اُسے ایسا لگتا جیسے میدانی علاقوں میں جون کے مہینے کی کسی بے حد گرم دوپہر کو شدت سے پیاس لگتی ہے۔ لیکن وہ گندم کے خوشوں پر اپنی ناک جھکائے بڑے اطمینان سے کٹائی کرتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ اُسے پوچھ لیتا۔ پینا کیا بات ہے۔ پر وہ اُسے اسی طرح دیکھے چلی جاتی۔

ڈورڈور تک پھیلے ہوئے سورج بڑے زوروں سے چمکتا، اور اس کی گرم گرم شعاعیں سروں پر ہتھوڑوں کا کام کرتیں۔ لیکن بھیڑنی کٹی ہوئی فصل کے گٹھے پر گٹھا رکھتی چلی جاتی۔ نہ اُسے کبھی تھکان محسوس ہوتی نہ ہی وہ ایک لحظہ کے لیے کمر سیدھی کرنے کھڑی ہوتی، اور وہ یہ سب محنت اِس لیے کرتی کہ اپنے محبوب ننی کو دیکھتی رہے جو فصل کاٹتا چلا جاتا اور بیچ بیچ میں پوچھ لیتا:

"پینا تم کیا چاہتی ہو۔"

پھر ایک شام جب ڈورڈور پھیلے ہوئے گاؤں کے اندھیرے میں کُتے بھونک رہے تھے اور دن بھر کے تھکے ہارے مزدور فرش پر پڑے اُنگھتے تھے۔ پینا نے حرفِ مطلب کہہ دیا۔

"میں ننی چاہتی ہوں ننی۔ تم جو سورج کی طرح خوبصورت اور شہد کی طرح شیریں ہو۔ میں ننی چاہتی ہوں۔"

"پر مجھے تو تمہاری وہ کنواری بیٹی پسند ہے۔" ننی ہنستے ہوئے بولا۔

اِس پر بھیڑنی نے اپنی کنپٹیاں کھجانی شروع کر دیں۔ پھر انگلیاں بالوں میں ڈال لیں، منہ سے کچھ نہ کہا اور چلی گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی کھیتوں میں نہ آئی۔ لیکن اکتوبر کے مہینے میں اُس نے ننی کو پھر دیکھ لیا۔ اب کی وہ بھیڑنی کے گھر کے پاس ہی ایک چکی میں زیتون کا تیل نکالنے پر مامور ہوا تھا۔ چکی کی آواز نے بھیڑنی کو رات بھر جگائے رکھا۔ صبح کو بھیڑنی نے اپنی بیٹی مریشیا سے کہا کہ " زیتون سے بھرا ہوا ایک ٹوکرا اٹھا اور میرے ساتھ ہولے" ننی چکی کے اندر زیتون کے گٹھے ڈال رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اوہی اوہی کی آواز بھی مُنہ سے نکالتا جاتا تھا تاکہ خچر چلتے چلتے رُک کر کھڑا نہ ہو جائے۔

"تمہیں میری بیٹی مریشیا پسند ہے نا!"

"تم اُسے جہیز میں کیا دو گی؟"

"اس کے پاس اپنے باپ کی ساری چیزیں موجود ہیں، اُس کے علاوہ میں اپنا ذاتی مکان بھی دے دوں گی۔ مجھے تو سر چھپانے کو ذرا سی جگہ چاہیے سو میں باورچی خانے کے کسی کونے میں چٹائی ڈال کے پڑ رہوں گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم کرسمس پر طے کر لیں گے۔"

ننی ہر وقت تیل میں بھیگا رہتا۔ تیل میں بھیگے ہوئے گندے میلے جسم پر زیتون کے پتے چپکے رہتے۔ مریشیا اُسے کیسے پسند کر سکتی تھی لیکن اُس کی ماں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر آتشدان کے پاس گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "اگر تو اس سے شادی نہیں کرے گی تو میں تجھے جان سے مار دوں گی۔"

بھیڑنی سخت بیمار تھی اور لوگ کہتے تھے کہ شیطان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو راہبوں کی طرح گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ اب نہ وہ اپنی جادو بھری آنکھوں کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتی نہ کبھی دروازے میں آ کر کھڑی ہوتی۔ لیکن جب وہ اپنی آنکھیں اپنے داماد پر جما دیتی تو وہ ہنسنا شروع کر دیتا اور فوراً صلیب کا نشان بناتا۔

مریشیا بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر رہتی اور اُس کی ماں مردوں کے ساتھ کام کرنے کھیتوں پر چلتی جاتی۔ اور مردوں ہی کی طرح فصل کی نندائی کرتی۔ زمین صاف رکھتی اور جانوروں کو چارہ ڈالتی۔

وہ جنوری کی منجمد کر دینے والی ہواؤں اور اگست کی چلچلاتی دھوپ میں جب کہ کوئی شریف عورت گھر سے قدم باہر نہیں نکالتی۔ گاؤں کے پھیلے ہوئے

رستوں پر اکیلی گھومتی رہتی۔ دم گھونٹ دینے والی گرمی میں وہ رستوں کے جلے ہوئے پتھروں پر چلتی اور کھیتوں میں کٹی ہوئی فصل کے گرم گرم ٹھنٹوں کے درمیان گزرتی چلی جاتی۔

"اُٹھو۔۔۔ بھیڑنی ننی سے مخاطب ہوئی۔ وہ گردآلود باڑہ کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے گڑھے میں اپنے بازوؤں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ جاگو میں تمہارا گلا تر کرنے کے لیے تھوڑی سی شراب لائی ہوں۔"

ننی نے ایک دفعہ تو اپنی نیند بھری آنکھیں کھول دیں۔

پھر وہ کھلی آنکھوں سے اُسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ اپنی اُسی پیلاہٹ میں کوئلے جیسی کالی آنکھوں اور پُر شکوہ سینے سمیت اس کے سامنے کھڑے تھی۔ "کوئی شریف عورت ایسے اوقات میں اپنے گھر سے نہیں نکلتی دفعہ ہو جاؤ۔ اور پھر کبھی کھیتوں کا رخ نہ کرنا۔"

ننی نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر گڑھے کی خشک گھاس پر ڈال دیا۔ اور بھیڑنی اپنی کالی آنکھوں کے ساتھ اُنہی جلتے ہوئے ٹھنٹوں میں سے گزرتی واپس چلی گئی۔

لیکن وہ ایک دفعہ پھر کھیتوں میں آئی بلکہ کئی دفعہ اور ننی نے کوئی شکایت نہ کی۔ اُس کے برعکس جب بھیڑنی کو ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ بالکل اُنہی اوقات میں جب کہ کوئی شریف آدمی اپنے گھر سے قدم باہر نہیں نکالتا۔ پسینے سے شرابور پیشانی کے ساتھ سفید اجاڑ راستوں پر اُس کا انتظار کرتا اور ہر بار اپنے بالوں کو ہاتھوں میں پکڑ کر کہتا۔

"دفعہ ہو جاؤ پینا دفعہ ہو جاؤ اب کبھی کھیتوں کا رُخ نہ کرنا۔"

مریشیا بیچاری دن رات روتی۔ اور ایک دن جب اُس کی ماں کھیتوں سے زرد اور خاموش واپس لوٹی تو پہلے تو وہ اُس کی طرف حسد سے اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہی پھر ایک دم پھٹ پڑی۔

"تم بدمعاش ہو۔ ماں"

"بکواس بند کرو"

"تم چور ہو"

"بکواس بند کرو"

"میں تھانیدار سے شکایت کروں گی۔ ضرور کروں گی۔"

"جاؤ کرو"

اور وہ واقعی چلی گئی۔ اپنے بچوں کو گود میں اُٹھائے۔ بغیر کسی خوف کے بغیر ایک آنسو بہائے، پاگل عورت کی طرح۔۔۔

اب وہ بھی اس گندے اور میلے آدمی سے محبت کرنے لگ گئی تھی جو زبردستی اُس پر ٹھونس دیا گیا تھا۔

تھانیدار نے ننی کو بلایا۔ اور اُسے جیل میں بند کر دینے بلکہ پھانسی دے دینے کی دھمکی بھی دی۔ ننی رونکھا ہو گیا اور اُس نے اپنے بال نوچ لیے لیکن کسی بات سے بھی انکار نہ کیا اور نہ ہی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"یہ ترغیب یہ جہنم کی ترغیب ہے۔" اُس نے کہا۔ اور اپنے آپ کو تھانیدار کے قدموں پر گرا دیا۔

"مجھے جیل بھیج دو، مجھے اِس جہنم سے نجات دلاؤ۔ خدا کے لیے مجھے مار دو جیل میں بند کر دو۔ میں اُسے بالکل نہیں دیکھنا چاہتا، کسی قیمت پر بھی نہیں۔" "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" بھیڑنی تھانیدار سے مخاطب ہوئی۔

میں نے اُسے اپنا مکان جہیز میں دیا لیکن باورچی خانے میں ذرا سی جگہ اپنے سر چھپانے کے لیے رکھ لی۔ یہ میرا گھر ہے میں اِسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ کچھ عرصے کے بعد ننی کو ایک خنجر نے چھاتی میں دولتی ماردی اور وہ ایسا پڑا کہ موت کے کنارے پر پہنچ گیا۔۔ پادری سے جب مقدس رسم کے سلسلے میں کہا گیا تو اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک بھیڑنی اس گھر میں موجود ہے میں ہرگز ہرگز اندر داخل نہیں ہو سکتا۔۔ چنانچہ بھیڑنی گھر سے نکل گئی۔

تب کہیں اُس کا داماد اِس قابل ہو سکا کہ کسی اچھے عیسائی کی طرح اس دنیا سے رخصت ہونے کی تیاری کر سکے۔ اُس نے اپنے سارے گناہوں کا اعتراف کیا اور کچھ اِس طرح سے اپنے کیے پر پچھتایا اور توبہ استغفار کی کہ اُس کے بستر کے پاس کھڑے تمام احباب اور ہمسائے رونے لگ گئے۔

"کاش ننی اُسی روز مر جاتا تاکہ شیطان اُسے پھر نہ بہکاتا اور اُس کی جسم اور روح میں حلول نہ کر جاتا۔"

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اُس نے بھیڑنی سے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے امن سے رہنے دو۔ میں موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور بیچاری مریشیا بھی اب انتہائی طور پر مایوس ہو چکی ہے۔ سارا گاؤں ہمارے اِس قصے کو جانتا ہے اب اگر میں تم سے نہ ملوں تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔۔۔"

اُس نے کوشش کی کہ اُس کی آنکھیں بھیڑنی کی آنکھوں سے نہ ملیں، کیونکہ جب وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی تو اسے اپنے جسم و روح چھنتے ہوئے دکھائی دیتے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اِس جادو سے بچ نکلے۔ اُس نے خیرات دی، پادری کے پاس جاتا رہا۔ تھانیدار سے مدد مانگی، ایسٹر پر وہ پھر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے گیا۔ اُس نے پتھروں پر پیٹ کے بل چل کر گرجا کی سیڑھیوں کو چار مرتبہ بوسہ دیا اور پھر۔۔ بھیڑنی اُسے بہکانے آ گئی۔

"سنو" اُس نے آخری دفعہ کہا۔ اب کبھی کھیتوں کا رُخ نہ کرنا۔ اگر تم آؤ گی تو خدا کی قسم میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔"

ننی نے دور فاصلے پر دیکھا، وہ گندم کے سبز کھیتوں میں چلی آ رہی تھی۔ وہ انگور کے باغ میں نندائی کرتا کرتا رُک گیا اور درخت کے ساتھ لکھی ہوئی کلہاڑی لینے کے لیے بڑھا۔ پھر بھیڑنی نے اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں اور اُس کی کلہاڑی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ لیکن وہ ایک قدم بھی نہ پیچھے ہٹی، نہ ہی اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کیں۔ وہ اُس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں سرخ پھول تھے اور کالی آنکھیں اُسے کھائے جا رہی تھیں۔

"آہ تم پر خدا کی لعنت۔" ننی رُک رُک کر بولا۔

"ایوانوں کے رستے"

شناختی کارڈ

محمود درویش

مترجم : نودان ناصر

لکھو!
میں ایک عرب ہوں
اور میرا شناختی کارڈ نمبر ہے
پچاس ہزار
ابھی میرے آٹھ بچے ہیں
بہار کے بعد نواں آئے گا
تمھیں غُصہ تو نہیں آرہا؟
لکھو!

میں ایک عرب ہوں
اپنے آٹھ بچوں کے لئے
میں مزدوروں کے ساتھ
پتھر توڑ کر روٹی لاتا ہوں
پتھر توڑ کر اپنے بچوں کے لئے،
کتابیں اور کپڑیں لے کے آتا ہوں
تمھارے دروازے پہ کھڑا بھیک نہیں مانگتا
نہ تمھارے ایوانوں کے رستے پہ کبھی چلا ہوں
کہیں تمھیں غُصہ تو نہیں آرہا؟
لکھو!

میں ایک عرب ہوں
میرے نام کے ساتھ کوئی لاحقہ نہیں جُڑا
اک ایسے مُلک میں صبر سے رہتا ہوں
جہاں لوگ ہر وقت غُصے میں ہوتے ہیں
میری جڑیں
زماں و مکاں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی ہیں
اور تاریخ کے واقع ہونے سے بھی پہلے کی ہیں
صنوبر و زیتون کے درختوں سے بھی پہلے کی ہیں
سرسبز زمین پہ یہ گھاس اُگنے سے بھی پہلے کی ہیں
میرا باپ ایک محنت کش گھر سے آیا تھا
کسی مراعات یافتہ قبیل سے نہیں
اور میرا دادا ایک کسان تھا
جو نہ ٹھیک سے کچھ کھا پایا
اور نہ ہی ٹھیک سے جی پایا
مجھے لکھنے پڑھنے سے بھی بہت پہلے
آفتاب کے جیسے اپنا سر بُلند رکھنا سکھایا گیا
میرا گھر کسی چوکیدار کی کُٹیا جیسا ہے
بانسوں اور خشک شاخوں سے بنا ہوا
کیا اب میری اوقات سے مطمئن ہو؟
میرے نام کے ساتھ کوئی لاحقہ نہیں جڑا!
لکھو!

میں ایک عرب ہوں
میرے اجداد کے باغیچے
تم نے جلا ڈالے ہیں
اور وہ زمیں جس پر میں
اپنے بچوں کیلئے کاشت کرتا تھا
وہ میرے بچوں سمیت چھین ڈالا ہے
اور ہمارے لئے ان پتھروں کے سوا
تم نے کچھ نہیں چھوڑا
کیا ریاست ان پتھروں کو بھی
ضبط کر لینا چاہتی ہے؟
جیسے وہ ہر چیز ضبط کر چکی ہے
بہر حال
لکھو!
اور پہلے صفحے کے اوپر لکھو
میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
نہ ہی میں کوئی قابض ہوں
لیکن اگر میں بھوکا ہوا
تو قابض کے بدن کا گوشت
میری خوراک ہوگی
خبردار رہو!
خبردار رہو!
میری بھوک
اور
میرے غُصے سے۔۔!

عرفانِ خودی

عبداللہ جاوید

(●)

مجرد 'میں' کا رشتہ اس سے ہے
جس نے کہا
تخلیق سے پہلے
''الست بربکم''

'مجرد میں' اسے ساجے ہے جو مالک ہے مولا ہے
جو۔۔۔۔ہر اک 'میں' کا خالق ہے
جِلانے مارنے والا۔۔

مجرد 'میں' کا رشتہ اس سے ہے
جو 'ہے'
(وہ جس کے ماسوا، جو ہے نہیں ہے)
وہ ہے
کسی رشتے بنا، نسبت بنا، علت بنا

'نہیں' سے 'ہے' کی جانب گیان کے
رستے میں
پہلے لا ہے، لا کے بعد 'ہُو' ہے
لاموجود الا اللہ
لا الٰہ الاّ اللہ
'اللہ ہُو'

کبھی دیکھیں اتر کر 'میں' میں
اپنے 'میں' کے اندر
اور کبھی باطن کے باطن میں

کہا ہے کہنے والے نے
وہ جس نے نفس کو جانا
سو اس نے رب کو پہچانا

یہ سب آسان نہیں اتنا
یہی تو گیان کی منزل ہے
عرفانِ خودی کیا ہے۔؟
خود اپنا گیان ہے جو اس کی جانب
لے کے جاتا ہے
وہ جو ذاتِ مجرد ہے
'مجرد میں کی صورت میں

یہ سب اتنا آساں نہیں ہے
خودی کے گیان کی پہلی ہی منزل بھی نہیں آساں
کبھی 'میں' میں اتر کر دیکھئے
دیکھئے کہ آپ کے 'میں' میں
نہاں ہیں ان گنت 'تو'
ان گنت 'وہ'
ان گنت ہم بھی۔۔!!

○

اگر کبھی میری یاد آئے

امجد اسلام امجد

(●)

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دلگیر روشنی میں
کِسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمھارے قدموں میں آ گرے تو
یہ جان لینا، وہ استعارہ تھا میرے دل کا،
اگر نہ آئے۔۔۔۔
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بُھول جائے!
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہَوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
مَیں خوشبوؤں میں تمھیں ملوں گا۔
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
مَیں اوس قطروں کے آئینوں میں تمھیں مِلوں گا۔
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں، نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
مَیں گرد ہوتی مسافتوں میں تمھیں مِلوں گا۔
کہیں ہی روشن چراغ دیکھو تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ مَیں بھی بکھر چُکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے اِن پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
مَیں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا۔
کِسی نہ دیکھے ہُوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دُوں گا
سمندروں کے سَفر پہ نکلو تو اُس جزیرے پہ بھی اُترنا۔

○

رباعیات

سلیم سرفراز
(اسنول)

دلچسپ و دلآویز فسانہ بھی نہیں
میرا یہ پسندیدہ زمانہ بھی نہیں
من مار کے میں پھر بھی جیے جاتا ہوں
مرنے کا یہ معقول بہانہ بھی نہیں

جب مجھ پہ وہ مائل بہ کرم ہونے لگا
آزارِ دلِ زار بھی کم ہونے لگا
اس چشمِ التفات کی حدت سے
بنجر شجرِ زیست بھی نم ہونے لگا

ہر ایک شجر کو سائباں سمجھا تھا
اک بھیڑ کو ہم نے کارواں سمجھا تھا
ہم بھی تو غضب کے سادہ لوح ہوئے
ہر شیریں سخن کو مہرباں سمجھا تھا

دل پر جو گزرتا ہے، گزر جانے دے
اس دیدۂ پرآب کو اتر جانے دے
بارش کے بعد جیسے کھلتی ہے زمیں
اس پیکرِ گِل کو بھی نکھر جانے دے

یہ ترکِ تعلق بھی مکمل نہ ہوا
آنکھوں سے وہ چہرہ کبھی اوجھل نہ ہوا
اک درد سا اٹھتا ہے شبِ فرقت میں
دروازۂ امید مقفل نہ ہوا

اب مجھ کو دریچے سے اشارا نہ کرے
جاتا ہوں تو پیچھے سے پکارا نہ کرے
کچھ دن سے مزاج اس کا تبدیل ہوا
وہ شوخ کہیں مجھ سے کنارا نہ کرے

بولتی تصویر

سید انوار زین
(راولپنڈی)

جب سرد ہوائیں چلتی ہیں
اور یادیں دل میں جلتی ہیں
اک شخص ہمیں یاد آتا ہے
ہم سب کچھ بھولنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب شب کو چاندنی پھیلی ہو
تاروں کی آنکھ مچولی ہو
ہم غزلیں تجھ پر لکھتے ہیں
اور تجھ سے باتیں کرتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب رستوں میں ویرانی ہو
اور آنکھ میں جلتا پانی ہو
غم دل میں جھومنے لگتے ہیں
ہم تجھ کو ڈھونڈنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب برساتوں کا موسم ہو
اور آنکھ بھی تھوڑی سی نم ہو
بارش میں بھیگنے لگتے ہیں
ہم کتنا بکھرنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب گزرے زمانے یاد آئیں
جب لوگوں پرانے یاد آئیں
یادوں سے مہکنے لگتے ہیں
رستوں پہ بھٹکنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب لگتا ہے دلگیر کوئی
جب بولتی ہے تصویر کوئی
ہم خود سے لڑنے لگتے ہیں
یا خود کو بھولنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب فون کسی کا آتا ہے
تو یاد ہمیں آ جاتا ہے
ہم خود میں مرنے لگتے ہیں
سب زخم ادھڑنے لگتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں
جب زین اداسی روتی ہے
تو کتنی خموشی ہوتی ہے
ہم بے کل کتنے لگتے ہیں
ہم زین سسکنے لگتے ہیں
پر ہم کب کس کی سنتے ہیں
پھر ہم کب کس کی سنتے ہیں

○

کہو تو لوٹ جاتے ہیں

ڈاکٹر پونم گوندل
(لاہور)

کہو تو لوٹ جاتے ہیں
بڑے سنگدل زمانے کی
بڑی سنگدل رسمیں ہیں
بڑے ہی سخت قاعدے ہیں
بڑے قانون لاگو ہیں
یہاں مشکل ہے سمجھانا
زمانے سے الجھ جانا
محبت کی نزاکت کو
دلوں پہ راج کرتی
بے غرض چاہت کو لگاوٹ کو
صبر کے کفن میں رکھ دو
دلوں میں دفن ہی کر دو
ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا
کہو تو لوٹ جاتے ہیں

کہاں جا کے زخمِ جگر چیریں ساقی

نجم الحسنین حیدر
(لاہور)

تغیّر، تحیّر ۔۔۔تشکّک میں غلطاں
سورج نہ چھاؤں ۔۔۔دریا نہ گاؤں
بدن ۔۔۔پرزے پرزے، وطن کے دو ٹکڑے
مصلّوں میں لپٹے معصوموں کے لاشے!
سڑکوں پہ جمتے ۔۔۔سیاسی تماشے!
جو تاروں کو توڑیں ۔۔۔تو کوڑے میں پھینکیں
جو کوڑے سے ڈھونڈیں وہ زلفوں میں ٹانکیں
زباں کٹ رہی ہے ۔۔۔دعا لٹ رہی ہے
ردا زخمی زخمی ۔۔۔حیا لُٹ رہی ہے
کہاں جا کے ۔۔۔زخمِ جگر چیریں ساقی
کہاں جا کے چہروں سے کھالیں اتاریں
بدن ۔۔۔پرزے پرزے، وطن کے دو ٹکڑے
"حقیقت ۔۔۔خرافات میں کھو گئی ہے
یہ اُمّت ۔۔۔روایات میں کھو گئی ہے"

○

زمستانی ہوا

تسنیم عابدی
(کراچی)

جب خزاں آثار پتے ٹوٹ کر شاخوں سے گرتے ہیں
تو سوکھے پتوں کے اس شور میں
کچھ تعزیت کرنے والوں کے بین بھی شامل ہو جاتے ہیں
ہوا ماتمی لہجے میں فرقت کی داستان سناتی ہے
ہر پتا خود سے گلے مل کر رو رہا ہے
شاید تسلی بھی مر چکی ہے
اسی لیے اب شاعری وقت کی سُنانی بن چکی ہے
سجدۂ شوق سے عاری نماز
نماز جنازہ کی طرح ادا ہو رہی ہے
زمستانی ہوا کا لہجہ
صور اسرافیل کی طرح لگ رہا ہے
پتے لگاتار ٹوٹ کر گر رہے ہیں
باغ پر افسردگی چھا چکی ہے
اداسی گونگی ہے
اسی لیے میرے سینے میں
الفاظ کی انی ٹوٹ چکی ہے

○

''زندگی صرف محبت تو نہیں''

حنا افشاں
(کانپور)

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کی باقاعدہ شروعات اُس وقت کی جب ترقی پسند تحریک کا غلبہ تھا۔ ایسے ماحول میں جاں نثار اختر کے منفرد لب ولہجہ کی گونج صاف سنائی دینے لگی تھی۔

اس وقت ہندوستان میں کچھ اُتھل پُتھل کا ماحول تھا ایک نظام بگڑ چکا تھا۔ ایک نظام بن رہا تھا پاکستان میں فیض احمد فیض، حبیب جالب، احمد فراز ایک عروج پر تھے۔ ہندوستان میں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری وغیرہ اپنی شاعری سے ملک کی جمہوریت کو ایک نئی سمت دینے کی کوششیں کررہے تھے۔ انہیں کے ہم عصر شاعر جاں نثار اختر تھے۔

اختر نے شروعاتی دور میں رومانی غزلوں میں زور آزمایا اور یہ روایت انہیں اپنے والد مضطر خیرآبادی سے ملی۔ اختر کے یہاں کلاسیکی رومانیت جمالیاتی رنگ، نرمی و شگفتگی، لہجہ کا دھیما پن بلاشبہ اُن کے خوں میں تحلیل تھا۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربات نہیں کئے۔ اُن کی شاعری میں میر، غالب، حسرت سبھی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اس کی اہم وجہ اُن کی خاندانی روایات تھی۔ دوسری طرف اُن کی شاعری پر فیض احمد فیض، مجاز، اختر شیرانی وغیرہ کا اثر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جو علی گڑھ کے ماحول میں ترقی پسند تحریک کی گہما گہمی کا نتیجہ تھا۔ آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''جاں نثار سے میری ملاقات سب سے پہلے ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ میں مجاز نے کرائی اس وقت وہ اپنے باپ کے رنگ میں بڑی شوخ وچنچل غزلیں کہتے تھے۔ پھر اُنہیں ماحول کا احساس ہوا اور گردوپیش کے مسائل پر ان کی نظریں پڑنے لگیں۔ باپ سے اُنہیں رنگین تخیل اور رومانی فکر کی ایک دلکش روایت ملی تھی۔ پھر ترقی پسند تحریک نے ''میکشوں کی برہمی'' اور خانہ بدوشوں کی کائنات کے اسرار سے آشنا کرایا۔''

اس طرح ہم اختر کی شاعری کو دو دور میں تقسیم کرسکتے ہیں ایک پہلا ترقی پسند شاعری کا دور اس دور میں بھی اختر کا دھیما لہجہ اپنے ہم عصر ترقی پسند شعرا سے بالکل الگ نظر آتا ہے۔ کچھ عرصہ وہ اپنے آپ کو اس تحریک کے جوش وخروش سے آزاد نہ کرسکے ان کی ابتدائی نظمیں اور غزلیں نعرے بازی کی صورت اختیار کرتی ہیں مگر اُن میں اُس زور کی کمی نظر آتی ہے جو ترقی پسند تحریک کی خاصیت یا روایت تھی۔

بقول احتشام حسین:

''اختر طالب علمی کے دور میں بڑی دلفریب رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ دوسرے نئے شعراء کی مانند وہ بھی انقلاب کی طرف آئے۔ وہ ترقی پسند شعراء میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کو ان میں اس زردی کی کمی نظر آتی ہے جو سیاسی مسائل پر لکھنے کی لئے ضروری ہے۔''

مثال کے طور پر اُن کی اس نظم کے چند اشعار ؎

تمتمائے ہوئے عارض پر یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے اس وجہ خفا آپ سے اِتنی بیزار
میں نے کب تیری محبت سے کیا ہے انکار
مجھ کو ایک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

اُن کی یہ نظم ترقی پسند تحریک کے زمانہ میں تخلیق ہوئی مگر یہاں اگر ہم غور کریں تو تیسرے اور چوتھے مصرعے میں اُن کا رنگ رومانی حقیقت پسندی میں ڈوبا ہوا ہے اور بہت جلد وہ ادب زیست اور رومان وانقلاب سے رومانوی حقیقت کی سمت دبے پاؤں چل نکلے اور یہی اُن کی شاعری کا دوسرا دور تھا یہاں ہمیں بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جب فکری طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے تب بھی عملی طور پر وہ کلاسیکی روایات سے کبھی الگ نہیں ہوسکے۔

دیکھئے! کسی شخص کی تشکیل میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں وہ اُس کی شخصیت پر اپنا واضح اثر ڈالتے ہیں۔ جسے اُس خاندانی پس منظر، زمانہ اور ماحول وغیرہ اختر کو اعلیٰ علمی وادبی دولت وراثت میں ملی۔ ساتھ ہی ساتھ علی گڑھ کی پروردہ شریک حیات ایسی زوجہ جو خود ایک علمی وادبی ماحول کی پرورش یافتہ خاتون تھیں۔ جنہوں نے اس نازک مزاج شاعر کے مزاج کو سمجھا اور اس کے اندر چھپے ہوئے اُس شاعر کو باہر نکالا جسے ترقی پسند تحریک کی گھن گرج بھی نہ نکال سکی۔

صفیہ نے نہ صرف اختر کے ادبی کارناموں کو سراہا بلکہ وہ اُن کی تخلیقات کا مرکز اور شاعری کی محرک بھی ہیں۔ صفیہ بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ محبوبہ بھی بنی رہی۔ جن کی بے وقت موت نے جاں نثار اختر کی شعری دُنیا میں خزن وملال کی آمیزش کی جس سے خاک دل، اور ''خاموش آواز'' جیسی لافانی نظمیں وجود میں آئیں۔ یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اختر کے یہاں جو ازدواجی قربت ومحبت ہے اُردو ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ہمارے سماجی نظام میں زوجہ بنتے ہی عورت کا علم وہنر اور تمام صلاحیتیں اسیر خانہ ہو جاتی ہیں اور فکشن ہو یا شعری ادب قلم اپنے آپ رُک جاتا ہے۔ یعنی اب آگے تمام راستے بند لیکن جہاں پر ہمارا فنکار سخن تمام کرتا ہے وہیں سے اختر کے سخن کو روانی ملتی ہے اور یہاں سے اختر رومانوی حقیقت کا وہ سفر طے کرتے ہیں جس کے لئے بڑے صبر واضطراب کی ضرورت ہوتی ہے۔

''خاکِ دل'' اختر نے صفیہ کی رحلت پر کہی کیا انہوں نے اس صبر و اضطراب کو فکر وشعور میں بدل دیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہے اس سے پہلے بھی موت پر مرثیہ لکھے گئے ہیں۔ لیکن اقبال کی نظم ''والدہ مرحوم کی یاد میں'' کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص مرثیہ اس پائے کا کہا گیا ہے۔ یوں تو نظم کو شاعر نے اپنے ذاتی غم کے

اظہار کا ذریعہ بنایا مگر نظم محدود دائرے سے نکل کر سیکڑوں دلوں کی تسکین باعث بن گئی۔ نظم کا ایک ایک مصرع شاعر کے غمزدہ دل، سوز و گداز، اضطراب و غم میں ڈوبا ہو نرم و شیریں لہجہ دِلوں کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہے۔

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دِل بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں
میرے مرنے کا سلیقہ میرے جینے کا شعور
میرا ناموس وفا، میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم میرے نغموں کی پکار
میرے شعروں یک سجاوٹ میرے گیتوں کا سنگار

اختر صفیہ کی بیماری اور انتقال پر کچھ معاشی مجبوریوں کے سبب دیر سے لکھنؤ پہنچے اور صفیہ منومٹی تلے جا چکی تھیں۔ اس نظم میں شاعر نے زمین کے سینے کو چیر کر اپنی تمام تر دلی کیفیتوں کو آنسوؤں کا ریشمی پیرہن پہنا کر ایسی مؤثر فضا تیار کی ہے جو سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔

لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خواب جواں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایہ وجاں سونپ چلا ہوں تجھ کو

یہاں جاں نثار اختر کے ایک ایک لفظ سے صداقت و حقیقت بیاں ہے خالص و رومانوی حقیقت اتنی سچائی کی خدیجہ اختر بھی سر بہ سجود دکھائی دیتی ہیں وہ اپنے مضمون ''پرایا مگر اپنا'' میں لکھتی ہیں:

''کوئی عورت اپنے مرد کا کوئی ذہنی رشتہ بھی کسی دوسری عورت سے نہیں چاہتی لیکن آپ مانیں یا نہ مانیں میں نے اختر صاحب کو صفیہ کی شخصیت کے ساتھ چاہا ہے بغیر ان کے ان میں میرے لئے کوئی کشش نہیں۔ ان کے غم میں نڈھال ہونے سے ان میں کتنی خوبصورتی اور کتنی گمبھیرتا بھر گئی ہے اس بات کی نزاکت کو زیادہ لفظوں میں لکھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اور آج بھی ان کو اپنے سے زیادہ ان کا ہی سمجھتی ہوں۔''

جاں نثار اختر کے عشق کی یہ صداقت یہ حقیقت پسند یہ رومانیت شیریں جذبات اُن کی نظموں میں جگہ جگہ رنگ افشانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

عاشق محبوب سے بھی ایسی ہی شدت عقیدت اور حقیقت کا طالب ہے ''خاموش آواز'' اس نظم کا مخاطب خود شاعر ہے۔ یہاں نسوانی لب ولہجہ میں شاعر کی شاعر کی معصومیت اور سادگی اپنے عروج پر ہے۔ یہ نظم جاں نثار اختر نے صفیہ اختر کے انتقال کے ایک سال بعد لکھی۔

کتنے دن میں آئے ہو ساتھی
میرے سوتے بھاگ جگانے
مجھ سے الگ اس ایک برس میں
کیا کیا بیتی تم پہ نہ جانے

دیکھو کتنے تھک سے گئے ہو
کتنی تھکن آنکھوں میں گھلی ہے
او تمہارے واسطے ساتھی
اب بھی میری آغوش کھلی ہے

آؤ میں تم سے روٹھ سی جاؤں
آؤ مجھے تم ہنس کے منالو
مجھ میں سچ مچ جان نہیں ہے
آؤ مجھے ہاتھوں پہ اُٹھالو

کتنا رسیلا پن، معصومیت، شوخی بھری انفرادیت ہے ان اشعار میں لہجہ کا اچھوتا پن لفظوں کا برجستہ استعمال، بیان میں بے پناہ سادگی شاعر کے مشاقی فن بے مثال ہے۔

بہر حال جاں نثار اختر نے شوخ غزلوں سے اپنے سخن کو روانی دی تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر مزدوروں، مفلسوں محنت کشوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کر کے فن کو تعقل اور تفکر عطا کیا۔ مگر جب گھر آنگن میں قدم رکھا تو یہاں ایک نیا اختر نظر آیا۔ تمام شاعری میں رومانی فضا چھائی ہوئی ہے آپ موضوعات کے اعتبار سے ایک رومان پرور شاعر ہیں۔ چاہے اُن کی غزلوں کی بات کریں یا نظموں کی یا پھر رباعیوں کی جگہ جگہ رومانی اور ہندوستانی تہذیب کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ اختر کی شاعری میں اگر ہم گہرے فلسفے کی تلاش کریں تو ملنا مشکل ہے مگر انسانی جذبات واحساسات نازک خواہشات جس طرح انہوں نے شعری پیکر میں ڈھالے ہیں وہ خوب خوب ہیں۔

اور اس طرح اُن کی شاعری کلاسیکیت، رومانیت اور اشتراکیت کا ایک امتزاج بن کر سامنے آئی انہوں نے جن موضوعات کو بھی ہاتھ لگایا اُس میں تہذیبِ زندگی کے ساتھ تہذیب شاعری کا بھی خاص خیال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جمال وجلال کی شاعری ہو یا گھر آنگن کی شاعری ہو سب میں ایک رومان پرور غبار ملتا ہے جو اُن کی شاعری کو پُر اثر اور پُر تاثیر بناتا ہے۔

چہچہاہٹ

جب میں مر جاؤں تو میری قبر پر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھیر دینا۔ میں چڑیوں کی چہچہاہٹ سنا کروں گا تو مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔

فیودور دوستووسکی

چراغِ رخِ زیبا

جمیل عثمان
(امریکہ)

ہم لوگوں کے پیارے نغمی صاحب ملک عدم کو سدھارے۔ شمالی امریکہ کی اردو دنیا اپنے سرپرست سے محروم ہوگئی۔ کتنے لوگ ان سے فیضیاب ہوتے تھے، لکھنے کا ڈھنگ ان سے سیکھتے تھے۔ ان کی محفلوں میں شریک ہوکر اردو سیکھتے تھے، اردو کے فن پاروں سے اقتباسات ان کی زبانی سنتے تھے۔ ان کا ماہانہ پروگرام ان کے ''پیش لفظ'' سے شروع ہوتا تھا جو بذات خود ایک نہایت عمدہ ادب پارہ ہوتا تھا۔ ہر بار وہ ایک نئے موضوع پر گفتگو کرتے۔

نغمی صاحب ہر مہینے اپنے قائم کردہ سوسائٹی آف اردو لٹریچر کے بینر تلے ایک اعلیٰ پائے کا ادبی پروگرام کیا کرتے تھے۔ جو دوپہر ٹھیک ایک بج کر 29 منٹ پر شروع ہوتا تھا۔ اس میں کبھی ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی تھی، چاہے کوئی آئے یا نہ آئے۔ ایک مرتبہ میں ان کے ایک پروگرام میں گیا تھا۔ ایک بج کر 29 منٹ ہوگئے تھے۔ جن صاحب کی صدارت تھی وہ تشریف نہیں لائے تھے۔ یاسمین بھابی نے کہا کہ پانچ منٹ انتظار کر لیتے ہیں۔ تو نغمی صاحب نے کہا، ''پھر میں واک آؤٹ کر جاؤں گا''۔ چنانچہ پروگرام صدر صاحب کے بغیر شروع کر دیا گیا۔ نغمی صاحب نے وقت کی پابندی کی ایک مثال قائم کی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ایک بج کر 29 منٹ سے پہلے ہی ہال لوگوں سے بھر جاتا تھا۔

نغمی صاحب چار کتابوں کے مصنف اور بے شمار مضامین کے خالق تھے: (۱) یہ لاہور ہے، (۲) بتیس برس امریکا میں، (۳) داستان جاری ہے اور (۴) سعادت حسن منٹو پر ذاتی یادداشتوں پر مبنی اوراق۔ ان کی زبان نہایت سادہ اور شستہ تھی۔ پڑھنا شروع کریں تو پڑھتے چلے جائیں۔ ''داستان جاری ہے'' سے ایک چھوٹا سا اقتباس دیکھیے: ''میں جانتا ہوں کہ میری ڈائری دیکھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان بے جان حروف میں دھرا ہی کیا ہے۔ اس خشک اور بے کیف ڈائری کو پڑھ کر کوئی کیا کرے گا۔ آپ کا اعتراض بالکل بجا ہے مگر اس ڈائری کو پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک نوجوان اپنے لئے، اپنے بیوی بچوں کے لئے، اپنے ماں باپ اور اپنے بھائی بہنوں کے لئے کس شدومد سے سرگرم عمل ہے''۔

نغمی صاحب نے بہت سخت دن دیکھے اور بڑی محنت سے اپنا مقام بنایا۔ انتھک محنت کی مگر اصول اور دیانتداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک بار ایک پبلشر نے ان سے کہا کہ بچوں کے لئے اردو قاعدہ لکھیں۔ نغمی صاحب خوشی خوشی لکھ کر لے گئے۔ پبلشر نے دیکھا اور کہا کہ وہ کتاب شایع کر دے گا اور معاوضہ بھی اچھا دے گا مگر ایک شرط پر۔ ''وہ کیا؟'' نغمی صاحب نے پوچھا۔ ''کتاب آپ کے نام سے نہیں چھپے گی''۔ نغمی صاحب غصے سے لال پیلے ہوگئے اور مسودہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ کہا کہ اگر آپ اس کا چار گنا معاوضہ بھی دیں گے تب بھی آپ کو نہیں دوں گا۔ حالانکہ ان دنوں تنگدستی کا شکار تھے مگر اصولوں کا سودا نہیں کیا۔

نغمی صاحب نے بچوں کے لئے بے شمار کتابیں لکھیں اور ترجمے کیے۔ ان میں ایک ناول ''ننھے جاسوس'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ نغمی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ امریکی قانونی دستاویزات کا اردو ترجمہ ہے جس میں Declaration of Independence شامل ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''میں نے ہمیشہ قلم کی روزی کمائی ہے۔''

مجھ پر ان کا خاص کرم تھا۔ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ میں اگر فون نہیں اٹھاتا تھا تو ان کا وائس میل سن کر طبیعت خوش ہوجاتی تھی۔ ''عزیز از جان، جمیل عثمان'' کہہ کر اپنا پیغام ریکارڈ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ''فون سے رابطے میں تین چار دن سے زیادہ دیر مت کیجئے گا''۔ بچوں کے لئے میری تین کتابوں کے نام انہوں نے تجویز کیے: (۱) ''بوجھو تو جانیں''، (۲) ''دادا جان کے زمانے میں'' اور (۳) ''آؤ موتی نکالیں''۔ دو کتابیں تو شایع ہوچکی ہیں۔ تیسری زیر اشاعت ہے۔ اہل بیت اور سانحہ کربلا سے متعلق میرے کئی افسانوں کا مرکزی خیال انہوں نے مجھے دیا کہ میں ان پر افسانے لکھوں۔ میں نے وہ افسانے لکھے اور جب سول کے اجلاس میں انہیں سنایا تو وہ زار زار رو رہے تھے۔ آہ! اب ایسی محبت، ایسی رہنمائی کرنے والا کہاں ملے گا!

صرف دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ''میرے افسانوں کا مجموعہ آنے والا ہے، آپ اس کا نام تجویز کر دیں۔'' انہوں نے کہا کہ آپ پانچ سات افسانے مجھے بھیج دیں۔ میں نے بھیج دیے۔ پڑھنے کے بعد انہوں نے فون کیا اور کہا ''میں نے سارے افسانے بہت دقت نظری سے پڑھے۔ بہت پسند آئے۔ میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر اس وقت لکھ نہیں سکتا۔ اگر آپ کے قریب کاغذ اور قلم ہو تو اٹھا لیجئے، میں املا کراتا ہوں۔'' انہوں نے جو کچھ لکھوایا وہ من وعن حاضر ہے۔ اسے خود ستائشی مت سمجھیے، بلکہ یہ ایک محبی بزرگ کے سچے الفاظ ہیں:

''جمیل صاحب، اردو افسانے پر ایک غنودگی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ کوئی زناٹے دار افسانہ پڑھنے میں نہیں آیا۔ یہ جو آپ کا افسانہ ہے جس میں جلے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے کا تذکرہ ہے، بہت ہی جھنجھوڑ دینے والا افسانہ ہے۔ مجھے آپ ہی کے شہر نیویارک کا افسانہ نگار او ہنری بہت یاد آیا۔ اس بیچارے نے قید کی سزا بھگتی اور اسے اپنا نام بدل کر او ہنری رکھنا پڑ گیا۔ وہ آپ ہی کے شہر کے اخبار نیویارک ٹائمز کے سنڈے ایڈیشن کے لئے افسانے لکھتا تھا اور جو اسے چیک ملتا تھا اس سے ہفتے بھر کا خرچ چلاتا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ ہر روز ایک افسانہ لکھتا تھا جس سے اس کا خرچ چلتا تھا۔ اور یہ جو سگرٹ والا افسانہ آپ نے لکھا ہے اسے پڑھ کر او ہنری بہت یاد آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ آپ بھی چند ایسے افسانے لکھ کر بقائے دوام کے مسند پر جلوہ افروز ہوں۔ اس عہد جمود میں آپ کا دم بہت غنیمت ہے''۔

میرے کانوں میں اب بھی ان کی آواز گونج رہی ہے اور دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

علم و ادب کی محفلیں ویران کر گیا
اک شخص نابغہ تھا، جہاں سے گزر گیا

''رنگ کی گفتگو''

(ہندو شدو پریشد کے صدر جناب آلوک کمار سے خصوصی گفتگو)

ودود ساجد

(ممبئی)

سوال: آپ کو ہندوستانی مسلمانوں سے نفرت کیوں ہے؟

آلوک کمار: ایسی بہت سی مسلم تنظیمیں ہوں گی (تبلیغی جماعت' جماعت اسلامی' جمعیت علماء وغیرہ) جو مسلمانوں کو اچھا مسلمان بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ محض اس وجہ سے انہیں ہندو دشمن قرار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان اور مسلمانوں کیلئے کام کرتی ہیں۔ اسی طرح وشو ہندو پریشد بھی ہندوؤں کیلئے کام کرتی ہے' ہندوؤں کو متحد کرتی ہے' ہندوؤں کو ہندو زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہے' لہٰذا اس وجہ سے یہ کہنا کہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے درست نہیں ہے۔ نفرت کرنا نہ ہماری سوچ میں ہے اور نہ ہمارے رویہ میں ہے۔

سوال: تو پھر وہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً بہت سے ہندو لیڈر دھرم سنسدوں میں مرنے مارنے جیسے منافرت انگیز بیانات دیتے رہتے ہیں؟

جواب: آپ نے اپنے سوال کا دائرہ بڑھا دیا ہے۔۔ آپ نے وشو ہندو پریشد کے علاوہ بھی ہندو لیڈروں اور تنظیموں کا ذکر کیا ہے۔ ممبئی میں تاج ہوٹل پر حملہ ہوا تو اگلے دن بہت سے اخباروں نے اس حملہ کی مذمت کرتے ہوئے ایک طرف جہاں ذمہ داروں کو سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا وہیں یہ بھی کہا کہ اس حملہ کیلئے پوری ایک کمیونٹی کو قصوروار نہیں قرار دیا جانا چاہئے۔ یہ بات درست تھی۔ بنگلور کے کسی شراب خانہ میں کسی غیر معروف ہندو تنظیم کے دو لڑکے بدسلوکی کرتے ہیں تو وہ سارے ہندوؤں پر تھوپ دیا جاتا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔

سوال: کیا دھرم سنسدوں میں دئے گئے دھمکی آمیز اور اشتعال انگیز بیانات آپ تک نہیں پہنچے؟

جواب: میں ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وشو ہندو پریشد نے جو دھرم سنسد بلائی تھی اُس میں جو بیانات دئے گئے تھے اور اس کے علاوہ بھی ہم جو بیانات دیتے ہیں ان میں ہم بہت احتیاط برتتے ہیں۔ ہم اپنی دھرم سنسدوں اور بیانات میں مسلمانوں کے تئیں نفرت کا کوئی احساس تک نہیں آنے دیتے۔ ہمارے دلوں میں ان کیلئے نفرت ہے ہی نہیں۔ میں دوسروں کے تئیں ذمہ دار نہیں ہوں۔ کچھ مسلمان یہ چیلنج دیتے ہیں کہ ۱۵ منٹ کیلئے فوج اور پولیس کو ہٹالو۔ میں اس بیان کو تمام مسلمانوں کے سر نہیں منڈھتا۔ اگر کچھ ہندو لیڈر غیر ذمہ دارانہ بیانات دیتے ہیں تو اسے وشو ہندو پریشد کے سر نہیں منڈھنا چاہئے۔

سوال: لیکن ہندوؤں کی ایک بڑی تنظیم ہونے کے ناطے کیا آپ کو ان کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہئے؟

جواب: میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ اور میں پہل کرتا ہوں کہ 'ہیٹ اسپیچ' جو کوئی بھی دیتا ہے اس کا دھرم پوچھ کر اس کی مذمت نہیں ہونی چاہئے۔ ایسے لوگوں کے خلاف ہم قانونی کارروائی کی تائید کریں گے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسا ہوا نہیں ہے۔ جو لوگ ہیٹ اسپیچ کے خلاف سپریم کورٹ گئے انہوں نے صرف ہندوؤں کی ہیٹ اسپیچ کا ذکر کیا۔ کیا مسلمان لیڈر ہیٹ اسپیچ نہیں دیتے؟ ایک ایسا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ محض ہندو ہی ہیٹ اسپیچ دیتے ہیں۔ اس امتیازی رویہ کو چھوڑ کر ہمیں بھی پہل کرنی چاہئے کہ ہیٹ اسپیچ کوئی بھی دے وہ ناقابل قبول ہے۔

سوال: پچھلے دنوں دھرم سنسدوں میں جو مار کاٹ کی بات کی گئی کیا ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہئے؟

جواب: میں نے کتنی بے باکی سے آپ سے کہا کہ جو کوئی بھی مار کاٹ کی بات کرتا ہے وہ آئین اور قانون کی حدود کو پھلانگتا ہے' اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ ہم اس کی توقع کرتے ہیں کہ حکومت ایسے تمام لوگوں کے خلاف کارروائی کرے گی۔ ہم ہیٹ اسپیچ دینے والوں کی حمایت نہیں کرتے۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ آپ کو مسلمانوں سے نفرت نہیں ہے تو کیا ان سے کوئی شکایت ہے؟

جواب: ہاں' ہمیں شکایت ہے ان سے۔ ہماری اور آپ کی دوستی اسی وقت ہوسکتی ہے جب ہم برابر کی سطح پر ایک دوسرے کا احترام کریں۔ آپ مجھے دشمن نہ مانیں میں آپ کو دشمن نہ مانوں۔ میں آپ کے مذہب کا احترام کروں آپ میرے دھرم کا آدر کریں۔ میں تو آپ کو دوست مانوں اور آپ مجھے کافر مانیں تو دوستی کیسے ہوسکتی ہے۔

جب میں دہلی کا (آر ایس ایس کا) سہ پرانت سنگھ چالک تھا میں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اسلام کا ایک چہرہ بھائی چارے اور امن کا چہرہ ہے۔ جس میں دوسروں کی مدد کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ خود حضرت محمد صاحب (ﷺ) کے بارے میں' میں نے پڑھا کہ ایک عورت روزانہ اپنی چھت سے ان کی بے احترامی کرتی تھی' ایک دن نہیں کی' تو خود اوپر گئے' معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو اس کے علاج کا انتظام کیا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ ایک بستی (طائف) میں گئے اور بستی کے لوگوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ دیودوت (فرشتہ) نے پوچھا کہ میں انہیں تباہ کردوں تو پیغمبر نے کہا نہیں۔ یہ آج نہیں تو کل سمجھیں گے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ دنیا میں آج اسلام کا یہ چہرہ نیچے دب گیا ہے۔ آج جہاد کا چہرہ ابھر رہا ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کبھی امن کا' شانتی کا' بھائی چارے اور دوستی کا چہرہ دوبارہ اسلام میں ظہور پزیر ہوگا تو وہ بھارت سے ہوگا کیونکہ بھارت کی مٹی اس کیلئے سازگار اور عین موافق ہے۔

سوال: آپ جہاد کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟

جواب: اپنے نفس اور باطن کے ساتھ جہاد سے میں متفق ہوں۔ وہ جہاد تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے ان لوگوں سے شکایت ہے جو جہاد کو خارجی عمل مانتے ہیں۔ مجھے اسلام کے اس چہرہ سے شکایت ہے کہ میں دارالحرب کو دارالاسلام بنانے کیلئے حملہ کروں' لوٹ مار مچاؤں' قتل کروں اور لوٹی ہوئی خواتین کو میں خدا کی نعمت تصور کروں' اس چہرہ سے مجھے شکایت ہے' پوری دنیا کو شکایت ہے۔

ہمارے دلوں میں یہ کسک ہے کہ جو لوگ اسلام کے پیغام امن کے داعی ہیں وہ کبھی تو سامنے آ کر تشدد والے چہرہ کے خلاف پوری طاقت سے آواز اٹھائیں۔ بہت سارے مسلمان خونی چہرہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن وہ بولنے کی ہمت نہیں کرتے۔ افغانستان میں طالبان کے ذریعہ خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی سے کیا ہندوستانی مسلمان متفق ہیں؟ کیا مسلمان باہم (مسلکی طور پر) متصادم نہیں ہیں؟ آخر اسلام اپنے تضادات سے کیسے باہر آئے گا' کب دنیا کیلئے ایک مثبت قوت بنے گا؟ آپ ناراض نہ ہوں' آج اسلام کی جو شکل غلبہ حاصل کر چکی ہے وہ دنیا کے امن کیلئے ٹھیک نہیں ہے۔

سوال: آپ کے مطابق اسلام کے دوسرے چہرہ کے پیروکار کیا ہندوستان میں بھی موجود ہیں؟

جواب: جی ہاں وہ بھی یہاں بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ دنیا بھر میں اس چہرہ کو پھیلانے کی فیکٹری بھی بھارت میں ہے۔

سوال: کہاں؟

جواب: میں نے سنا ہے کہ دیوبند (دارالعلوم) سے جس نظریہ کی تشہیر و تبلیغ ہوتی ہے اس میں اسلام کے اس چہرہ کی تشہیر و تبلیغ زیادہ ہوتی ہے۔

سوال: آپ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر رائے قائم کئے بیٹھے ہیں۔ آپ نے لفظ کافر کی شکایت کی۔ میں مذہب اور مذہبی پیشواؤں کا ترجمان نہیں ہوں لیکن کافر کوئی گالی نہیں ہے' یہ لفظ مومن کی ضد ہے' جس کے معنی ایک خدا کا انکار کرنے والے کے ہیں۔ آخر اس لفظ سے ہندوؤں کو کیا نقصان اور کیسی شکایت؟

جواب: میں آپ کی طرح عالم نہیں ہوں۔ تاریخی پس منظر میں لفظ کافر کا کوئی بھی معنی رہا ہو آج تو اس لفظ کا مطلب بدل گیا ہے۔ آج کافر کا مطلب ہے کہ جو مسلمان نہیں ہے' اس کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ کیا جانا چاہئے۔ آپ ذاکر نایک اور انہی کی قبیل کے لوگوں کے خطابات پڑھئے اور سنئے۔ وہ ایسے ہی ہیں جیسا میں نے آپ سے کہا۔

میں مانتا ہوں کہ اصل جہاد اور جہاد اکبر وہی ہے جو اپنے نفس سے کیا جائے۔ اگر صرف ایسا ہی ہو تو کتنا اچھا ہو۔ اگر یہ دب جائے اور جہاد کی دوسری شکل غالب آ جائے تو اسے کیا کہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا ہندوؤں کا کام نہیں ہے۔ یہ کام خود مسلمانوں کو ہی کرنا چاہئے مجھے بعض اوقات پیغمبر اسلام کے واقعات (اور سیرت) پڑھ کر خوشگوار احساس ہوتا ہے۔

آپ کی بیویوں نے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے' کچھ غلام دیدیجئے۔ آپ نے کام بڑھا دیا مگر غلام نہیں دئے اور کہا کہ جو کچھ ہے وہ سب دین کا ہے' میرا نہیں ہے۔ آج سوال یہ ہے کہ کون سا اسلام غالب آ گیا ہے۔ یہ سوچنا تو مسلمانوں کا کام ہے۔۔

سوال: آپ نے دیوبند کو انتہا پسندی پھیلانے کی سب سے بڑی فیکٹری کہہ دیا' کیا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں تھی کہ آپ دیوبند والوں سے بات کرتے کہ آپ کے یہاں جہاد پڑھایا جا رہا ہے' یا اگر دیوبند والے آپ کو بلائیں اور دکھانا چاہیں کہ وہ کیا پڑھاتے ہیں تو کیا آپ وہاں جائیں گے؟

جواب: اگر دیوبند والے یہ کہیں کہ وہ 'وہابی' افکار کی تشہیر نہیں کرتے تو میں ضرور سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ میں کسی ایک تنظیم یا ادارہ کے تعلق سے اپنے خیالات کا اسیر رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر وہ مجھے یقین دلاتے ہیں کہ وہ ایسے افکار کی تبلیغ نہیں کرتے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔۔

سوال: دیوبند' بریلی اور دوسرے مقامات کے بڑے مدارس اور علماء کئی بڑے اجلاس منعقد کر کے دہشت گردی کے خلاف فتاوی جاری کر چکے ہیں' وقتاً فوقتاً کرتے بھی رہتے ہیں' کیا شدت پسند ہندو تنظیموں اور ان کے لیڈروں کے خلاف وشو ہندو پریشد نے بھی کوئی 'دھرم آدیش' جاری کیا؟

جواب: جو پیغام ہم ملک کے مسلمانوں کو دیتے ہیں وہی ہم ملک کے ہندوؤں کو بھی دیتے ہیں۔ یہ ملک ہم سب کا ہے۔ ہم امن قائم رکھنے کیلئے آئین پر عمل کریں گے۔

سوال: کیا واقعی آپ ہندوستان کے آئین کو تسلیم کرتے ہیں؟

جواب: مجھے فخر ہوتا ہے کہ جب تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان نے خود کو اسلامی اسٹیٹ ڈکلیر کیا تو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی نے ہندوستان کو سیکولر ملک ڈکلیر کیا۔ ہم نہ صرف آئین میں بلکہ ملک کے سیکولرزم میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں جو کچھ بول رہا ہوں وہ بہت سے ہندو گروپوں کو پسند نہیں آئے گا۔ میں یہ بات اسٹیج سے بھی بولتا ہوں۔ محمد صاحب کے کنبہ سے تعلق رکھنے والی کچھ اعلی ذاتوں کے مسلمانوں کو چھوڑ کر 85 فیصد پسماندہ مسلمانوں اور ہمارا ڈی این اے تو فی الواقع ایک ہے۔

ہمارے آباواجداد ایک تھے تو کیا ہمیں ملنے جلنے کیلئے کوئی مشترکہ بنیاد نہیں ڈھونڈنی چاہئے۔ مساوات ایک بنیاد ہو سکتی ہے۔ ہمیں آپ گالی کے معنی والا کافر نہ مانیں۔ آپ کا دین آپ کیلئے اور ہمارا دین ہمارے لئے۔ کیا یہ میرا فرض نہیں ہے کہ میں مذہب اسلام کو پڑھوں؟ اگر مجھے کچھ مشکلات ہوں تو ان کا اطمینان بخش جواب ملنا چاہئے۔ جو دفاعی اقدامات محمد صاحب کے دور میں ضروری تھے کیا آج اکیسویں صدی میں ان کی ضرورت ہے۔۔

سوال: لیکن توہین رسالت کرنے والوں کو آپ کیا کہیں گے؟

جواب: میں ایسے تمام بیانات کی مذمت کرتا ہوں لیکن یہ یکطرفہ کیوں؟

ہمارے بھی دیوی دیوتاؤں کی توہین کی جاتی ہے۔کیا مسلم سماج ان کے خلاف بولتا ہے؟ نوپور شرما سے پہلے ہمارے دیوتاؤں کی بھی توہین کی گئی۔کیا مسلمانوں نے اس کی مذمت کی؟ سرتن سے جدا کی دھمکیاں دی گئیں' کیا اس پر مسلمان کچھ بولے۔

کتنا اچھا ہو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی رابطہ بڑھے۔وہی رابطہ جو انگریزوں سے پہلے موجود تھا۔دونوں ایک دوسرے کی ثقافت کا احترام کرتے تھے۔ایک نئی رابطہ کی زبان بھی فروغ پا رہی تھی۔دونوں سلام اور نمسکار یا پرنام کی جگہ آداب کہتے تھے۔انگریزوں کے آنے کے بعد یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہمارے دلوں میں جو خدشات اور سوالات ہیں انہیں چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔اگر کوئی ہمارے ان خدشات اور سوالات کا جواب دینے کو تیار ہو تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔

سوال: کیا خدشات ہیں آپ کے؟

جواب: کوئی مسلم لیڈر آئین سے باہر جا کر بولتا ہے تو اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔اگر مسلمان اس خیال کی تائید کریں تو ہم ملک کی فضا بدل سکتے ہیں۔اسی طرح ہم اس کے بھی حق میں ہیں کہ اگر کوئی ہندو لیڈر بھی آئین کی حدود کے باہر جا کر بولتا ہے تو اس کے خلاف بھی کارروائی ہونی چاہئے۔

سوال: بابری مسجد کے خلاف سب سے زیادہ پرتشدد مہم وشو ہندو پریشد نے ہی چلائی تھی' سپریم کورٹ کے ذریعہ وہ جگہ ہندوؤں کو مل چکی ہے' عبادت گاہوں کے تحفظ کا قانون موجود ہے' اگر آپ کو امن وامان مقصود ہے تو آپ ایودھیا پر ہی کیوں نہیں رک جاتے؟ کیوں اب آپ کاشی اور متھرا کو اٹھا رہے ہیں؟

جواب: ایک وقت تھا جب ہندو لیڈروں نے کہا تھا کہ تین دیدو ہم باقی پر اپنا دعوی اٹھا لیتے ہیں۔وہ بات مانی نہیں گئی۔وشو ہندو پریشد آنے والے سو سال کیلئے ہندو سماج کی ضمانت نہیں لے سکتا۔اس بات کے ثبوت ہیں کہ اورنگزیب کے حکم پر کرشن جنم استھان کا مندر توڑ دیا گیا۔وہاں عیدگاہ بنادی گئی۔وہاں کی مورتیوں کو آگرہ کی بلند یا شاہی مسجد کے باہر کی سیڑھیوں پر لگا دیا گیا تا کہ لوگ وہاں سے ان کی بے احترامی کرتے ہوئے گزریں۔

میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا مسلمان کہیں گے کہ یہ تو مسجد کے باہر کی جگہ ہے' ہم ان مورتیوں کو احترام کے ساتھ ہندوؤں کو واپس دیدیتے ہیں۔کیا مسلمان اس کیلئے تیار ہوں گے۔اعتماد سازی کیلئے کچھ اقدامات ہونے چاہئیں یا نہیں؟

سوال: آپ سینکڑوں سال سے قائم مسجدوں کو لینے پر کیوں آمادہ ہیں؟

جواب: یہ مسجدیں دین اسلام کی اہمیت ثابت کرنے کیلئے تعمیر نہیں کی گئی تھیں۔یہ مسجدیں اس لئے بنائی گئی تھیں تا کہ ہندو سماج کو اپنی شکست مسلسل یاد آتی رہے۔میں متھرا اور کاشی کو مذہبی عمارتیں نہیں مانتا' یہ عمارتیں استعماریت کی علامت ہیں۔مجھے بڑا اطمینان ہوا جب میں نے مدنی جی کا انٹرویو پڑھا۔میں بھول گیا کہ وہ کون سے مدنی تھے۔انہوں نے کہا کہ مسئلہ سلجھانے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ بات چیت کا ہے۔دوسرا عدالت کا ہے۔یہ مجھے اچھا لگا۔

ہم (وی ایچ پی) آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ عدالت جو کہے گی ہم وہ مان لیں گے۔مسلمان بھی یہی کہتے آ رہے ہیں۔ہم نے ان دونوں مقامات کیلئے سڑک پر آندولن نہیں کیا۔آپ نے جس 'ورشپ ایکٹ' کی بات کی وہ بھی زیر بحث ہے۔ہم آئین سے باہر نہیں جائیں گے۔ہم امن کی راہ پر قائم رہیں گے۔

سوال: ٹویٹر پر کئی مسلم نام آپ کو فالو کرتے ہیں' کیا کچھ مسلمان آپ سے اپنے کام کیلئے یا اس لئے ملنے آتے ہیں کہ آیئے نفرت کے اس ماحول کو مل بیٹھ کر ختم کریں؟

جواب: اگر آپ اس کیبن کے شیشے سے پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ابھی بھی بہت سے لوگ (مسلمان) بیٹھے ہیں جو آپ کے جانے کے بعد مجھ سے ملیں گے۔اور یہ صرف دہلی سے ہی نہیں بلکہ ملک کے دوسرے حصوں سے بھی آتے ہیں۔البتہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی اعلیٰ قیادت سے میرا رابطہ نہیں ہے۔یہ رابطہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم دونوں کو کھل کر اپنی اپنی بات کہنے کی چھوٹ ہوگی۔فی الحال وہ چھوٹ یکطرفہ ہے۔

سوال: اگر اعلیٰ مسلم قیادت اور ان کے ادارے آپ کو گفتگو کی دعوت دیں' اور آپ کے سوالوں کے جواب دینے کو تیار ہوں تو کیا آپ اس دعوت کو قبول کریں گے؟

جواب: سوال جواب ہوں یا نہ ہوں محض ساتھ مل کر بیٹھنا بھی بہت سے مسئلوں کو حل کر دیتا ہے۔ہم ایک دوسرے کو قائل کرنے کیلئے بات نہ کریں بلکہ ہم دونوں اپنی اپنی بات کرنے کیلئے ملیں۔اس سے بھی معاملات حل کی طرف بڑھتے ہیں۔بیچ کی یہ دیوار تو ٹوٹنی چاہئے۔

(بصد شکریہ روزنامہ انقلاب، بمبئی)

سرشاری کا احساس

ذہین عورت کے لیے ممکن نہیں ہوتا وہ کمتر ذہین کو دیوتا بنا کر زندگی اس کے حوالے کر دے۔

ذہانت بذات خود سرشاری کا احساس ہے جو اسے تنہا نہیں ہونے دیتا۔

وہ منتخب کرتی ہے نہ منتخب ہونا پسند کرتی ہے۔

وہ ساتھ ساتھ چلنا پسند کرتی ہے۔۔۔

البرٹ کامیو

ایک صدی کا قصّہ

اردشیر ایرانی

دیپک کنول (ممبئی)

پرتھوی راج کپور جب پشاور سے بمبئی آئے تو گیٹ وے آف انڈیا کے پاس اُنہوں نے اپنے رب سے ایک التجا کی۔ وہ التجا شاید یہی ہوگی کہ میں تمہارے بھروسے اس شہر میں چلا آیا ہوں۔ مجھے مایوس مت کرنا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی بھی ابتلا سے گزرنے کے لئے تیار ہوں۔ اپنے رب سے گفتگو کرنے کے بعد اُنہوں نے ایک وکٹوریہ والے سے کہا کہ وہ اُسے کسی ہوٹل میں لے جائے۔ اُس نے اُنہیں میٹرو سینما کے سامنے کشمیر ہوٹل کے پاس چھوڑ دیا۔ اُنہیں پانچ روپے میں ایک کمرہ ملا جہاں اُنہوں نے رات گزاری۔ اُن کے پاس کل پچھتر روپے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ یہ پچھتر روپے زیادہ دنوں تک چلنے والے نہیں اس لئے وہ سنبھل سنبھل کے خرچہ کر رہے تھے۔ اگلی صبح اُنہوں نے ہوٹل کے منیجر سے کہا کہ وہ اُسے کسی اسٹوڈیو کا پتہ بتا دے۔ منیجر نے اُنہیں امپریل اسٹوڈیو کا پتہ بتا دیا۔ لوگوں سے امپریل اسٹوڈیو کا پتہ پوچھتے پوچھتے وہ پیدل ہی کینیڈی پل کو پار کر کے امپریل اسٹوڈیو پہنچ گئے جو کہ رائل اوپیرا ہاوس کے نزدیک ہی تھا۔ اس اسٹوڈیو کا مالک ہندی فلموں کا بانی اردشیر ایرانی تھا جس نے کئی ستاروں کی قسمت سنواری تھی۔

خان بہادر اردشیر ایرانی کی گنتی بالی وڈ کے بانیوں میں ہوتی ہے۔ اردشیر ایرانی پارسی نژاد تھے جن کا جنم 5 دسمبر 1886 کو پونے (مہاراشٹر) میں ایک پارسی خاندان میں ہوا۔ یہ لوگ انیسویں صدی کے آخیر میں مذہبی استحصال سے بچنے کے لئے ایران سے ہجرت کر کے بمبئی چلے آئے تھے۔ انہی لوگوں میں اردشیر ایرانی کے اجداد بھی تھے۔ اردشیر ایرانی نے اپنی ابتدائی تعلیم پونے میں پوری کی۔ بعد میں اُسنے بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں داخلہ لیا۔ وہاں مزید تعلیم پوری کرنے کے بعد اُسنے ایک قلیل عرصے کے لئے پہلے اسکول ٹیچر کی نوکری کی اُسکے بعد مٹی کے تیل کا انسپکٹر بنا۔ اُسے یہ سرکاری نوکری راس نہ آئی اور اُسنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اُسکا باپ موسیقی کے ساز و سامان کا دھندہ کرتا تھا۔ یہاں بھی اُسے چین نہ ملا۔ اصل میں وہ کچھ بڑا کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن اُس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اُس کی چودہ ہزار کی لاٹری نکل آئی۔ چودہ ہزار اُن دنوں بہت بڑی رقم تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ فلمی کاروبار میں اُتر گیا۔ وہ ایک چھوٹا موٹا ڈسٹری بیوٹر بن گیا۔ وہ اپنے ایک دوست عبدولے ایسو فلے کے ساتھ مل کر ٹنٹ لگا کر فلمیں دکھانے لگے۔ اُن دنوں کوئی سینما تھیٹر نہیں ہوا کرتا تھا۔ مراٹھیوں کا روایتی ڈانس لاونی یا کوئی اور تماشہ ایسے ہی سائبان کے نیچے دکھایا جاتا تھا۔ جب اردشیر ایرانی نے سائبان کے نیچے فلمیں دکھانی شروع کیں تو دیگر تفریحی پروگرام اپنی کشش کھو بیٹھے۔ اردشیر ایرانی نے تفریح کے معنی ہی بدل دئے۔

1905 میں ہالی وڈ کے یونیورسل اسٹوڈیو نے ہندوستان میں اسے اپنے اجنٹ کے طور پر چنا۔ وہ ہندوستانی شائقین کو ہالی وڈ کی فلمیں دکھانے لگا۔ اُسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ہندوستان میں فلمی تھیٹر کی بیحد ضرورت ہے۔ 1914 میں اُسنے عبدل علے کی ساجھے داری میں الیکسنڈر سینما کو خرید لیا۔ یہاں سے اُسنے فلم سازی کے ہنر کو سیکھنے کی کوشش کی۔ وہ فلم کے ہر شعبے کی باریکوں کو سمجھنے اور سیکھنے کی سعی میں لگا رہا۔ اُسے اس بات کی آگہی ہو چکی تھی کہ آنے والے دور میں فلم کا کاروبار بہت وسیع اور بہت منافع بخش ہوگا۔ اُسنے ہندوستان سے باہر رہ کر انگریزی، جرمنی، فارسی اور انڈونیشائی زبان میں فلمیں بنائیں جنہیں وہ ہندوستان میں آکر ڈسٹری بیوٹ کرنے لگا۔ وہ دادا صاحب پھالکے کا بہت بڑا مداح تھا۔ دادا صاحب کی فلمیں دیکھ کر ایرانی کے دل میں بھی فلمیں بنانے کی آرزو پیدا ہوگئی۔ 1917 میں اردشیر ایرانی فلم سازی کے میدان میں اُتر گیا اُس نے پہلی خاموش فلم بنائی جس کا نام ''نالہ دیامنتی'' تھا۔ یہ فلم 1920 میں ریلیز ہوئی۔

اسی سال اُس نے اپنی فلم کمپنی اسٹار فلمز لمیٹڈ کی نیو ڈال دی۔ اسی بینر تلے اُس نے پہلی خاتون ہدایت کار فاطمہ بیگم کو پیش کیا۔ اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اُس نے دو اور فلم کمپنیاں شروع کیں جن کا نام ''مجیسٹک فلمز'' اور ''رائل آرٹ سٹوڈیوز'' تھا۔ رائل آرٹ اسٹوڈیو' رومانی فلموں کے لئے مشہور ہوا۔ اُس نے اسی بینر کے تلے ''نہار سنگھ ڈاکو'' بنائی جس میں ایک سخی اور نیک دل ڈاکو کو دکھایا گیا تھا جو ایک منتری اور اُسکی بیوی کی بے ایمانیوں کا پردہ فاش کرتا ہے۔

1922 میں ایرانی بھوگے لال دوبے کے ساتھ جڑ گیا جو کہ دادا صاحب پھالکے کی فلم کمپنی کا سابقہ منیجر تھا۔ ایرانی نے اُسکے ساتھ مل کے ''سٹار فلمز'' کے نام سے اپنی پروڈکشن کمپنی کھولی۔ اُنہوں نے اس بینر کے تلے ''ویر ابھیمنو'' جیسی خاموش فلم بنائی جو کہ اُسی سال ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں فاطمہ بیگم کلیدی رول میں تھیں۔ اس فلم کی عکاسی بھوگے لال دوبے نے کی تھی جو کہ نیویارک سکول آف فوٹو گرافی سے یہ فن سیکھ کے آیا تھا۔ اس فلم کی ہدایت ایرانی نے دی تھی۔ اُنہوں نے ''سٹار فلمز'' کے لئے مل کر تیس کے قریب خاموش فلمیں بنائیں۔

1924 میں اُسنے جس فلم کمپنی کی نیو ڈال دی تھی اُس کا نام ''مجیسٹک فلمز'' رکھا گیا۔ اُنکے ساتھ دو نوجوان باصلاحیت ہدایت کار جڑ گئے جن کا نام بی پی مشرا اور نول گاندھی تھا۔ ایرانی فلمیں پرڈیوس کرتا تھا جن کی ڈائرکشن مشرا اور گاندھی باری باری کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اس بینر کے تحت پندرہ فلمیں بنائیں۔ یہ سب خاموش فلمیں تھیں۔ پندرہ فلمیں بنانے کے بعد ایرانی نے اس فلمساز کمپنی کو بند کرنے کا فیصلہ لیا۔ اُسکے بعد ایرانی نے ''رائل آرٹ اسٹوڈیو'' کے نام سے ایک اور فلم کمپنی کھولی۔ یہ کمپنی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چلی۔ اس بینر کے تحت اُس نے کئی رومانٹک فلمیں بنائیں جو بے حد کامیاب رہیں۔ ''رائل آرٹ'' کی خاص بات یہ تھی کہ اس کمپنی نے نئے کلاکاروں کو کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔

1925 میں اُسنے اپنی نئی فلم کمپنی کی بنیاد رکھی جس کا نام ''امپیریل سینما

''تھا۔1930 کی ایک رات ایرانی نے بمبئی کے ایکسلشر سینما میں یونیورسل فلمز کی ایک انگریزی فلم دیکھی جس کا نام''Show Boat'' تھا۔ یہ فلم چالیس فیصدی متکلم تھی۔ایرانی کے دل میں بھی یہ خواہش بیدار ہوئی کہ کیوں نہ وہ بھی بولتی گاتی فلمیں بنائیں پر یہ کیسے کیا جائے یہ بات وہ نہیں جانتا تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ایرانی نہیں تھا جس نے بولتی فلمیں بنانے کی پہل کی تھی۔ یہ جمجو بھائی جمشید جی بھائی مدن تھا، جو مدن تھیٹرس نام سے اپنی کمپنی کلکتہ میں چلاتا تھا۔ فلمیں اپنے ارتقائی دور میں داخل ہو چکی تھیں ۔ ہندوستان میں ابھی تک خاموش فلمیں ہی بن رہی تھیں جب کہ ہالی وڈ کی فلمیں بولنے لگی تھیں ۔جمشید جی بھائی نیویارک کی سیاحت پر تھا جب ایک دن اُسنے وارنر برادرس کی فلم''Jazz Singer' کی شوٹنگ دیکھی۔وہ اُنکے کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے ملک لوٹنے کے بعد بولتی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔اُسنے ہالی وڈ کا دورہ بھی کیا۔اُن دنوں ہندوستان میں ایسا کوئی تھیٹر نہ تھا جو متکلم فلم چلانے کے ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ یہ جمشید بھائی ہی تھے جنہوں نے ''Elpihistone pictures Palace'' کلکتہ کو اس طرح کے سامان سے آراستہ کیا اور یونیورسل اسٹوڈیو کی پہلی بولتی فلم''Melody of love '' ریلیز کی۔اس فلم کی کامیابی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔سن 1930 کے آخر تک اس طرح کے تیس تھیٹرس ہندوستان میں تیار ہو گئے تھے جو بولتی فلموں کو ریلیز کر سکتے تھے۔

ایک دن اردشیر ایرانی نے ایک انگریزی فلم''"Show Boat'' دیکھی۔وہ اس فلم سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے فلمی تاریخ دان بی ڈی گارگا سے ایک دن کہا کہ اُس نے ایک انگریزی فلم دیکھی ہے۔وہ اس فلم سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ وہ بھی ہندی میں ایسی ہی ایک شاندار فلم بنانا چاہتا ہے۔اس فلم نے اُسے ایک متکلم فلم بنانے کی تحریک دی ہے مگر مسلہ یہ تھا کہ اس طرح کی متکلم فلم کیسے بنائی جائے۔ان کے پاس اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں۔تب ساری فلمیں خاموش ہوا کرتی تھیں۔ایرانی کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ ایک متکلم فلم بنائے۔اس کے لئے وہ لنڈن چلا گیا جہاں اُسنے ساونڈ ریکارڈنگ کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔جب اُسے اس بات کا اطمینان ہوا کہ وہ ہندوستان میں جا کر ایک بولتی فلم بنا سکتا ہے تو وہ ہندوستان لوٹ آیا۔

کام آسان نہ تھا۔بہر حال اُس نے پہلی بولتی فلم''آعالم آرا'' بنانے کا فیصلہ کیا۔محبوب خان نے امپیریل کمپنی میں اس اُمید کے ساتھ قدم رکھا تھا کہ کسی دن ایرانی کی نظر کرم اُس پر پڑے گی اور اُسے چھوٹے موٹے رول کرنے کی بجائے بڑا سا بریک ملے گا۔اردشیر ایرانی ایک عظیم انسان تھا۔ بہت ہی سخی اور وسیع القلب انسان ۔محبوب خان جے پور میں ایک فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ اس فلم کا نام''میواڈ۔نو۔موالی'' تھا۔مزے کی بات یہ تھی کہ اس بار محبوب اپنے مربی مسٹر ٹرونی کی ہدایت میں کام کر رہا تھا۔محبوب کو گھوڑے پر ایک شارٹ دینا تھا۔یہ گھوڑا کوئی معمولی گھوڑا نہ تھا بلکہ یہ جے پور کے مہاراجہ کا شاہی گھوڑا تھا جو بلمورا کے ایک ناچنتہ اور خامکار گھوڑسوار کو اپنی پیٹھ پر بٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔شارٹ یہ تھا کہ محبوب گھوڑے کو مہمیز دے کے کیمرے کی سمت میں دوڑائے گا اور پھر ایک طرف نکل جائے گا۔گھوڑا بڑا اڑیل تھا۔وہ گھوڑسوار کی حرکتوں سے بپھرایا ہوا تھا۔محبوب کے لئے گھوڑے کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔اچانک گھوڑا بدک گیا۔محبوب خان کو جان کے لالے پڑتے نظر آنے لگے اس سے پہلے کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا گھوڑا بدک کر تیر کی طرح نکل گیا اور کیمرہ کو پار کرتے ہوئے محبوب خان کو کہیں دور پھینک کے چلا گیا۔محبوب خان کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔شکر ہے کہ کوئی گہری چوٹ نہ لگی۔

خوش قسمتی سے کیمرے میں یہ پورا سین قید ہو گیا۔جب ہفتہ عشرے کے بعد خان بہادر نے رشز دیکھے تو یہ سین دیکھ کر وہ اُچھل پڑا اور اُس نے محبوب خان کو دیکھ کر پوچھا۔''یہ لونڈا کون ہے'' تو ٹرونی نے فوراً جواب دیا۔''یہ اپنے محبوب سر ہیں'' سیٹھ نے حیران ہو کے پوچھا۔''کون محبوب سر؟'' ٹرونی نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ محبوب کو بلا کر لے آئے۔ایک پل میں حکم کی تعمیل ہوئی۔ جب محبوب کو خان بہادر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اُسے غور سے دیکھنے لگے اور سب سے پہلا سوال جو اُنہوں نے اُس سے پوچھا وہ تھا۔''تمہیں کتنی پگار ملتی ہے؟'' محبوب نے بڑی انکساری سے جواب دیا۔''تیس روپے جناب'' خان بہادر نے اُسی وقت یہ حکم صادر فرمایا کہ آج سے اسکی پگار میں دس روپے کا اضافہ کیا جائے'' پہلی بار محبوب خان کے کام کو اردشیر ایرانی جیسے فلم ساز نے سراہا۔اس ساری کامیابی کا محرک وہ بدمزاج شاہی گھوڑا تھا جس نے محبوب خان کو اللہ کے پاس ہی پہنچا دیا تھا۔محبوب صاحب اللہ کے ساتھ ساتھ اُس گھوڑے کا بھی شکریہ ادا کرنا نہ بھولا جس کے اڑیل پن کی وجہ سے وہ خان بہادر کی نظروں میں آ گئے تھے۔

ایک دن ایرانی نے اشاروں ہی اشاروں میں اُسے یہ عندیہ ظاہر کر دیا کہ وہ اُسے اپنی اگلی فلم میں ہیرو کے رول میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ خبر سن کر محبوب خان پھولے نہیں سمائے۔اُن کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے پروڈکشن کے رسمی اعلان سے پہلے ہی اپنے کپڑے تک سلوائے۔اس سے پہلے کہ اُن کا خواب پورا ہوتا، ایرانی کو اپنے قریبی لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ یہ پہلی فلم ہوگی جو اتنے بڑے پیمانے پر بنائی جا رہی ہے اسلئے اس فلم کے لئے ایک گم نام ایکٹر کو لینے کی بجائے کسی نامور ایکٹر کو لینا زیادہ سود مند رہے گا۔ایرانی کو بھی اپنے خیر خواہوں کے فیصلے پر صاد کرنا پڑا اور اس طرح محبوب خان کہ جگہ اس فلم میں ماسٹر وٹھل کو لیا گیا جو کہ خاموش فلموں کا اسٹار تھا۔جب اُس نے یہ آفر ملی تو اُسنے یہ آفر فوراً لپک لی، یہ سوچے بنا کہ وہ شاردا اسٹوڈیو کا تنخواہ دار ملازم ہے اور اُن کی اجازت کے بنا وہ باہر کی کوئی فلم سائن نہیں کر سکتا۔اُنہوں نے عدالت میں جا کر اُسکے خلاف کیس ٹھونک دیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ ماسٹر وٹھل کے کیس کو لڑنے والا وکیل کوئی اور نہیں بلکہ پاکستان کا بانی محمد علی جناح تھا جس نے یہ کیس جیتا اور اس طرح ماسٹر وٹھل کو''عالم آرا'' میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔محبوب خان قسمت کے اس مذاق سے اتنا دل برداشتہ ہوئے کہ اُسکے بعد اداکاری کرنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی اور ہدایت کار بننے کا فیصلہ کیا۔ پرتھوی راج کپور بھی اردشیر ایرانی کی ہی کھوج میں تھے۔ہوا یوں کہ جب وہ امپیریل اسٹوڈیو پہنچے تو اُنہوں نے چھوٹے موٹے رول کرنے شروع کئے جسے فلمی اصطلاح میں اکسٹرا کہا جاتا ہے۔اُنہیں لگا کہ وہ کبھی کلیدی رول حاصل نہیں کر پائیں گے حالانکہ وہ کافی وجیہہ اور قد آور شخص تھے۔ بہت جلد اُنکی مایوسی ایک حیرت انگیز خوشی میں بدل گئی جب اُنہیں 1929 میں فلم''سینما گرل'' میں لیڈ رول کی

پیشکش کی گئی۔اس فلم کی ہیروئن ایرمیلین تھی جو کہ ہندوستان کی کالرابو کہلائی جاتی تھی۔ یہ فلم 1930 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے ساتھ ہی اُنہوں نے نو خاموش فلموں میں کام کیا۔اسی سال اُنہوں نے اپنی بیوی بچوں کو بمبئی بلالیا۔اُنکی بیگم چوتھی بار اُمید سے تھیں کہ اُنکی زندگی میں ایک ایسی دردگھٹنا گھٹی جو کہ بڑی دلدوز تھی۔اُنکے دو بیٹے ایک ہفتے کے دوران مر گئے۔ایک ڈبل نمونیا کا شکار ہوا اور وہ اس سے نکل نہیں پایا اور اس موذی مرض نے اُسکی جان لے لی۔دوسرے بچے نے غلطی سے چوہے مار دوائی کھالی جس کے سبب اُسکی موت ہوئی۔یہ دوہرا غم تھا جو اس خاندان کو ایک ساتھ بھگتنا پڑا۔ایک طرف اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا تو دوسری طرف خوشی کی نوید آ گئی۔اُنہیں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' میں ویلن کے طور پر کام کرنے کی آفر ملی۔یہ فلم 1931 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی فلموں کی تقدیر ہی بدل گئی۔خاموش فلموں کی جگہ بولتی فلموں نے لے لی۔سینما دیکھنے کا مزہ دوبالا ہو گیا۔لوگ پرچھائیوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑتے تھے۔اس فلم میں ایل وی پرساد کو بھی ایک خاص رول میں پیش کیا گیا تھا۔ایل وی پرساد بعد میں ساؤتھ کی فلموں کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔اس فلم میں وزیر محمد خان کو فقیر کے ایک چھوٹے سے رول میں لیا گیا تھا۔وزیر محمد خان ایک گلوکار تھا جس نے اس فلم میں ایک گانا گایا تھا۔ یہ گانا تھا ''دیدے خدا کے نام پر پیارے'' یہ گانا بے حد مقبول ہوا۔بھکاریوں نے تو اس گانے کو اپنا روزمرہ کا ترانہ بنالیا۔اس فلم میں کل ملا کر چھ گانے تھے جو کہ زبیدہ نے گائے تھے۔

''امپریل اسٹوڈیو'' ریلوے ٹریک کے قریب واقع تھا اس لئے یہاں پر شوٹنگ رات کے ایک بجے شروع ہوتی تھی جو کہ صبح چار بجے تک چلتی تھی۔باہر کے شور سے بچنے کے لئے ٹیکنشنز کو کافی محتاط رہنا پڑتا تھا۔مائیکروفونز کو ادھر اُدھر چھپا کے رکھنا پڑتا تھا۔ساونڈ ریکارڈنگ کا کام سب سے کٹھن تھا۔اُن دنوں ایک خاموش فلم ایک مہینے میں پوری ہوتی تھی۔چونکہ یہ متکلم فلم تھی اسلئے اسے بنانے میں کافی وقت صرف ہوا۔اس فلم میں کام کرنے والے سارے اداکار اتنے خوش تھے کہ اُنہوں نے اپنے معاوضے میں کافی کمی کی اور ایرانی کو چالیس ہزار کے بجٹ میں یہ فلم مکمل کرنے میں بھرپور تعاون دیا۔

14 مارچ 1931 کو جب یہ فلم بمبئی کے مجیسٹک تھیٹر میں ریلیز ہوئی تو باہر کا سماں دیدنی تھا۔سینما ہال کے باہر اتنی پبلک جمع ہو گئی کہ اُنہیں ہٹانے کے لئے پولیس طلب کی گئی۔لوگوں کے جوش اور بے تابی کا یہ عالم تھا کہ چار آنے کی ٹکٹ بلیکروں نے پانچ روپے میں بیچی۔ایرانی نے بازی مار لی تھی۔جمشید جی بھائی جس نے سب سے پہلے بولتی فلم بنانے کی پہل کی تھی وہ پیچھے رہ گیا۔اُسکی فلم ''شیریں فرہاد'' اس فلم کے ریلیز کے چھ ہفتے بعد تھیٹر کی زینت بنی۔ یعنی 30 مئی 1931 کو یہ فلم ریلیز ہوئی۔اس فلم کی ہدایت خود جے جے مدن نے دی تھی۔یہ تیکنکی اعتبار سے ''عالم آرا'' سے بہتر فلم تھی۔اس فلم میں بیالیس کے قریب گانے تھے۔اس فلم نے بھی دھوم مچائی۔

فلم ''عالم آرا'' نے آئندہ بننے والی فلموں کی سمت طے کی تھی۔ یہ ''عالم آرا'' ہی تھی جس میں ہر طرح کا مسالہ بھرا ہوا تھا۔اس میں ڈرامے کے ساتھ بھرپور ناچ گانا تھا۔یہاں سے ہندی فلمیں اور ناچ گانا لازم وملزوم بن کر رہ گئے۔ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ جتنی بھی فلمیں بنیں گی وہ ہندوستانی زبان میں بنائی جائیں گی کیونکہ ناظرین اپنی بھاشا میں فلم دیکھ کر نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو کہانی کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

''عالم آرا'' نے فلم سازی میں بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا۔خاموش فلموں کا زمانہ لد گیا۔متکلم فلموں کے بننے سے بیشتر ہیروئنیں بے کار ہو گئیں۔اسکی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر ہیروئنیں انگلو انڈین نسل سے تھیں جو ہندی بول نہیں پاتی تھیں۔ ان میں سے ایک سلوچنا تھی جس کا اصلی نام روبی میرس تھا۔یہ بھی اردشیر ایرانی کی کھوج تھی۔اُس زمانے میں وہ سب سے زیادہ تنخواہ پانے والی ہیروئن تھی۔وہ ماہانہ پانچ ہزار روپے لیتی تھی۔ساتھ ہی اُسکی سواری کے لئے کمپنی کی طرف سے اُسے شیورلٹ کار دی گئی تھی۔فلموں کے اس بدلاؤ کا اُسکے کیریر پر بھی اثر پڑا۔جو کہ مقامی لڑکیاں تھیں اُنہیں پہلی ترجیح دی گئی کیونکہ وہ ہندی یا اُردو آسانی سے بول سکتی تھیں اور ساتھ ہی وہ گا بھی سکتی تھیں۔سلوچنا نے ہار نہیں مانی۔اُسنے ہندی سیکھنے میں ایک سال لیا۔ایک سال کے بعد اُسنے کئی ہٹ فلمیں دیں۔

اردشیر ایرانی نے ایک نہیں کئی کارنامے کر کے دکھائے۔اُسنے پہلی فارسی فلم ''دخترلر'' بنائی۔اس فلم میں اُسنے ایک مسلم لڑکی کو پیش کیا۔یہ ایران کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب فارسی میں ایک بولتی ہوئی تصویر اُن کے سامنے پیش کی جا رہی تھی۔یہ فلم پہلی جنگ عظیم کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔اس میں ایک جوڑے کو پیش کیا گیا تھا جو ایران میں لاقانونیت سے بچنے کے لئے ہندوستان میں آ کر پناہ لیتا ہے۔اس میں پہلی بار مرکزی کردار میں ایک عورت کو پیش کیا گیا تھا۔ایرانی پریس نے اس فلم کے بارے میں اس قدر تجسس پیدا کیا کہ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اسنے باکس آفس پر تہلکہ مچادیا۔یہ فلم 1933 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم سے ایرانی کلچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔1934 میں اردشیر ایرانی نے ایک انگریزی فلم بنائی جس کا نام ''نور جہاں'' تھا۔وہ نئی نئی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔اُس نے ہندوستان میں فلم تھیٹرس کا جال بچھادیا۔ساتھ ہی اُسنے فلم اسٹوڈیو بھی تعمیر کروائے۔

ایرانی آئے دن نت نئے تجربے کرتا تھا۔فلمسازی کے میدان میں اُس نے پوری طرح سے مہارت حاصل کی تھی۔وہ فلم کے ہر شعبے کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا تھا۔وہ ایک بہترین ہدایت کار تھا۔اُسے فوٹوگرافی پر قدرت حاصل تھی۔اُسنے ایڈیٹنگ بھی سیکھ لی تھی۔وہ ایک اچھا رائٹر تھا۔1934 میں جہاں اُس نے ایک رومانی فلم ''شیریں فرہاد'' بنائی، اسی سال اُس نے ''فردوسی'' نامی فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔1937 میں اُسنے ایک اور کمال کر کے دکھایا۔وہ یہ کہ پہلی کلر فلم ''کرشن کنہیا'' ریلیز کی۔اس کی کہانی اُردو کے مشہور ادیب سعادت حسن منٹو نے لکھی تھی۔اُن دنوں ایک رنگین فلم بنانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔یہ ایرانی کا ہی کرشمہ تھا جس نے ناممکن کو ممکن بنادیا۔جس نے خواب کو سچ کر کے دکھایا۔

اردشیر ایرانی نے فلمسازی میں کئی چیزوں کا اختراع کیا۔ابتدائی دور میں فلموں کی شوٹنگ سورج کی روشنی میں کی جاتی تھی۔موسم کب تک اُن کا ساتھ

دے یہ اُن کی قسمت پر منحصر تھا۔ کبھی کبھی پورے یونٹ کو ہفتوں سورج کی روشنی کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اردشیر ایرانی نے پہلی بار مصنوعی روشنی سے فلم کی شوٹنگ کی۔ پہلی بار ان ڈور شوٹنگ کی شروعات ہوئی۔ یعنی فلمساز مصنوعی لائٹس کو لے کر کسی بنگلے میں آرام سے شوٹنگ کر سکتے تھے۔ یہ کوشش نہ صرف مالی اعتبار سے سستی بلکہ آسان بھی ثابت ہوئی۔ جب سے اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

ایرانی نے اپنے پچیس سالہ کیریئر میں ایک سو اٹھاون فلمیں بنائیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس کی بنائی فلموں کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ وہ صحیح معنوں میں فلمی دنیا کا بابا آدم ہے۔ اُس نے بھی ہر انسان کی طرح کئی خواب دیکھے تھے جن کو اُس نے سچ کر دکھایا۔ اُس نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ اُس نے ناممکن کو ممکن بنایا۔ ایرانی بلاشبہ ہندی فلموں کا بابا آدم تھا جس نے اس انڈسٹری کو نئی سمت اور رفعت دی۔ وہ بلاشبہ ایک ہمہ جہت فن کار تھا جس نے ہندی فلموں کو نئی جہتوں سے ہمکنار کیا۔ دادا صاحب پھالکے نے اگر ہندی فلموں کی نیو ڈالی تھی تو ایرانی نے خاموش فلموں کو زبان دی۔ اُس کے کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 1945 میں اُسنے اپنی آخری فلم ''پجاری'' بنائی اور اُسکے بعد اُسنے فلم سازی کے پیشے سے ہمیشہ کے لئے سنیاس لے لیا۔ دوسری جنگ عظیم چھڑنے کے بعد اُسے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسے تباہ کن حالات میں فلمیں بنانا آسان نہیں اس لئے اُس نے فلمیں بنانی بند کر دیں۔ 14 اکتوبر 1969 کو بیاسی سال کی عمر میں اُسنے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ برٹش حکومت نے اُسے اُسکے کام کے لئے خان بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔ وہ انڈسٹری میں اسی نام سے جانا جاتا تھا۔ جب تک یہ دنیا ہے اردشیر ایرانی کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج ہر سال ہندوستان میں اٹھارہ سو کے قریب فلمیں بنتی ہیں۔ اس انڈسٹری کا بیج اردشیر ایرانی نے بویا تھا جس کی آج ہم فصل کاٹ رہے ہیں۔

فتویٰ

دنیا میں پہلا پرنٹنگ پریس 1428 کو جرمنی میں ایجاد ہوا اور چند دہائیوں کے اندر اندر یورپی ممالک نے اس کے ذریعے لاکھوں کتابیں چھاپ کر سائنس اور فنی علوم میں دن دگنی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ یورپ کے ان ممالک سے عین متصل خلافت عثمانیہ کے زیر اثر ممالک تھے جن میں بلغاریہ، یونان، ہنگری، رومانیہ جیسے ممالک بھی شامل تھے جو آج یورپ کا حصہ ہیں۔ خلافت عثمانیہ کا دارالخلافہ ترکی میں تھا اور عرب ممالک سمیت شمالی افریقہ بھی اس کے زیر اثر تھا۔ ترکی میں رہائش پزیر یہودی اور عیسائیوں نے جرمنی اور فرانس کو دیکھ کر ترکی میں اپنا پہلا پرنٹنگ پریس 1493 میں شروع کیا۔ اس سے قبل ترکی میں کتابوں کی اشاعت ہاتھ سے لکھی گئی تحریروں کے ذریعے ہوتی تھی۔ زیادہ تر کتابیں عربی، ترکی اور فارسی زبان میں لکھی جاتی تھیں اور ان کی اکثریت مذہبی کتابوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مذہبی کتابیں، خاص کر عربی میں لکھی گئی کتابوں کو تحریر کرنے والے خطاط زیادہ تر مذہبی طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اس وقت کے علما خود یا ان کے قریبی رشتے داروں کے پاس خطاطی کا کام ہوتا تھا۔

جب یہودیوں نے خلافت عثمانیہ کے اندر 1493 میں پہلا پرنٹنگ پریس لانچ کیا تو ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ فوری طور پر علما نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے اس سارے عمل کو شیطانی قرار دے دیا۔ علما کا مؤقف تھا کہ پرنٹنگ ٹیکنالوجی غیر مسلموں کی ایجاد ہے اور اسلام ہمیں ہر ایسے کام سے منع کرتا ہے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان علما کا یہ بھی کہنا تھا پرنٹنگ پریس کے ذریعے چھاپی جانے والی کتب میں بہت سے غلطیاں ہو سکتی ہیں اور اگر قرآن غلط چھپ گیا تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ چنانچہ ترکی کے شیخ الاسلام نے فتوی جاری کیا کہ پرنٹنگ پریس ٹیکنالوجی اسلام میں حرام ہے اور اگر کسی مسلمان نے اسے استعمال کیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس فتوے کے بنیاد پر اس وقت کے خلیفہ نے پرنٹنگ پریس پر پابندی عائد کر دی اور صرف غیر مسلموں کو اس شرط پر محدود پیمانے پر اجازت ملی کہ وہ نہ تو کوئی مسلمانوں کی مذہبی کتاب شائع کریں گے اور نہ ہی عربی، فارسی اور ترکی زبان کی کوئی دوسری کتاب شائع کی جائے گی۔ یہ پابندی 1729 تک رہی یعنی تقریباً تین سو سال تک باقی دنیا پرنٹنگ پریس کے ذریعے علم کو وسیع کرتی گئی جبکہ مسلمان ممالک اس ٹیکنالوجی کو حرام قرار دے کر علم کے دروازے بند کئے بیٹھے رہے۔

یہی وہ دور تھا جب یورپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ریسرچ شروع کی، لائبریریاں بنائی گئیں اور ان میں لاکھوں کتابیں پریس سے چھاپ کر عام لوگوں کیلئے رکھ دی گئیں۔ یورپ کے لوگ علم حاصل کرتے رہے جبکہ مسلمان پرنٹر کو شیطانی چھاپہ خانہ قرار دے کر اس سے منہ موڑے بیٹھے رہے۔ بعد میں تحقیق ہوئی تو پتہ چلا کہ 1493 میں جس شیخ الاسلام نے پرنٹر کے خلاف فتوی جاری کیا تھا، اس کا داماد ترکی کا ایک مشہور کیلی گرافر تھا اور استنبول، انقرہ سمیت ترکی کے کئی شہروں میں سرکاری طور پر شائع ہونے والی کتابوں کا ٹھیکہ اسے ہی ملتا تھا۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

سال رواں کی پہلی صبح کا آغاز ''چہارسوٗ'' کی تازہ اشاعت سے ہوا! راقم اس ادبی جریدے کا ''کہنہ قاری'' ہے کہ جب سید ضمیر جعفری (مرحوم) کی سرپرستی میں اس سلسلے کی ابتدا ہوئی تھی تو نئے پرچے کے انتظار کا واقعہ اسی وقت جنم لے چکا تھا۔ اسے عجیب سا اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ آپ سے خط کتابت/ لاسلکی رابطہ ایک زمانے سے ہے لیکن تا حال بالمشافہہ ملاقات نہ ہوسکی! البتہ آپ کے افسانے اور دیگر تحریریں اس تواتر کے ساتھ پڑھیں کہ کبھی شخصی دوری کا احساس نہ ہوا۔

''چہارسوٗ'' حسن ادارت کی شرط کو نبھاتے ہوئے اس بار بھی اپنے مصنفین کے ساتھ خوب مزین ہے! بھرپور ادبی مجلّہ ہونے کا تاثر اس مرتبہ بھی ان اوراق کا ہالہ بنا ہوا ہے۔ جب آپ نے اپنے رسالے کو کاغذ کی کثافت سے اٹھا کر آن لائن لطافت کے سپرد کرنا چاہا تھا تو سچی بات ہے ایک خوانندہ کے طور پر میرے ذہنی تحفظات خود کلامی میں مصروف ہو گئے تھے۔ شاید 'خوگر پیکر محسوس' ہونے کا قضیہ اس کا اساسی سبب بن رہا تھا۔ تاہم میرا گمان تھا کہ یوں ''چہارسوٗ'' کی ریڈرشپ کو زک پہنچے گی۔ بعد کی صورت حال نے اس خیال کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جس کی سب سے بڑی دلیل ''رس رابطے'' کا جزو ہے۔ کسی بھی رسالے کا سب سے زندہ زمرہ قارئین کے بے ساختہ ریسپانس پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ جسے مدیر کے نام خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہاں! ''چہارسوٗ'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ فروغ فساد میں حصہ دار نہیں بنتا وگرنہ اپنے تاثرات کے عنوان سے کچھ لوگ فضا کو مسموم کر دیتے ہیں، یوں نفرتیں بڑھتی ہیں۔ کدورتوں کو فاصلے پہ رکھنا لا ریب ایک نیکی ہے۔ اس کارِ خیر کو آپ کی تہذیب یافتہ شخصیت نے نشو ونما دی ہے۔

''چہارسوٗ'' کے اس شمارے کی خواندگی ابھی جاری ہے۔ اس دوران میں جناب نسیم سحر کی حمد اور نعت ایسے پاکیزہ کلام سے مربوط ہونا نصیب ہوا ہے۔ رینو بہل کے افسانے ''جبین نیاز'' سے پلکوں کو بھگویا جا چکا ہے! جسے افسانہ نگار نے تانیثیت کے روایتی جدل سے علاحدہ ہو کر تخلیق کیا ہے۔ ایک عورت کا ایثار جیسے یہاں متکلم ہوا ہے وہ قاری کو حصار میں لینے والا ہے۔ مدیحہ رحمٰن صاحبہ نے ''خیالِ یار'' میں فرد کی تنہائی کے ترجمان المیے کو نیا رخ دیا ہے، جسے عورت کی مناسبت سے دیکھنا اور بھی بامعنی بنا دیتا ہے۔ محترمہ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی مصری نژاد ہونے کے باوصف اردو ادب کی پیش کار ممتاز رائیٹر ہیں ''گپ شپ'' میں موج زن ان کی شگفتہ گوئی پیہم مسرور کرتی رہی! اور اس کے پہلو بہ پہلو دانش کے رقبے کو بھی وسیع کرتی رہی۔ مکرم تابش خانزادہ کی تحریر ''وعدہ معاف'' تو اس شمارے کا crux ٹھیرا! جس ایمائیت کے ساتھ انھوں نے سیاسی صورت حال کو شوخ مدار میں اسیر کر دیا ہے، اس کا لطف تا دیر ہمسفر رہے گا!

محترم آغا گل، جناب حمید قیصر سمیت اہم لکھنے والوں کی روشن نگارشات تو آئینہء ابصار کے ذمے قرض کے برابر ہیں، جنھیں پڑھنا بطور قاری واقعی میری ضرورت ہے۔ قرات کے عمل سے لازماً گزاروں گا۔۔۔ ان شاءاللہ!

''قرطاس اعزاز'' کے تعلق میں قلبی جذبے کا بیان تو گلزار جاوید صاحب! ایک سپنے کو تعبیر ملنے والے کی نشاط شبدوں کو ناکافی سمجھتی ہے! لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ ادب وعلم ساحلوں سے بے نیاز سمندر کی مثال ہوئے! ایسے میں اپنی بے مائیگی کا احساس جس شدت کے ساتھ میرا محاصرہ کرتا ہے، اسے لکھ نہیں سکتا! آپ نے ایک عاجز طالب علم کی جس طرح حوصلہ افزائی کی ہے وہ سرشار کر دینے والی ہے! سو، اس محبت اور التفات پر دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں!!

جمیل احمد عدیل (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا ہر شمارہ آپ کی محبت چاہت اور محنت کا کھلا ترجمان ہوتا ہے۔ اس بار آپ نے نوجوان ادیب جمیل احمد عدیل صاحب کو بڑے دلکش انداز میں متعارف کرایا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک اچھی کوشش ہے اور اسے آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ عدیل صاحب کے علاوہ چہارسو کے تازہ شمارے میں رینو جی کی ''جبینِ نیاز'' اور آغا گل کی ''زمین گول ہے'' اچھی تخلیقات ہیں۔ ریاض بھائی، نسیم سحر، نوید سروش، رعنا کوثر اور دوسرے لکھاری ہر شمارے میں اپنا اپنا کردار بخوبی نبھاتے ہیں۔ اس بار شمارے میں مجھے فیروز بھائی کی کمی بڑی شدّت سے محسوس ہوئی۔

میرے خیال میں پیرزادہ جی کو چہارسو کی عدالت میں حاضر کر کے پوچھا جائے کہ وہ کہاں کہاں سے ایسی نایاب باتیں چُن چُن ہمیں حیران کرتے ہیں اور ہمیں جس تسلسل سے واقعات بتاتے جاتے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔

دیپک جی بھی بالی وڈ سے کمال کی معلومات لے کر ہر بار چہارسو کی محفل میں حاضری دیتے ہیں۔

لبنانی مفکر، فلسفی اور عظیم لکھاری جس نے، ٹوٹے ہوئے پر، اور پیغمبر جیسی کتابیں لکھ کر بیسوی صدی کے نصف میں دنیا میں نام کمایا تھا اور اس کی کتابوں کے تراجم دنیا کی ہر بولے جانے والی زبان میں کئے گئے تھے۔ دکھ کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اس کی کتابوں کے جتنے تراجم پاکستان میں پچھلے اسّی سال سے اردو زبان میں شائع ہوئے تھے اُن میں اُسے خلیل جبران کے نام سے موسوم کرایا

جا تا رہا تھا جبکہ اُس کا صحیح نام کہلیل جبران (Kahlil Gibran) تھا۔

ابھی تک اہلِ اردو جب بھی کوئی اکتساب اُس عظیم فلسفی سے منسوب کرتے ہیں، بے چارے کا نام بگاڑ کر لکھتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارا نام بگاڑ کر لکھے تو ہمیں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے اہلِ اردو کی اس عام غلطی کی نشان دہی کی تحریک اس بار کے چہارسو کے صفحہ ۸۷ کے فلر کو دیکھ کر ہوئی جہاں اسے خلیل جبران لکھا گیا ہے۔ میں چہارسو کی وساطت سے دنیائے اردو کے پڑھنے، لکھنے، بولنے اور تراجم کرنے والوں کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ اس مفکر پر رحم کریں اور اس کا نام صحت کے ساتھ لکھیں۔

تابش خانزادہ (لاس اینجلس)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

جمیل عدیل کا مارچ، اپریل ۲۰۲۳ء کا شمارہ نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ کا رسالہ وقت سے پہلے منظرِ عام پر آ جاتا ہے جب کہ عموماً رسالے تاخیر سے آتے ہیں۔ آپ کے جذبے کو سلام۔

۲۰۲۲ء جاتے جاتے ایک زخم اور دے گیا۔ سوچا نہیں تھا کہ شموئل احمد صاحب اتنی جلدی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ ان کی ادبی خدمت ان کو ادب کی دنیا میں زندہ رکھے گی۔ اُن کا اندازِ بیاں، اُن کی تحریریں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بولڈ بھی ہوتی تھیں۔ اُن میں نظام اور معاشرے میں پنپ رہی برائی کے خلاف کھل کر آواز اٹھانے کی ہمت بھی تھی۔ ''لنگی'' نے خوب تہلکہ مچایا اور شاید اُن کا آخری افسانہ ''پروفیسر کا حرم'' بھی اچھی مثال ہے۔ پرماتما اُن کی آتما کو شانتی دے۔

پروفیسر جمیل عدیل کی ادبی سرگرمیوں کی پوری تفصیل اور اُن کی شخصیت کا خاکہ مکمل گوشہ پڑھ کر اُبھر کر سامنے آ گیا ہے۔ براہِ راست کے نئے نئے دلچسپ سوالات اور جمیل صاحب کے مناسب جوابات نے انٹرویو کو دلچسپ بنا دیا۔ ''قبر والا گھر'' کا موضوع انوکھا اور میرے لیے نیا تھا۔ افسانہ خوبصورتی سے بُنا ہے اور دلچسپ ہے۔ نثری نظمیں بھی قابل داد ہیں۔ جمیل صاحب اور مدیر کو کامیاب گوشہ کے لیے مبارکباد۔

شمارے میں شامل سبھی افسانے دلچسپ ہیں۔ آغا گل صاحب کا افسانہ ''زمین گول ہے'' لاجواب افسانہ ہے۔ ''نادر تحفہ'' آج کے معاشرے میں لڑکیوں پر تیزاب پھینکے جانے کی المیہ کی اچھی کہانی ہے۔ ''مراجعت'' کھوئی ہوئی محبت کا اچانک مل جانا اور خیالِ یار نفسیاتی الجھن میں گری لڑکی کا قرب دکھاتا ہے تو ''وعدہ معاف'' علامتی کہانی میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ''احساس کے خوفناک سائے'' زندگی کے ختم ہونے کے احساس کی اچھی کہانی ہے۔

شاعری کا حصہ لاجواب۔ ساغر صدیقی کی غزل نے پکڑ لیا۔

عطاء الحق قاسمی کے ''فقط ایک آنسو'' یونس جاوید کی کتاب کے متعلق ضرور ہے مگر زیادہ بیان انہوں نے اپنے دلچسپ قصہ کا کیا ہے۔ ''میرے پاپا'' ڈاکٹر ہما عالم کا اپنے والد کی یاد میں لکھا دل کو چھو جانے والا مضمون ہے۔

نظم کا حصہ بھی کمال ہے خاص طور سے اقبال کا دیس ہاشمی صاحب کی نظم لاجواب ہے۔

''خاکِ شفا'' کا نیا باب اس بار بھی نئی نئی معلومات لے کر آیا ہے۔ اس بار اُس دَور کی بیماریوں کے جو نام بتائے ہیں وہ کمال ہے۔ شاعری کا انتخاب بھی قابل داد ہے خاص طور سے یہ نعت:

نہ کہیں سے دُور ہیں منزلیں نہ کوئی قریب کی بات ہے
جسے چاہا اُس کو نواز دے یہ درِ حبیب کی بات ہے

ہومیو پیتھک کا علاج کس نے کیا اور کب ہوا، یہ پڑھ کر معلومات میں خاص اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی Adaman Nicobar Icelands یعنی کالے پانی کے متعلق جانکاری بہت اہم ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے نئی معلومات اور چنیدہ خوبصورت شاعری کو شامل کر کے ناول کو معیاری بھی اور دلچسپ بھی بنا دیا ہے۔ ہر باب کے بعد اشتیاق بڑھ جاتا ہے کہ آئندہ قسط میں کیا پڑھنے کو ملے گا۔

اس مرتبہ رسالے میں دو خامیاں محسوس ہوئیں۔ ایک تو فلر صرف ایک تھا (جو ہمیشہ سے میری دلچسپی کا مرکز رہا ہے) دوسرا عالمی ادب کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ پڑھنے کو نہیں ملا۔ حیرت کی بات ہے ظفر قریشی صاحب کی تازہ عالمی کہانیوں کی کتاب منظر عام پر آ گئی اور پورے ایک صفحے پر تفصیل بھی دے ڈالی مگر افسانہ شامل نہیں کیا۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

گلزار جاوید جی۔ سلام محبت۔

تازہ شمارہ اپنی خوبصورتیوں میں جمیل احمد عدیل کی تصویری اور تخلیقی خوبصورتیاں ملا کر دوآتشہ جام کی صورت موصول ہوا، اس مرتبہ جمیل احمد عدیل اور گلزار جاوید کے درمیان ''براہِ راست'' مقابلہ غضب کا تھا جس میں دونوں پہلوان فتح یاب ہوئے۔ جیسے جیسے سوال آپ نے اس نابغۂ عصر سے کئے اپنی جگہ ان کا بھی جواب نہیں اور جمیل احمد عدیل نے لفظوں کے پیراہن میں جو آراستہ و پیراستہ جواب دیئے وہ بھی لاجواب تھے۔ کہیں کہیں ان کے جوابات میں جھلکیں سی محسوس ہوئیں کہ ان کی نثر نثرِ مقفّیٰ کے رنگ میں ڈھل ڈھل جاتی تھی، مگر اس کی بھی داد اِس لئے کہ ہمارے اکثر قلمکار تو ''اردوئے معلّیٰ'' کو سلاست کے نام پر ''اردوئے محلّہ'' بنانے میں مصروف ہیں چنانچہ جمیل احمد عدیل کی اس اردو نے مجھے اردو کے کلاسیکی آہنگ کی سرشاری سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کا آپ کے ساتھ یہ 'مسابقہ' تا دیر یاد رہنے والا ہے اور میں نے ''براہِ راست'' کو ڈاؤن لوڈ اور پرنٹ کر کے اپنے اس شیلف میں محفوظ کر لیا ہے جہاں دیمک کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ میں اس بات پر بھی اظہارِ مسرّت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اتنے ہمہ جہتی تخلیق کار کی ایک کتاب ''اردو افسانہ: نقشِ تنقید'' کے بارے میں میرا ایک مختصر سا مضمون شامل ہے اگرچہ

میرے تئیں اس کی وہی حیثیت ہے کہ گومشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں:
مجنوں میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں۔

اس شمارے میں کافی عرصے کے بعد برادرم حمید قیصر کا افسانہ بھی پڑھا جس کا عنوان 'مراجعت' ہے اس لیے اسی مناسبت سے ان کی مراجعت کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔ بڑا دلچسپ افسانہ ہے۔ اور اس کے اختتامی الفاظ کی معنی خیزی نے گویا مجھے بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ جناب تابش خانزادہ گذشتہ کچھ عرصے سے مختصر افسانے لکھ رہے ہیں اس شمارے میں ان کا افسانہ ''وعدہ معاف'' ایک جنگل کی بادشاہت میں شیر اور لومڑی کی داستان ہے جس میں بوڑھے شیر کی جگہ نوجوان شیر اپنی بادشاہت قائم کرتا ہے مگر چالاک لومڑی اس کی کچھار کی طرف جاتے ہوئے سوچتی ہے کہ آخر اسے بھی تو جانے والے شیر کی حکومت کے خلاف وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ جنگل کی یہ کہانی ہمارے اپنے سیاسی حالات کی خوب ترجمانی کرتی ہے، اور پڑھنے والا پرانے اور نئے شیر کی علامتوں میں ہمارے ابن الوقت سیاستدانوں اور جھوٹی گواہیوں کے ساتھ ساتھ اقتدار کے سبھی حلقوں کو آسانی سے شناخت کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ کیا کیا حربے استعمال کر کے اور کن کن مقتدر اداروں کی ملی بھگت سے جعلی انقلاب پسند پرانے شیر کی حکومت بحال کرنے کی سازشی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اس شمارے میں شامل شاعری میں سے چند منتخب اشعار جن پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا:

سانسیں ہیں تو سانسوں کا تحفظ بھی ہے لازم
گھر آئے ہوئے ڈھال کو پھینک آؤ گے؟ نہ نہ

ولی عالم شاہین

گردشِ چرخ بھی پیچھے کو نہیں پھر سکتی
وقتِ معلوم اگر آگے نہیں ہو سکتا

خالد اقبال یاسر

کبھی روٹھے رہے دنیا سے بہت دیر تلک
کبھی دنیا کو منانے میں بہت دیر لگی

اشرف جاوید

تم کو جب پیار سے دیکھا تو پھر ایسا بھی ہوا
اپنے یاروں کا رویّہ بھی رقیبانہ لگا

ڈاکٹر ریاض احمد

جسے ہوا کے مخالف اڑان بھرنی ہو
وہ پنچھی اڑتے ہوئے پَر کہاں سنبھالتا ہے

احمد رضا راجا

دو ٹکوں پر خریدنے سے یہاں
بند ہوتے ہیں منہ گواہوں کے

امیر حمزہ سلفی

نظمیں اگر اچھی بھی لگیں تو ان کا اقتباس دینا ذرا مشکل ہوتا ہے کہ قاری اس اقتباس کے سیاق وسباق سے آگاہ نہیں ہوتا، البتہ برادرم نوید سروش کی نظم ''اثاثہ'' کی یہ تین لائنیں سیاق وسباق کے بغیر بھی قاری پر اپنا ابلاغ کر رہی ہیں:

صرف میرے پاس تنہائی تھی
آج وہ بھی
تمہیں اماناً سونپے جا رہا ہوں۔

قسط وار ناول ''خاکِ شفا'' کا ذکر کئی خطوں میں دیکھ کر خیال آیا کہ میں نے تو اس کی پہلی قسط بھی نہیں پڑھی تھی اس لیے باقی قسطیں بھی نظر انداز کرتا رہا، ایک تجسّس کے ساتھ میں نے اس کی اب تک کی تمام قسطیں پرنٹ کر لیں اور جب پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا تو بار بار احساس ہوتا رہا کہ:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

پیرزادہ آلِ انوار کے نام سے یہ ناول آپ شائع کرتے رہیں برادرم گلزار جاوید، مگر میں پر لطف اندازِ بیاں اور مخصوص لفظیات و تراکیب کے پل بر کھڑے تک پہنچ گیا ہوں، کہیں تو اس کے اصل مصنف کا نام بتا دوں، مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ پر بھی 'آفیشل سیکریٹس ایکٹ' لاگو نہ ہو جائے، اس لیے فی الحال خاموشی اختیار کرتا ہوں، عاقل را اشارہ کافی است۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ پروفیسر جمیل احمد عدیل سے موسوم ہے جن کی متنوع موضوعات پر تیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریروں کے دلچسپ اور منفرد اسلوب کے باعث قاری انہیں پڑھتے پڑھتے جلد ہی مصنف کو پہچان لیتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا حوالہ ان کی افسانہ نگاری ہے مگر تنقید و تحقیق کی دنیا میں بھی وہ اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ قارئین ''چہارسو'' کو ان کی شاندار ادبی خدمات سے متعارف کرنے پر آپ تحسین کے لائق ہیں۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور عمدہ شاعری بھی شامل کی گئی ہے۔

''خاکِ شفا'' کی دسویں قسط انتہائی دلچسپ، معلوماتی اور حیران کن تفصیلات پر مشتمل ہے۔ برطانوی دورِ حکومت کے واقعات خصوصاً کالا پانی جو جزائر انڈیمان کا دوسرا نام تھا وہاں کے عقوبت خانوں میں ہندو مسلم قیدیوں کی حالت زار کی تفصیلات، بے شمار بیماریوں کے ہندی/ اردو نام جیسے باری کا بخار (ملیریا)، میعادی بخار (ٹائیفائیڈ) وغیرہ کے علاوہ شاہ صاحب کے روحانی اور علمی ارتقا کی دلچسپ تفصیلات شامل کی گئی ہیں جو قارئین کے لیے باعث دلچسپی اور حیرت ہیں۔

''جبینِ نیاز'' رینو بہل نے ایک عمدہ افسانہ تحریر کیا ہے جو سبق آموز

بھی ہے۔کہانی میں ازدواجی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا خوش اسلوبی سے سامنا کرنا اور رشتوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے شدید جذباتی دباؤ کے باوجود عورت کا ایثار اور قربانی کا رویہ اختیار کرنے کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔روزمرہ کی زندگی میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

''وعدہ معاف گواہ'' کے عنوان سے تابش خانزادہ نے دلچسپ طنزیہ اور تمثیلی انداز میں مختصر اور عمدہ تحریر رقم کی ہے جو ہمارے معاشرہ کے موجودہ سیاسی اور سماجی رویوں کا عکاس ہے۔ضمیر فروش اور بے اصول لوگ ذاتی مفاد کی خاطر ہر نئے حکمران کی قربت حاصل کرنے کے لیے بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنی وفا داریاں بدل لینے میں دیر نہیں لگاتے اور خوشامد میں ایک دوسرے سے سبقت لینے میں کوشاں رہتے ہیں۔

''نادر تحفہ'' ارم نعیم نے اپنے افسانہ میں افسوسناک صورتِ حال کا تذکرہ کیا ہے جب ایک گھر میں دو نوجوان بہنیں عجیب نفسیاتی کیفیت کا شکار ہو گئیں۔بڑی بہن کے لیے جب کوئی رشتہ آتا تو چھوٹی بہن جو زیادہ خوبصورت تھی اسے دیکھ کر ارادہ بدل دیتا اور چھوٹی بہن کو Propose کر دیتا۔اس طرح بڑی بہن شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئی اور چھوٹی بہن کو محسوس ہوا اس صورت حال کی وجہ میں ہوں۔اس ذہنی دباؤ کی کیفیت میں چھوٹی بہن نے اس کا یہ افسوسناک حل ڈھونڈا کہ ایک روز اپنے چہرے پر تیزاب ڈال دیا جس کے نتیجہ میں اس کا چہرہ بری طرح جھلس گیا اور یوں اُس نے بڑی بہن کی خاطر یہ ''نادر تحفہ'' دیتے ہوئے صورتِ حال کو پلٹ دیا۔

''احساس کے خوفناک سائے'' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ رفتہ رفتہ بدلتی ہوئی جسمانی اور گردو پیش کے بدلتے ہوئے حالات کا منظر نامہ ہے جو دل اداس کر دیتا ہے کیونکہ یہی صورتِ حال ہر انسان کو ایک دن پیش آتی ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

شمارہ میں اچھی شاعری شامل ہے جس میں ساغر صدیقی، اشرف جاوید، جمیل عثمان، نبیل احمد نبیل، طارق نعیم، مظفر رزمی، حنا رضوی حیدر، امیر السلام ہاشمی، رضیہ اسماعیل، حافظ محمد احمد کا کلام متاثر کن ہے۔مظفر رزمی کا یہ شعر بار بار زبان پر آتا رہا:

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ یہ تمام عمدہ ادبی مواد خوبصورت ترتیب کے ساتھ قارئینِ چہارسو کی نذر کیا۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا شمارہ مارچ اپریل ۲۰۲۳ء پڑھ کر لطف آ گیا۔تقریباً پورا شمارہ پڑھا مگر والدہ کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے کافی کچھ ذہن سے نکل گیا۔ سب سے پہلے ناول ''خاکِ شفا'' کا ذکر ہو جائے جو میرا خیال ہے ایک منفرد ناول بنتا جا رہا ہے۔ہر دفعہ یہ ناول پڑھ کر تاریخ کے مکمل مناظر آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔چاہے وہ میوات کے لوگوں کا ہو یا کالا پانی جیل کا منظر۔ ہمیشہ جو باتیں سنتے آئے تھے اس کی تمام تفصیل سمجھ میں آ گئی جیسے آفریدی نے لارڈ کو کیوں مارا۔کالا پانی کیا تھا وغیرہ۔امرت دھارا کی حقیقت بھی سمجھ آ گئی وہ کیا ہے۔ہمارے ماموں کے پاس یہ ضرور ہوتا تھا اور ہر شکایت پر وہ یہ نکال کر لے آتے تھے اور بچوں کو پلاتے تھے۔اتنے دلچسپ طریقے سے ناول آگے بڑھ رہا ہے بہت خوب۔

افسانوں کو ناول کے بعد پڑھنا ضروری ہوتا ہے سب ہی افسانے پڑھے مگر کچھ پر تبصرہ کر پاؤں گی۔مدیحہ رحمٰن کا خیالِ یار ایک نفسیاتی لڑکی کی کہانی پسند آئی۔جمیل احمد عدیل کا ''قبر والا گھر'' بہترین افسانہ۔''زمین گول ہے'' آغا گل کا افسانہ ٹھیک تھا۔رینو بہل کا ''جبینِ نیاز'' بہت اچھا افسانہ تھا۔جمیل عثمان کا مضمون ''خوشبوئے داستاں'' ڈاکٹر صبیحہ صبا پر لکھا گیا یہ مضمون بہت جامع اور خوبصورت تھا۔بہترین اشعار کے ساتھ ان کے فن کی عکاسی کی گئی ہے۔وہ ایک اچھی شاعرہ اور نفیس خاتون ہیں۔

جمیل احمد عدیل کا تعارف براہِ راست سے مکمل طور پر حاصل ہوا۔ دو دفعہ پڑھا پھر سب باتیں سمجھ آئیں۔آپ کے رسالے کے ذریعے اتنے عالم فاضل لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔''ریاضت کا ثمر'' میں سمیط احمد نے جمیل احمد عدیل کے بارے میں بھرپور معلومات دیں۔

ڈاکٹر شفیق آصف کی نظم بہت اچھی تھی۔ایک صدی کا قصہ فلم سٹار ''شیام'' کی جدوجہد حسبِ معمول دلچسپ ان تبصروں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔رسالے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' (جلد ۳۲، شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۲۳ء) یکم جنوری ۲۰۲۳ء اپنی انفرادیت اور باوقار نگارشات سے آراستہ نظر نواز ہوا۔موجودہ پرچے میں معروف و منفرد افسانہ نگار جمیل احمد عدیل کے قرطاس اعزاز دیکھ کر خوشی ہوئی۔''براہِ راست'' میں آپ کے تیکھے اور گہرے سوالات اور جمیل احمد عدیل کے تفصیلی اور گہرے مطالعے اور مشاہدے سے بھرپور جوابات نے ذہن کے دریچے روشن کیے۔آپ کے سوال، آپ کی سوچ، فکر، فلسفہ کو تقیل گردانے والے۔۔۔جواب کی پہلی سطر نے ہی سرشار کر دیا۔

''اس پر غور ہونا چاہیے کہ ایک ادیب کے پاس کہنے کے لیے کیا ہے۔''(ص۔۲۱)

اس سے اگلے سوال کے جواب میں:

''مجھے لفظ شکوہ اور عورت کا حسن دم بخود کر دیتا ہے۔''(ص۔۲۱)

''فاصلے سے بڑھ کر کشش کسی اور چیز کے نصیب میں درج نہیں ہوتی۔''(ص۔۲۲)

''نثری نظم فی الحقیقت لفظ مصرع کے خلاف بغاوت ہے۔''
(ص۔۲۷)

گلزار بھائی جمیل احمد عدیل اپنی بات کی تصدیق کے لیے مستند دلیل لاتے ہیں۔ پورا گوشہ پڑھ کر لطف آ گیا۔ ممتاز مفتی مرحوم، مرزا ادیب مرحوم اور ڈاکٹر شاہد دلاور شاہ کے مضامین جمیل احمد عدیل کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ان تحریروں سے عدیل صاحب کے فکر وفن، فلسفۂ حیات اور ادب کی اہمیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اشفاق احمد ورک نے بڑی بے تکلفی سے خوب صورت خاکہ تحریر کیا ہے۔ محمد انعام الحق نے جمیل احمد عدیل کے نام خطوط کے اقتباسات کو خوبی سے ترتیب دیا ہے۔ فاری شا نے جمیل صاحب کی نثری نظموں کا انتخاب خوب کیا ہے۔ سمیط احمد نے ''ریاضت کا ثمر'' میں سوانحی اور ادبی تعارف سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ہزار ہا تحسین

بہن رینو بہل کا افسانہ ''جبینِ نیاز'' بہترین بیانیہ افسانہ ہے کہانی پر آخر تک گرفت برقرار رہتی ہے کرداروں پر بھی خاصی محنت نظر آ رہی ہے۔ محترمہ ارم نعیم کا افسانہ ''نادر تحفہ'' پیش کش کے اعتبار سے مضبوط افسانہ ہے۔ ایک تجسس کی کیفیت رہی۔ آغا گل کا افسانہ ''زمین گول ہے'' کی دوبارہ تحسین کروں گا کہیں تازہ ہی پڑھا ہے۔

غزلوں کا انتخاب بھی آپ محنت سے کرتے ہیں چنیدہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

روز سمجھاتا ہوں خود کو کہ پاس ہے کیا
ایک کردرا ہے کردار سے ہوتا کیا ہے
(طارق نعیم)

بے رخی سے خیریت وہ پوچھ کر کیا چل دیے
زخمِ دل رِسنے لگے ایسی مسیحائی کے بعد
(حنا رضوی حیدر)

آہ، آنسو، کسک یہ تنہائی
درد سے پُر ہے عاشقی کی بیاض
(جبیں ناز اں)

مر گئے حارثِ مقتول مقدمے لڑتے
انہیں انصاف دلانے میں بہت دیر لگی
(اشرف جاوید)

چلتا رہے گا یوں ہی یہ کاروبارِ ہستی
سر کو جھکا کے سن لے تو بھی اذان اپنی
(ارشد سعید)

عاکف غنی کی غزل میں ہجرت کا کرب اور اپنوں سے دوری کا دکھ نمایاں ہے نبیل احمد نبیل کی غزل تہ داری معنویت سے مزین ہے۔

کتابوں پر تبصرے غیر جانب داری اور تنقیدی بصیرت سے کیے گئے ہیں۔ عطاالحق قاسمی صاحب نے ڈاکٹر یونس جاوید کی خودنوشت ''ایک آنسو'' سے اپنی یادوں کو روشن کیا ہے۔ یونس جاوید صاحب کو ملک اور بیرون ملک میں ڈرامہ ''اندھیرا اور اُجالا'' کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے ہیں مگر یہ اُن کے ساتھ زیادتی ہے وہ ایک زبردست ناول نگار، منفرد افسانہ نویس وخاکہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محقق، نقاد ومبصر بھی ہیں اُن کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''حلقۂ ارباب ذوق، تنظیم، تحریک، نظریہ'' ایک تاریخ ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں علم و ادب کی کئی شخصیات کو زندہ کر دیا ہے اُن کی خودنوشت بھی خاصے کی چیز ہوگی۔ میرے کتب خانے میں اُن کی کتابیں میری خوشی کا سبب ہیں۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے ''شیام'' کی مختصر زندگی کی طویل جدوجہد کی داستان اپنے خاص انداز میں بیان کی۔ منٹو اور شیام کی دوستی نے متاثر کیا۔ ساحرہ کاظمی نے ''دھوپ کنارے'' ڈرامے میں کام نہیں کیا۔ وجیہہ الوقار نے رس رابطے میں شامل خطوط کی ترتیب و تدوین سلیقے سے کی ہے۔ راجیش ریڈی، ولی عالم شاہین، نسیم سحر، ڈاکٹر ریاض احمد کے خط دلچسپ اور تجزیاتی ہیں۔ ''بیٹیوں والے زیدی صاحب'' کے عنوان سے زیدی صاحب کی لائق فائق بیٹی ماہ پارہ صفدر کی یادوں کو جو کتابی صورت میں ''میرا زمانہ میری کہانی'' کے نام سے شائع ہوئی زبردست تعارف پیش کیا ہے۔ یہ اعزاز بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کہ کوئی شخص بیٹیوں والا معروف ہو۔

اب آخر میں ناول ''خاکِ شفا'' کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال گزشتہ قسطوں کی طرح موجودہ قسط بھی پُرکشش اور اپنے پس منظر میں گہری معنویت لیے ہوئے۔ مصنف نے کس فنی مہارت سے بیماریوں کے نام، مریدین کی عقیدت، مریدین میں اضافہ، شاہ صاحب مدینے والے کے مزاج اور کیفیات میں تبدیلی، خوفِ خدا شریعت کی پابندی، انکسار، صابر علی کلیر والے کی موت کا منظر (یہ پورا ایک روحانیت کا باب ہے)

''آپ نے کھلانے کے لیے کہا تھا۔۔۔ کھانے کے لیے نہیں''
(ص۔۸۷)

میری ناقص رائے یہاں مولانا حالی کے اشعار چسپاں نہیں ہو سکے۔ ایک دو جگہ مشینی کتابت کی کارستانی ہے۔ شیر علی آفریدی کے ہاتھوں قتل، سزائے موت کا عمر قید۔۔۔ عورتوں کی بے مروتی مگر واسرائے ہند لارڈ میو کا قتل اور سزائے موت۔۔۔ کالا پانی کا جغرافیہ، پس منظر، جیل کی تعمیر، کسی ایک قیدی کا بھی معافی نامہ نہ لکھ کر دینا۔ پھر سونے پر سہاگہ استاد سودا کے اشعار:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

ناول کیا ہے ہمارا ماضی ہے کہانیوں، کیفیات اور رویوں کا ایک جہان آباد ہے۔ہزار ہا تحسین

نویدسروش (میر پورخاص)

محترم گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو کی ہمیشہ سے یہ انفرادیت رہی کہ ہر شمارے میں نامور ادیب یا شاعر کوخراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔یہ عمل بذات خود لائق تحسین اور یاد رکھے جانے کے قابل ہے مگر اس نے ریسرچ کے میدان میں محققین اور طلباء کی کتنی مدد کی ہوگی یہ سمجھنا کچھ مشکل امر نہیں۔

اس بار قرطاسِ اعزاز محترم جمیل احمد عدیل صاحب کے نام تھا اور سچی بات ہے کہ دل خوش ہوا کہ ایک بہت قابل ہمہ صفت دانشور،نقاد و مصنف کو بہت پہلے سراہا جانا اسکا استحقاق تھا،انکی بے لوث ادبی خدمات ادبی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔انکی کچھ کتب میرے زیر مطالعہ رہیں جیسے ان کا سفر نامہ حجاز ان کا افسانوی مجموعہ جو بلاشبہ انکی حساسیت،علم، فلسفیانہ اپروچ اور وسیع مطالعے کی غماز ہیں اور ان کی زبان ان کے علیحدہ اسلوب کو قائم کرتی ہے جو آپ کو مشکل میں ڈالتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ جینوئن ادیب و دانشور نظر انداز ہوا ہے۔ہم وہ بدنصیب قوم و نسل ہیں جو پوسٹ کولونیئل اثرات کے باعث اپنے فارسی و عربی علمی سرمائے سے ناواقف ہیں اور عمدہ شستہ ان زبانوں سے رچی بسی اردو سے محظوظ نہیں ہو سکتے جبکہ جمیل احمد عدیل کی زبان و بیان شستہ وادق ہے جو مجھ جیسے کم علم و سہل پسند قاری کو مشکل میں ڈالتی ہے مگر یہ جمیل احمد عدیل صاحب جیسے قد کاٹھ کے نقاد کی درویشی و انکساری ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اس قدر تفصیلی مضمون میری تخلیقات پر لکھا۔افسانوں پر تفصیلی تجزیاتی گفتگو کی اور مدیر کی بھی شکر گزار ہوں کہ جمیل احمد عدیل صاحب کے وسیع علمی ادبی سرمایے میں سے منتخب کام میں اس مضمون کو شامل کیا۔

سیمیں کرن (فیصل آباد)

محترم گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا جمیل احمد عدیل نمبر نظروں سے گزرا،ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار کے فکر و فن کے حوالے سے یہ ایک اہم دستاویز ہے۔جمیل احمد عدیل صاحب عصر رواں کے اہم افسانہ نگار،نقاد،محقق،کالم نگار اور ماہر تعلیم ہیں اور آپ کے جریدے "چہارسو" نے ان کی ادبی خدمات کا جو شاندار اعتراف کیا وہ قابل تحسین ہے۔آپ اور عدیل صاحب کے لئے نیک تمنائیں۔

ڈاکٹر شفیق آصف (میانوالی)

بھائی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

حسب روایت چہارسو صوری اور معنوی لحاظ سے دلکش بھی ہے اور بامعنی بھی۔اس بار آپ نے شہر لاہور کے نوجوان قلم کار پروفیسر جمیل احمد عدیل کو قرطاسِ اعزاز سے سرفراز کیا ہے۔آپ کی یہ کاوش نہ صرف عدیل صاحب کے فنی سفر میں بارآور ثابت ہوگی بلکہ اردو ادب کے فروغ میں بھی بھرپور کردار ادا کرے گی۔

اس بار آپ نے ہمیں لاہور سے کراچی بھیج دیا۔خیر کوئی بات نہیں یہ شہر بھی ہمارے پیارے وطن کا ایک خوبصورت چمن زار ہے۔

میری خواہش اور دعا ہے کہ چہارسو اسی طرح قائم و دائم رہے اور جلد از جلد اپنی سابقہ فارم یعنی پرنٹنگ فارم میں آنے لگے تا کہ کتاب کے شوقین قاری کی تسکین کا سامان ہو سکے۔

اشرف جاوید (لاہور)

گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

ماشاءاللہ! چہارسو کا تازہ شمارہ حسب سابق ایک اچھا اور مستند شمارہ ہے۔

معاصرین کو سراہنا چہارسو کی ایک بڑی خوبی ہے۔جس کے لیے مدیر چہارسو اور اُن کے رفقائے کار کو جتنی بھی داد دی جائے اور جس قدر بھی تحسین کی جائے وہ کم ہے۔

جمیل احمد عدیل ہمارے بہت اچھے دوست اور نہایت اعلیٰ شاعر، ادیب اور بلند نگاہ نقاد ہیں۔ان کے لیے خاص گوشہ مخصوص کر کے ادارہ چہارسو نے اپنی روایت کے مطابق نہ صرف ایک معاصر ادیب کی خدمات کو سراہا بلکہ اردو دنیا تک نہایت خوش دلی سے پہنچا کر ایسا فریضہ انجام دیا ہے جو مدت تک یاد رکھنے کے لائق ہے۔

شکریہ اور مبارک باد۔

منور عثمانی (لاہور)

نہاری

نہاری کی ایجاد مغلیہ دور میں دلی میں ہوئی، یہ بنیادی طور پر مزدوروں کا کھانا تھا جو اس بچے کچے گوشت سے تیار ہوتا تھا جسے کوئی خریدتا نہیں تھا۔ یہ بہت سستا کھانا تھا،مزدور صبح سویرے اسے کھا کر مزدوری کو نکل جاتے تھے۔ یہ رات بھر ہلکی آنچ پر تیار کیا جاتا تھا اور منہ اندھیرے دیگ کھولی جاتی تھی،یوں اس کا نام ہی نہاری پڑ گیا یعنی نہار منہ کھائی جانے والی ڈِش۔

☆

..... نقش برآب .....

شہناز خانم عابدی صاحبہ ان تخلیق کاروں میں سے ہیں جو تخلیقی مراقبے میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور حجرے کے باہر کی دنیا اس سے بے خبر ہوتی ہے کہ دیواروں کے پیچھے کیا کیا گلشن کھل رہے ہیں۔ان کا گھرانہ ایک ایسا ادبی اور علمی گھرانہ ہے جس میں بیوی افسانہ نگار، شوہر یعنی عبداللہ جاوید صاحب (مرحوم) نامور شاعر، افسانہ نگار اور نقاد جبکہ صاحبزادے سہیل جاوید نثر نگار ہیں اور کالم لکھتے ہیں۔شہناز خانم عابدی صاحبہ کے افسانے تو میں ادبی رسالے ''چہارسُو'' میں اکثر پڑھتا رہتا ہوں مگر ''چہارسُو'' میں شائع ان کے خطوط جو راست گفتگو کے سے ہوتے ہیں، ان کی تنقیدی نظر کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔

جب ڈاک سے ان کا افسانوی مجموعہ ''نقش برآب'' ملا تو اس کے ساتھ ہی عبداللہ جاوید صاحب کی کلّیات اور کچھ ایسی کتابوں کا تحفہ بھی ملا جو دنیائے ادب کی دیگر زبانوں کی کچھ بڑی تخلیقات کے مطالعے پر مبنی ہیں۔ان کا ذکر پھر سہی، ان شااللہ۔یقین جانیے دنیا کے کئی خطّوں کی طرح ٹورانٹو میں بھی کام کرنے والے خاموشی سے بڑے بڑے کام کر رہے ہیں مگر اکثر لوگوں کی توجّہ ان کی طرف اس لیے بھی نہیں جاتی کہ یہ لوگ صحیح معنی میں درویشوں کی طرح تخلیقی دھیان اور گیان میں گم رہتے ہیں۔محفلوں میں شریک ہونے سے تو عبداللہ جاوید صاحب بھی کتراتے تھے جس کا میں خود بھی شاہد ہوں مگر شہناز خانم عابدی صاحبہ تو گویا محافل سے بالکل ہی کٹی ہوئی ہیں اور شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی افسانہ نگاری سے ادبی رسائل کے قاری تو یقیناً واقف ہیں مگر ان کے اطراف کے اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوگا کہ ایک اتنی اچھی افسانہ نگار ان کی ہمسایہ ہیں۔کیا کریں کہ فی زمانہ بلند آہنگی ہی کا چلن ہے۔

''نقش برآب'' کے افسانوں کے موضوعات میں تنوّع ہے، یکسانیت نہیں ہے۔اگرچہ یہ کوئی انوکھی بات نہیں مگر خوبی بہرحال ہے اور بہت اہم ہے۔یہی نہیں بلکہ ان کی کہانیاں آج کی کہانیاں ہیں جن سے قاری خود کو جوڑ سکتا ہے۔سچ کہوں تو یہ جملہ بھی ہم لوگ آسانی سے سب کے لیے لکھ دیا کرتے ہیں مگر یہاں بے شک ایسا ہی ہے، پڑھنا شرط ہے۔ان کی کہانیاں عموماً سادہ ہوتی ہیں اور اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اطراف بکھرے مسائل اور کہانیوں کو مٹھی میں لے کر بہت سادگی سے افسانوی شکل میں ڈھال دیا ہے۔عام زندگی کے رنگ جن کہانیوں میں نظر آتے ہیں ان میں ''ہم دیکھیں گے'' اور ''میری گورڈن'' کی مثال دی جا سکتی ہے۔ان کی بعض مختصر کہانیاں زندگی کے مختلف رنگوں کو جستہ جستہ بھی دکھاتی ہیں جو واقعات کے کچھ مخصوص مشاہدات پر مبنی ہوتی ہیں۔کرداروں کے اندر جھانکنے سے گریز کرتے ہوئے وہ کہانی کہنے اور اس کی ترسیل پر زیادہ توجّہ دیتی ہیں۔ان کے کئی افسانوں کا اختتام غیر متوقّع ہوتا ہے جو ایک بہت اہم خوبی ہے۔جہاں جہاں وہ اس اچانک موڑ سے کام لے کر کہانی مکمّل کرتی ہیں، وہاں وہاں گویا ختم ہوتے افسانے میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہیں اور مجھے افسانوں میں اس اختتام کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے سو ان کے افسانوں میں یہ لطف بارہا آیا۔''کالی فائل''، ''ریٹائرمنٹ پلان'' اور ''جھوٹ'' بہت اچھے افسانے ہیں۔افسانہ ''ایک لکیر لہو کی'' کی کہانی بہت جاندار ہے اور شاید یہ کہانی افسانویت کی اور بھی گنجائش رکھتی ہے۔

اکثر ادبا کی رائے ہے کہ شہناز خانم عابدی صاحبہ کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ وہ افسانوی بُنت سے زیادہ کہانی سنانے یا کہنے کا ایسا انداز رکھتی ہیں جو ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔آخر میں شہناز خانم عابدی صاحبہ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ احقر کو اپنے خوبصورت افسانوی مجموعے کے مطالعے کا موقع دے کر عزّت افزائی کی۔

..... فیصل عظیم

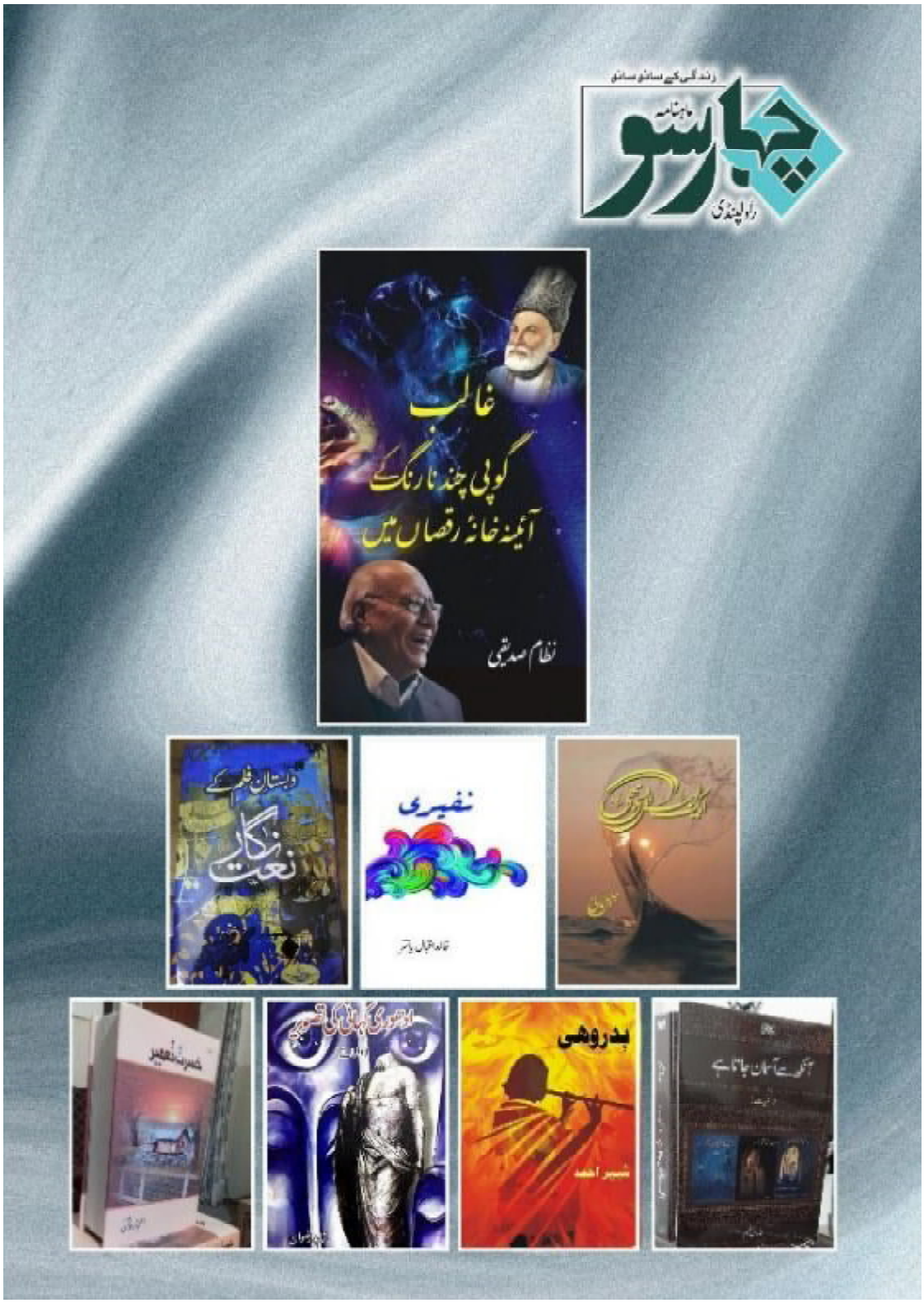

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
غالب
گوپی چند نارنگ کے
آئینہ خانۂ رقصاں میں
نظام صدیقی
دبستانِ قلم کے
نعت نگار
نفیری
خالد اقبال یاسر
شبیر احمد